ربیع الثانی، جمادی الاول ۱۴۴۳ھ
نومبر، دسمبر ۲۰۲۱ء

بانی مُدیر: حافِظ طیّب نواز شہید رحمۃ اللہ علیہ

بابری مسجد

روشن ماضی بھی ہے اور روشن تر، مستقبل بھی!

سنہ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۸۷ء کے درمیان لی گئی بابری مسجد کی ایک تصویر
(Photo by: Sepia Times/Universal Images Group)

حضرت امیر المومنین سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اپنے بعد آنے والے خلیفہ کے لیے وصیت

''میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو مہاجرینِ اولین کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ ان کا حق پہچانے اور ان کی عزت واحترام کا خیال کرے۔ جو انصار دارِ ہجرت اور دارِ ایمان یعنی مدینہ منورہ میں مہاجرین سے پہلے رہتے تھے ان کے بارے میں بھی اسے وصیت کرتا ہوں کہ وہ ان کے نیک آدمیوں سے قبول کرتا رہے اور ان کے بُروں کو معاف کرتا رہے۔ میں اسے شہر کے باسیوں کے بارے میں بھی بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ یہ لوگ اسلام کے مددگار لوگوں میں سے ہیں، (فرض زکاۃ وصدقات کا) مال جمع کرنے والے (اور امیر کو لا کر دینے والے) اور دشمن کے غصے کا سبب بننے والے ہیں، ایسے شہر کے باسیوں سے صرف (ضرورت سے) زائد مال ان کی رضامندی سے لیا جائے۔ اور میں اسے دیہاتیوں کے بارے میں بھی بھلائی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ یہ لوگ عرب کی اصل اور اسلام کی جڑ ہیں۔ وہ خلیفہ ایسے دیہاتیوں کے جانوروں میں صرف کم عمر جانور لے اور ان سے لے کر ان کے فقیروں میں تقسیم کر دے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان دیہاتیوں کے لیے جو عہد و ذمہ داری خلیفہ پر عائد ہوتی ہے وہ اسے پوری طرح ادا کرے، ان دیہاتیوں کے بعد والے علاقے میں جو (دشمن و کافر) رہتے ہیں ان سے یہ خلیفہ جنگ کرے اور ان دیہاتیوں کی طاقت سے زیادہ کا ان کو مکلّف نہ بنائے۔''

نسائي، ابنِ حبان، بيهقي، وابنِ ابي شيبه

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نوائے غزوۂ ہند

جلد نمبر: ۱۴، شمارہ نمبر: ۶

ربیع الثانی، جمادی الاول ۱۴۴۳ھ — نومبر، دسمبر ۲۰۲۱ء

بحمد اللہ... مسلسل اشاعت کا چودھواں سال!

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

افغانستان — کشمیر — پاکستان — بنگلہ دیش — برما — ہندوستان

"میری امت کا ایک عظیم گروہ حق (کو غالب کرنے) کے لیے لڑتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان سے لڑنے کے لیے بہت سے لوگوں کے دل کفر کی طرف مائل کرتا رہے گا اور اللہ تعالیٰ انہیں ان سے رزق عطا فرماتا رہے گا حتیٰ کہ قیامت قائم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کا (غلبے والا) وعدہ پورا ہو جائے۔"

(صحیح النسائی)

اس شمارے میں

تجاویز، تبصروں اور تحریروں کے لیے اس برقی پتے (Email) پر رابطہ کیجیے: editor@nghmag.com

www.nawaighazwaehind.co
www.nawai.io/Twitter
www.nawai.io/Channel
www.nawai.io/Bot
www.nawai.io/ChirpWire

قیمت: اس مجلے کی قیمت آپ کی دعا...... اور اس دعوت کو فی اللہ آگے پھیلانا ہے!

اعلانات از ادارہ:

- بعض تکنیکی وجوہات کے سبب مجلّہ 'نوائے غزوۂ ہند' کا نومبر، دسمبر (۲۰۲۱ء) کا شمارہ یکجا شائع کیا جا رہا ہے، اسی اعتبار سے شمارۂ ہٰذا کی ضخامت بڑھا دی گئی ہے۔
- مجلّہ 'نوائے غزوۂ ہند' میں شائع ہونے والے 'مستعار' مضامین (بشمول سوشل میڈیا پوسٹس/سٹیٹس/ٹویٹس) مجلّے کی ادارتی پالیسی کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں اور ان مضامین وغیرہ میں موجود تمام خیالات اور ان کے مصنفین کے تمام افکار و آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

’غزوۂ ہند‘ تمام اہلِ ایمان کا قضیہ ہے اور اس ’غزوے‘ کی حمایت و نصرت تمام اہلِ ایمان بالخصوص برِّ صغیر میں بستے اہلِ ایمان کا فریضہ ہے۔’غزوۂ ہند‘ کی دعوت کو پھیلانے اور مضبوط کرنے کی ایک کوشش کا نام ’نوائے غزوۂ ہند‘ ہے۔

نوائے غزوۂ ہند:

- اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کفر سے معرکہ آرا مجاہدین فی سبیل اللہ کا موقف مخلصین اور محبّینِ مجاہدین تک پہنچاتا ہے۔
- برِّ صغیر، افغانستان اور ساری دنیا کے جہاد کی تفصیلات، خبریں اور محاذوں کی صورتِ حال آپ تک پہنچانے کی کوشش ہے۔
- امریکہ، بھارت، اسرائیل اور اس کے حواریوں کے منصوبوں کو طشت از بام کرنے، اُن کی شکست کے احوال بیان کرنے اور اُن کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کی ایک سعی ہے۔

اس لیے......اسے بہتر سے بہترین بنانے اور دوسروں تک پہنچانے میں ہمارا ساتھ دیجیے!

editor@nghmag.com

نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

اللہ جلّ شانہٗ کے نہایت فضل و احسان سے آج، اہلِ اسلام کئی صدیاں اپنے حلق میں جامِ موت و الم انڈیلنے کے بعد ایک بار پھر زندگی کے جام سے گھونٹ بھر رہے ہیں۔ عرب عالمِ دین شیخ ہانی السباعی نے کہا تھا ''ارفع رأسك فإنّك في زمان ملّا عمر!''۔ سر اٹھا کے جیو کہ تم ملّا عمر کے زمانے میں جی رہے ہو! ملا عمر جو عمرِ ثالث بھی ہیں، بت شکن بھی اور بت انہوں نے صرف بامیان کے نہیں توڑے بلکہ ہبلِ عصر امریکہ کو بھی بانصرتِ الٰہی ضرب لگائی ہے!

مجلّہ 'نوائے غزوۂ ہند' کے اگست و ستمبر ۲۰۲۱ء کے خاص شمارے 'فتحِ امارتِ اسلامیہ' کے اداریے میں بھی ہم نے یہ بات درج کی تھی، کہ آج طاغوتِ اکبر، عالَمِ کفر کا سردار، امریکہ، مسلم خِطّوں میں آگے بڑھ کر قبضے کی جارحیت سے باز آ گیا ہے۔ قوتِ جہاد فی سبیل اللّٰہ کے سبب، امریکہ اپنی 'اقدامی' و 'جارح' پالیسی سے ہٹ کر اب 'دفاعی' حالت میں ہے اور امتِ مسلمہ اور امریکہ کے درمیان جنگ آج 'توازن' کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ امریکی حکومت و انتظامیہ کے اہلکار اور تھنک ٹینک و پالیسی ساز و ابلاغی ادارے کھلے بندوں اب اس بات کا اظہار بلکہ اقرار کر رہے ہیں کہ امریکی اسٹیبلشمنٹ، فوج اور عوام کا 'ارادۂ جنگ' (will to fight) کمزور پڑ گیا ہے۔

افغانستان میں امارتِ اسلامیہ کے زیرِ قیادت مجاہدینِ اسلام کے ہاتھوں شکست کے بعد صحابۂ کرام رضوان اللّٰہ علیہم اجمعین کی سرزمینِ ہجرت[1] 'صومالیہ' میں بھی امریکہ اور اس کے ابیض و اسود، دیسی و بدیسی حواریوں کی رسوائی سب کے سامنے ہے۔ ایمان و مادّیت کی جنگ میں توازن بلکہ معرکے کے اعتبار سے امتِ مسلمہ کی ظفر مندی کی علامت امریکہ کا مشرقی افریقہ (خصوصاً صومالیہ) میں برسرِ جہاد مجاہدین کو مذاکرات کی پیش کش ہے۔ اور یہاں ظفر مندی محض یہ نہیں کہ 'أنا ربكم الأعلىٰ' ڈکارتا متکبر امریکہ، خود جھک کر مذاکرات کی دعوت دے رہا ہے، بلکہ جس عمل کو ہم ظفر مندی سے تعبیر کر رہے ہیں وہ مشرقی افریقیائی ممالک میں برسرِ جہاد مجاہدین کی جماعت 'حرکت الشباب المجاہدین' کا امریکہ کو جواب ہے۔ حرکت الشباب المجاہدین نے زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے امریکیوں کو اس پیش کش کے اگلے ہی دن مغادیشو میں دو امریکی فوجیوں پر حملہ کر کے جواب دیا اور اس کے بعد محض دو ہفتوں میں مغادیشو میں تیس سے زائد امریکی و امریکی اتحادی اہداف کو کامیابی سے نشانہ بنایا۔ کوئی اس امریکی 'امن' کی پیش کش کو 'وَإِن جَنَحُوا۟ لِلسَّلْمِ فَٱجْنَحْ لَهَا' کے پیرائے میں نہ سمجھے، کہ یہ امریکیوں کی پیش کش امن و صلح کی نہیں بلکہ فریب اور جسے انگریزی میں to buy time کہا جاتا ہے کے پیشِ نظر ہے۔ ایسا نہیں کہ ہم محض جنگ کے طالب جنگجو قسم کے لوگ ہیں، بلکہ امیر المومنین ملا محمد عمر مجاہد (نوّر اللّٰہ مرقدہٗ) کے ارشاد کے مطابق 'ہم اپنے اصول و اقدار اپنے دین، ''اسلام'' سے لیتے ہیں' اور دراصل مجاہدین نے جنگ کو حقیقتاً ختم کرنے کی طرف عملی قدم اٹھایا ہے اور وہ ہے گولی کا جواب گولی سے کہ دشمن اس کے سوا کسی دوسری زبان کو سمجھتا نہیں ہے۔ محسنِ امت شیخ اسامہ بن لادن شہیدؒ نے امریکیوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ 'اگر تم تک ہمارے زبانی پیغامات پہنچتے (اور اثر کرتے) تو ہمیں اپنے پیغامات کو عملاً جہازوں پر سوار کر کے نہ بھیجنا پڑتا!'۔

[1] اشارہ صحابۂ کرام رضوان اللّٰہ علیہم اجمعین کی ہجرتِ حبشہ کی طرف ہے، جب حبشہ پر نجاشی رحمۃ اللّٰہ علیہ کی حکومت تھی اور آج کا صومالیہ بھی اس حکومت کی عمل داری میں آتا تھا۔

امریکہ اگر چاہے تو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی بھڑکائی جنگ کی آگ کو آج بھی ختم کر سکتا ہے۔ لیکن کسی بھی جنگ کو ختم کرنے سے پہلے اس کے اسباب و عوامل کو سمجھنا ضروری ہے۔ صومالیہ میں حرکت الشباب المجاہدین نے کیوں امریکہ کی مذاکرات کی پیش کش کا جواب بندوق کی گولی اور بارود بھری گاڑی سے دیا؟ نائن الیون کے حملے محسنِ امت شیخ اسامہ بن لادن شہید رحمۃ اللہ علیہ نے کیوں کروائے؟ اور مجاہدینِ امت جن میں ایک نام مجاہدینِ القاعدہ کا بھی ہے: صومالیہ تا مالی، یمن تا شام اور برِّصغیر میں کیوں آج بھی امریکہ، اس کے اتحادیوں، اسرائیل اور بھارت کے خلاف جنگ جاری رکھے ہوئے ہیں؟

- امریکہ اس وقت دنیا میں جاری عالمی صلیبی جنگ کا امام ہے۔ ۱۶ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کے صلیبی جنگ کے اعلان سے تاامروز اس جنگ کی قیادت امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور امریکہ کا ہر صدر اور امریکہ کی ہر حکومت و انتظامیہ بُش ہی کے قول پر اپنی عالمی پالیسی جاری رکھے ہوئے ہے کہ 'Either you are with us or with the terrorists' یعنی 'یا تو تم ہم امریکیوں کے ساتھ ہو یا (امریکی مخالف) دہشت گردوں کے ساتھ'۔ امریکہ عالمی صلیبی جنگ کا امام ہے، ہم اس کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں؟
- ناجائز یہودی ریاستِ اسرائیل کا سب سے بڑا عسکری، اقتصادی، سیاسی اور سفارتی سرپرست امریکہ ہے۔ قبلۂ اول کو مسلسل صہیونیوں کی غلامی میں رکھنے اور لاکھوں فلسطینی مسلمانوں کو قتل اور ہجرت پر مجبور کرنے اور دنیا کے ڈیڑھ ارب مسلمانوں کو بیت المقدس کی زیارت سے محروم رکھنے کا سب سے بڑا ذمہ دار امریکہ ہے۔ یہ امریکہ ہی ہے جس نے یروشلم یعنی شہر القدس میں اپنا سفارت خانہ، القدس کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دیتے ہوئے کھولا!
- 'بعد از خدا بزرگ و برتر'، اللہ کے سچے رسول اور ہمارے محبوب، صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپ پر اترے کلام اللہ کی شان میں گستاخیوں کا پلید سلسلہ یورپ و امریکہ کے بعد خصوصاً بنگلہ دیش، پاکستان اور ہندوستان میں آج امریکہ و بھارت کے ایما پر برپا ہے، یہی اس کو بڑھاوا دینے والے، سہولت کار اور ملعون گستاخوں کی جائے پناہ ہیں۔
- حرمین شریفین یعنی مسجدِ حرام اور مسجدِ نبوی (علی صاحبہا اَلف صلاۃ و سلام) سے محض چند کلو میٹر دور آج امریکی فوجیں ہی اپنے اڈے جمائے بیٹھی ہیں۔ آج امریکی آشیرباد اور امریکی ایجنڈے ہی کے سبب امریکیوں کے غلام بادشاہوں اور ولی عہد شہزادوں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وطن جزیرۃ العرب کو فحاشی و عریانی اور بدکاری و شراب نوشی کا اڈا بنا دیا ہے۔
- امریکی صلیبی صہیونیوں کا سب سے بھیانک جرم اسلامی دنیا میں ایک عالمگیر تحریکِ ارتداد کا برپا کرنا ہے، جس کے اثرات پورے عالَمِ اسلام میں محسوس کیے جاسکتے ہیں، ہندوستان میں گھر واپسی کی تحریک اسی عالم گیر مہم کا حصہ ہے۔ تعلیم، معیشت، ابلاغیات، معاشرت، قانون سازی، الغرض اسلامی دنیا کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں فساد اور الحاد کے فروغ کے لیے امریکی اداروں نے شر انگیز منصوبہ بندی نہ کر رکھی ہو۔
- مسلم دنیا کو سودی معیشت کے جال میں جکڑنا، سرمایہ دارانہ تہذیب کو فروغ دینا اور اسلامی معاشروں کو حرص و ہوس کی منڈیوں میں تبدیل کرنا امریکہ کا ایک مستقل ہدف ہے۔ اس ہمہ جہتی ہدف کے حصول کے لیے یو ایس ایڈ، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور دیگر اداروں کی مدد سے مستقلاً کام جاری ہے۔
- امریکہ مسلم امت کے سونے، پیٹرول اور یورینیم سے لے کر خام تیل تک کے کھرب ہا ڈالر کے وسائل پر کہیں براہِ راست اور کہیں اپنے اتحادیوں اور غلاموں کے ذریعے دہائیوں سے قابض ہے۔

- دنیا کی بڑی عسکری قوت ہونے کے ناطے، تمام اسلام دشمن قوموں کو مسلح اور مضبوط کرنے کا کام امریکہ نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ اسرائیل کو اہلِ فلسطین پر بم برسانے کے لیے جدید اسلحہ خانہ اور بھارت کو مجاہدینِ کشمیر کی سرکوبی کے لیے جدید سرویلنس طیارے اور جدید ہتھیاروں کے اربوں ڈالروں کے معاہدے اس کی ایک نظیر ہیں۔ حتیٰ کہ مسلمانانِ شیشان کے مقابلے میں وہ اپنے بدترین دشمن روس کی مدد سے بھی نہیں چوکتا۔
- امریکہ ہی ہے جو مسلم ممالک سے فوجیوں اور پولیس اہل کاروں کو بڑے پیانے پر بھرتی کر کے تربیت کے لیے اپنے یہاں لے جاتا ہے اور اسلام دشمنی اور جہاد دشمنی کے لیے ان کی ذہن سازی کرتا ہے۔
- امریکہ مسلم دنیا کے سیاست دانوں کو جمہوری تربیت کے نام پر اپنے یہاں لے جا کر ان کے ذہنوں سے جہاد اور نفاذِ شریعت کے افکار کھرچ کر، انہیں فروغِ جمہوریت کی تعلیم دیتا ہے۔
- امریکہ اسلامی دنیا کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو منتخب کر کے، تعلیمی تربیت کے بہانے انہیں بے دین اور ملحد و زندیق بنانے کی مہم پر کاربند ہے۔
- امریکہ کی سرپرستی میں قائم این جی اوز مسلم دنیا میں جس تیزی سے بے حیائی اور آوارگی کو فروغ دے رہی ہیں، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔
- افغانستان میں بیس سالہ امریکی قبضے میں تقریباً ایک لاکھ سینتالیس ہزار مسلمان شہید ہوئے جب کہ عراق میں ۱۹۹۱ء سے لے کر اب تک امریکیوں کے جبرِ مسلسل کے نتیجے میں پندرہ (۱۵) لاکھ سے زائد مسلمان شہید ہوئے جن میں دس (۱۰) لاکھ صرف وہ بچے ہیں جو اقتصادی ناکہ بندی، دودھ اور ادویہ پر پابندی کے باعث تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ آج یمن میں مغربی اداروں (جن میں سرِ فہرست ورلڈ فوڈ پروگرام ہے) کے مطابق رواں سال میں پانچ لاکھ بچوں کی اموات کا خوراکی مواد کی قلت اور طبی معائنات کے فقدان کے سبب خطرہ ہے اور خوراکی مواد کی قلت اور بنیادی طبی سہولیات کا فقدان اس امریکی اور امریکی سازش میں برپا جنگ کا نتیجہ ہے جو آج یمن میں جاری ہے۔
- مسلم ممالک کے لادین حکمرانوں کا سب سے بڑا سرپرست امریکہ ہے۔ پوری دنیا میں جہاد کے ذریعے قائم ہونے والی شرعی حکومتوں کو گرانا یا ان کے گرد معاشی و اقتصادی و سفارتی گھیرا تنگ کرنا امریکہ اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہے۔
- سب سے بڑے اسلامی ملک انڈونیشیا میں نصرانیت کے فروغ اور مشرقی تیمور کی صلیبی ریاست کے قیام کا سہرا بھی امریکہ اور اس کے صلیبی حواریوں کے سر ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق ہر سال بیس (۲۰) لاکھ مسلمان اپنا دین چھوڑ کر عیسائی ہو رہے ہیں اور اگر خدانخواستہ یہ ارتداد کا طوفان چلتا رہا تو سنہ ۲۰۳۵ء تک انڈونیشیا کی نصف مسلم آبادی عیسائی ہو چکی ہو گی، حسبنا اللّٰہ و نعم الوکیل!
- امریکہ اپنے آلۂ کاروں اور نام نہاد سفارت کاروں کے ذریعے اسلامی دنیا کے ہزاروں مجاہدین، علمائے کرام، تاجروں اور سائنس دانوں کے اغوا اور قتل میں براہِ راست ملوث ہے۔ اس کے علاوہ ہزاروں اشرافِ امت آج بھی گوانتانامو سمیت دنیا کے مختلف خفیہ عقوبت خانوں میں قید ہیں۔
- امریکہ، فلسطین سے لے کر فلپین تک چالیس (۴۰) لاکھ اہلِ ایمان کے قتل میں بالواسطہ یا بلاواسطہ ملوث ہے۔[1]

[1] نقاط کی صورت میں درج بات کا ایک حصہ مجلہ حطین کے دوسرے شمارے (۱۴۲۸ھ) کے اداریے سے لیا گیا ہے جو شیخ احسن عزیز شہیدؒ کا تحریر کردہ ہے۔

یہ امریکہ و بھارت ہی کی سازش اور ہم پر ان کے مسلط کردہ پالتو و وفادار حکمرانوں اور جرنیلوں کے اعمال کا نتیجہ تھا کہ 'لا الٰہ الا اللّٰہ' کے نام پر بننے والے ملکِ پاکستان میں 'محمد رسول اللّٰہ' کی شریعت نافذ نہ ہو سکی (علیٰ صاحبہا اَلف صلاۃ وسلام)۔ پھر اس کلمۂ توحید و رسالت کی خاطر تشکیل دیے جانے والے ملک کو دولخت کر دیا گیا۔ پھر اُدھر شیخ مجیب اور اِدھر یحییٰ و بھٹو اور ان کے بعد آنے والے حکمرانوں اور جرنیلوں کے پیشِ نظر اپنا ذاتی مفاد ترجیحِ اول رہا اور ان مفادات کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے پوری قوم کو کہیں کبھی امریکہ اور کہیں کبھی بھارت کا غلام بنا دیا۔ کہیں امریکی مذہب کی پیروی میں 'وار آن ٹیرر' کا حصہ بن کر بعض غدار جرنیلوں نے فوجی آپریشنوں اور ڈرون حملوں میں سہولت کاری کر کے پاکستان میں ایک لاکھ لوگوں کو بلی چڑھایا، مجاہدینِ کشمیر کو خونی لکیر کے اِس پار اور اُس پار تنہا چھوڑا، وادی میں کلاشن کو فیں پہنچائیں تو گولیاں نہ دیں اور بارود دیا تو اس کو ہندو مشرک فوج پر استعمال کرنے کے لیے آلہ جات سے محروم رکھا۔ جہاں جوئے بنگلہ کا نعرہ لگا وہاں کے حکمرانوں نے مسلمانوں کے تن سے کپڑا بھی چھینا، منہ سے نوالہ بھی، عورتوں کی عزت بھی نیلام کی اور ان پر 'رام' اور 'سیتا' کا مذہب اپنے بھارتی آقاؤں کی منشا کے مطابق، ہندُتوا کی 'تاریکی' میں مسلط کر دیا۔

بھارت میں بابری مسجد کو شہید کیا گیا۔ گجرات میں مسلمانوں کو مندروں کے تہہ خانوں میں اس طرح مٹی کا تیل چھڑک کر آگ اور دھوئیں سے قتل کیا گیا جیسے نازی جرمنی میں ہٹلر نے کیا تھا[1]۔ مظفر نگر، آسام اور دِلّی تک کے فسادات سب کے سامنے ہیں۔ کشمیر میں ظلم و ستم، جہاں کے لیے ظلم و ستم نہایت چھوٹی اصطلاحات ہیں۔ گھر واپسی اور گھس بیٹھیے کے نعرے اور اس کے بعد 'کاٹ کے رکھ دیں گے' کی صدائیں۔ آسام سمیت پورے ہندوستان سے مسلمانوں کو غیر قانونی قرار دے کر ان کی بے دخلی، CAA اور NRC!

پس اگر امریکہ، اس کے اتحادی اور اسرائیل و بھارت، مراکش سے مالابار کے ساحل تک اور غزہ سے سواحلِ صومالیہ تک اگر جنگ ختم کرنا چاہیں تو وہ اپنے جرائم سے باز آ جائیں۔ کورونا وائرس، اس کی ڈیلٹا و اومیکرون قسمیں، امریکہ میں حالیہ ٹورنیڈو کے طوفان، بھارت میں کورونا + بلیک فنگس اور بحمد اللّٰہ الواحد القہار حال ہی میں مسلمانانِ کشمیر کے قاتل، بھگوا دہشت گردوں کے ایک سرغنے، بھارتی چیف آف ڈیفنس سٹاف کے اللّٰہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر کے ہاتھوں قتل میں آنکھوں والوں اور عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ اور اگر یہ عالمی بدمعاش اپنے اعمالِ بد سے باز نہیں آتے تو سچے ربّ کا سچا فرمان یاد رکھیں، جس کا حکم اس نے اپنے عاجز مومن بندوں کو دیا ہے کہ یہ مومنین وسائل و اسباب میں کم سہی لیکن اپنے رب کے فرمان کو پورا کرنے کی خاطر خود کو اور اپنی اولادوں کو بارود میں لپیٹ کر، اپنا سراپا اہلِ کفر کے لیے موت بنا کر ان پر حملہ آور ہیں اور عن قریب اپنی جنگ کو مزید تیز کیا چاہتے ہیں۔ اللّٰہ جلّ شانہٗ نے زمین پر فسادِ کفر و ظلم برپا کرنے والوں کی روک تھام کے لیے اپنے بندوں کو حکم دیا:

قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ○ (سورۃ التوبۃ: ۱۴)

''ان سے جنگ کرو، اللّٰہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو عذاب دے گا، انہیں ذلیل و رسوا کرے گا اور ان کے مقابلے میں تمہاری مدد کرے گا اور مومنوں کے دل ٹھنڈے کر دے گا!''

[1] پھر حیرت کی بات یہ ہے کہ ہولوکاسٹ کو آج تک یاد کیا جاتا ہے اور گجرات کا قصائی ملک کا پردھان منتری بن جاتا ہے اور گجرات کے قاتل نارو ڈا پاٹیا اور بابو بجرنگی (جس نے ویڈیو میں فخریہ کہا تھا کہ اس نے ایک حاملہ مسلمان خاتون کا پیٹ چاک کیا تھا) کو باعزت رہا کر دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ تحریرِ ہٰذا کے شروع میں ہم نے عرض کیا کہ آج امریکہ جارح اقدام سے دفاع کی حالت میں جا چکا ہے اور امتِ مسلمہ اور امریکہ کے مابین جنگ توازن کے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے، فلہٰذا اولاً اس توازن کو برقرار رکھنے کے لیے اور ثانیاً امریکہ کی اس دفاعی حالت کو پس قدمی اور مکمل شکست میں بدلنے کے لیے جنگ کو جاری رکھنا نہایت ضروری ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ امریکہ اور اس کے اتحادی ہمارے پڑوس افغانستان سے نکل گئے ہیں تو اب جہاد کا مرحلہ ختم ہو گیا، بلکہ ایسے ہی کسی موقع پر جب چند لوگوں نے تلواریں رکھیں اور ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا چین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کذبوا!! الآن الآن جاء القتال!"۔

عَنْ سَلَمَةَ بْنِ نُفَيْلٍ الْكِنْدِيِّ، قَالَ: كُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَذَالَ النَّاسُ الْخَيْلَ، وَوَضَعُوا السِّلَاحَ، وَقَالُوا: لَا جِهَادَ قَدْ وَضَعَتِ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا، فَأَقْبَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِوَجْهِهِ، وَقَالَ: "**كَذَبُوا الْآنَ الْآنَ جَاءَ الْقِتَالُ**، وَلَا يَزَالُ مِنْ أُمَّتِي أُمَّةٌ يُقَاتِلُونَ عَلَى الْحَقِّ، وَيُزِيغُ اللَّهُ لَهُمْ قُلُوبَ أَقْوَامٍ، وَيَرْزُقُهُمْ مِنْهُمْ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ، وَحَتَّى يَأْتِيَ وَعْدُ اللَّهِ، وَالْخَيْلُ مَعْقُودٌ فِي نَوَاصِيهَا الْخَيْرُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ".[1]

حضرت سلمہ بن نفیل کندی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک آدمی نے کہا:

"اے اللہ کے رسول! لوگوں نے گھوڑوں کو اہمیت دینا چھوڑ دی ہے اور انہوں نے ہتھیار رکھ دیے ہیں اور کہنے لگے ہیں 'اب جہاد نہیں رہا، جنگ ختم ہو چکی ہے'۔"

رسول اللہ (علیہ اَلف صلاۃ وسلام) اپنے چہرۂ انور کے ساتھ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا:

"وہ غلط کہتے ہیں۔ جہاد کا وقت تو اب آیا ہے اور میری امت کا ایک عظیم گروہ حق (کو غالب کرنے) کے لیے لڑتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان سے لڑنے کے لیے بہت سے لوگوں کے دل کفر کی طرف مائل کرتا رہے گا اور اللہ تعالیٰ انہیں ان سے رزق عطا فرماتا رہے گا حتیٰ کہ قیامت قائم ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کا (غلبے والا) وعدہ پورا ہو جائے۔ اور (جہاد کی نیت سے رکھے گئے) گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک کے لیے خیر رکھ دی گئی ہے۔"

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری

[1] صحيح النسائي

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مثلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا
رختِ بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

بلاشبہ اب ہی تو جہاد کا وقت آیا ہے۔ امریکہ و بھارت کا ورلڈ آرڈر اسی جہاد سے ٹوٹے گا۔ ہمیں اپنے خطۂ برِّ صغیر میں کفر کے امام بھارت پر بھرپور توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے، بھارت جو کہ ہمارے خِطّے میں سانپ کا سر ہے، اس کی قوت و شوکت کو توڑے بغیر نہ کشمیر کو دارالاسلام بنایا جاسکتا ہے، نہ آسام کے مسلمانوں کو حراستی مراکز سے آزاد کروایا جاسکتا ہے، نہ برما میں جھلستی عفیفات، کٹتے بزرگوں اور جلتے مکانوں کو بچایا جاسکتا ہے اور نہ ہی بنگلہ دیش میں ہندُتوا کا بت توڑا جاسکتا ہے۔

اہلِ پاکستان اگر یونہی بیٹھے رہیں تو شاید ان کی مزید دو چار دہائیاں 'آرام' سے نکل جائیں، لیکن اس کے بعد اکھنڈ بھارت کی تلوار جب سری نگر سے سندر بَن تک سارے ہی علاقے کو ہضم کر چکی ہو گی تو پھر اہلِ پاکستان کی شہ رگ بھی کاٹنے کو آگے بڑھے گی۔ فرضِ شرعی کو ایک لمحے کے لیے بھول جائیے، دنیوی و عقلی پیمانے سے دیکھیے تو اہلِ کشمیر و آسام و برما کی نصرت یعنی بھارت پر وار دراصل اہلِ پاکستان کا دفاع بھی ہے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ 'مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا'، صرف برما و آسام اور کشمیر و گجرات نہیں سنکیانگ و شام اور محبوب اقصیٰ کو بھی یاد رکھیے۔ جسم کا کوئی ایک عضو تکلیف میں ہو تو پورا جسم ہی بخار و درد میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر اسی جسم کا کہیں دماغ کسی دوا کا فیصلہ کرتا ہے، کہیں ہاتھ مدد کرتے ہیں، کہیں حلق سے دوائی نگلی جاتی ہے اور جسم ہی کا کوئی اور عضو اس کو جذب کر کے عضوِ بیمار کی دادرسی کرتا ہے۔ اور حق بات تو وہ ہے جو مرحوم امیرؔ مینائی نے کہی تھی:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اللهم وفقنا كما تحب و ترضى وخذ من دمائنا حتى ترضى. اللهم زدنا ولا تنقصنا وأكرمنا ولا تهنّا وأعطنا ولا تحرمنا وآثرنا ولا تؤثر علينا وأرضنا وارض عنا. اللهم إنّا نسئلك الثّبات في الأمر ونسئلك عزيمة الرشد ونسئلك شكر نعمتك وحسن عبادتك. اللهم انصر من نصر دين محمد صلى الله عليه وسلم واجعلنا منهم واخذل من خذل دين محمد صلى الله عليه وسلم ولا تجعلنا منهم، آمين يا ربّ العالمين!

♦♦♦♦♦

ریا اور حُبِّ دنیا اور ان کا علاج

حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر نوّر اللہ مرقدہٗ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ ، اَمَّا بَعْدُ

ریا (دکھاوا) کیا ہے؟

ریا کہتے ہیں کسی عبادت اور نیکی کو کسی شخص کو دکھانے کے لیے کیا جاوے اور اس سے کوئی دُنیوی غرض اور اس سے مال یا جاہ حاصل کرنے کی نیت ہو۔

لیکن اگر اپنے استاد یا مرشد یا کسی بزرگ کو اس نیت سے اچھی آواز بنا کر قرآنِ پاک سنائے کہ اُن کا دل خوش ہو گا تو یہ ریا نہیں، جیسا کہ روایت حدیث کی موجود ہے کہ ایک صحابی کا قرآن رات میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا اور دن میں اُس کو مطلع فرما کر اظہارِ مسرت فرمایا تو اُن صحابی نے عرض کیا کہ اگر ہم کو علم ہو تا کہ آپ سُن رہے ہیں تو میں اور عمدہ تلاوت کرتا۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر سکوت فرمانا اور نکیر نہ فرمانا مدلولِ مذکور کے لیے دلیل ہے۔

مسلم شریف میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص اعمالِ خیر (رضائے حق کے لیے) کرتا ہے اور لوگ اُس کی تعریف کرتے ہیں اور ایک روایت میں ہے کہ لوگ اُس سے محبت کرتے ہیں (تو آپ کی کیا رائے ہے)؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ 'تِلْکَ عَاجِلُ بُشْرَی الْمُؤْمِنِ'، یہ مومن کی جلد ملنے والی بشارت ہے۔

یعنی یہ دُنیا کا انعام ہے، آخرت کا انعام اِس سے الگ ہے۔ اِس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض لوگ لوگوں کے دیکھ لینے کے خوف سے اپنا نیک عمل ہی چھوڑ دیتے ہیں، یہ صحیح نہیں بلکہ محققین مشائخ نے فرمایا کہ نیک عمل جس طرح مخلوق کے لیے کرنا ریا ہے اِسی طرح مخلوق کے خوف سے یعنی ریا کے خوف سے کسی عملِ خیر کا ترک کرنا بھی ریا ہے۔ پس جس معمول کا جو وقت ہے اللہ تعالیٰ کی رضا کی نیت سے اُسی وقت کر لے، کسی کے دیکھنے نہ دیکھنے کی ہر گز پروانہ کرے۔ ریا ایسی بلا نہیں جو بدون نیت اور ارادہ خود بخود کسی کو چمٹ جائے۔ جب تک دکھاوے کی نیت نہ ہو، اور نیت بھی غرضِ دُنیا کی ہو تب ریا ہوتی ہے، اور اگر نیت تو رضائے حق کی ہے مگر پھر دل میں وسوسہ آتا ہے کہ شاید اِس عبادت سے ریاکاری کر رہا ہوں تو یہ وسوسۂ ریا ہے، جس کی ہر گز پروانہ کرے اور نہ پریشان ہو ورنہ شیطان وسوسہ ڈال کر اِس عملِ خیر سے محروم کر دے گا یعنی خوفِ ریا پیدا کر کے آپ کو اِس عمل ہی سے روک دے گا۔

حضرت حکیم الامّت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس کی عجیب مثال دی ہے کہ آئینہ کے اُوپر جب مکھی بیٹھتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مکھی آئینہ کے اندر بھی موجود ہے حالاں کہ وہ باہر بیٹھی ہوتی ہے۔ اِسی طرح سالک کے قلب کے باہر شیطان ریا کا وسوسہ ڈالتا ہے اور سالک سمجھتا ہے ہائے یہ تو میرے قلب کے اندر ہے۔ پس اِس کو ریا نہ سمجھے بلکہ وسوسۂ ریا سمجھے اور بے فکری سے کام میں لگا رہے۔

ترمذی شریف میں روایت ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اپنے گھر میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے پاس آدمی آ گیا اور مجھے یہ حالت پسند آئی کہ اُس نے مجھے اِس حالت میں دیکھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے ابو ہریرہ! اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے، تیرے لیے دو اجر ہیں، ایک اجر پوشیدہ کا، ایک اجر علانیہ کا۔

اِس حدیث سے کس قدر عابدین کے لیے بشارت ہے۔ کبھی اپنی عبادت کا اظہار جاہ کے لیے ہوتا ہے، یہ بھی بدترین ریا ہے مثلاً احباب کے حلقے میں یہ کہنا کہ آج تہجد میں بہت لطف آیا اور خوب رونا آیا۔ اور بہت سویرے آنکھ کھل گئی۔ یہ باتیں سوائے اپنے مرشد کے کسی کے روبرو نہ کہنا چاہیے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایک صاحب نے دو حج کیے تھے اور ایک جملے سے دونوں حج کا ثواب ضائع کر دیا اور وہ اِس طرح کہ ایک مہمان کے لیے کہا کہ اے ملازم! تو اُس صراحی سے اِس کو پانی پلا جو میں نے دوسری بار حج میں مکہ شریف سے خریدی تھی۔

علاجِ ریا

ریا کا علاج حصولِ اخلاص ہے اور حدیثِ پاک میں اخلاص کی حقیقت یوں ارشاد ہے کہ عبادت اِس دھیان سے کرے کہ ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہیں کیوں کہ اگر ہم اُن کو نہیں دیکھتے تو وہ تو ہمیں دیکھ ہی رہے ہیں۔ جب حق تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا دھیان ہو گا مخلوق کا خیال نہ آئے گا۔ اور یہ مراقبہ یعنی دھیان مشق کرنے سے دل میں قائم ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر خلوت میں بیٹھ کر یہ تصور جمایا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں۔ کچھ مدت تک اِس طرح مشق سے استحضارِ حق آسان ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اخلاص کا حصول اور ریا سے طہارت اہل اللہ کی صحبت اور اُن سے اصلاحی تعلق قائم کیے بغیر عادتاً ناممکن ہے۔ اِس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اصلاحِ نفس کے لیے مشائخ کاملین میں سے جس سے مناسبت ہو تعلق قائم کرنا فرضِ عین ہے کیوں کہ مقدمہ فرض کا فرض ہوتا ہے۔

حضرت حکیم الامّت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ جس نیک کام میں لگا ہے ریا کے خوف سے ترک نہ کرے اور اپنی نیت درست کرے اور زبان سے بھی کہہ لیا کرے کہ یا اللہ! یہ نیک عمل آپ کی خوشنودی کے لیے کرتا ہوں۔ پھر اگر خدا نخواستہ نفس کی شرارت سے یہ ریا بھی ہو گی تو چند دن میں یہ عادت بن جائے گی۔

اِس مضمون کو حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اِس شعر میں بیان فرمایا ہے

وہ ریا جس پر تھے زاہد طعنہ زن
پہلے عادت پھر عبادت بن گئی

دُنیا کی محبت کی بُرائی میں

یوں تو دُنیا دیکھنے میں کس قدر خوش رنگ تھی
قبر میں جاتے ہی دُنیا کی حقیقت کھل گئی

(اختر)

دُنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔ آخرت سے غفلت کا سبب یہی دھوکے کا گھر ہے جو قبرستان میں سلا کر ایک دن بے گھر کر دیتا ہے اور موت کا گہری فکر سے مراقبہ کرنے سے دُنیا کی محبت دل سے نکل جاتی ہے۔ قبرستان بھی گاہ گاہ جا کر خوب غور سے سوچے کہ یہاں بوڑھے، جوان، بچے، عورت، مرد، امیر، غریب حتیٰ کے وزرا اور سلاطین بھی آج کیڑوں کی خوراک بن کر بے نام ونشان ہو گئے۔

کئی بار ہم نے یہ دیکھا کہ جن کا معطر کفن تھا مُشیَّن بدن تھا
جو قبر کہن اُن کی اُکھڑی تو دیکھا نہ عضوِ بدن تھا نہ تارِ کفن تھا

(نذیر اکبر آبادی)

آکر قضا باہوش کو بے ہوش کر گئی
ہنگامۂ حیات کو خاموش کر گئی

(اختر)

دُنیا اور آخرت کا امتزاج اور ارتباط کا فلسفہ حضرت عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ متکلم اُمت نے یوں حل فرمایا ہے:

آب اندر زیر کشتی پُشتی است
آب در کشتی ہلاک کشتی است

دُنیا کی مثال پانی سے اور آخرت کی مثال کشتی سے دی ہے کہ جس طرح پانی کے بغیر کشتی چل نہیں سکتی مگر شرط یہ ہے کہ یہ پانی نیچے رہے کشتی میں داخل نہ ہو، اگر پانی اندر داخل ہوا تو یہی کشتی کی ہلاکت کا بھی سبب ہو گا جو نیچے روانی کا سبب تھا۔

ٹھیک اِسی طرح دُنیا اگر دل کے باہر ہو اور دل میں حق تعالیٰ کی محبت غالب ہو یعنی نعمت کی محبت سے نعمت دینے والے کی محبت غالب ہو تو آخرت کی کشتی ٹھیک چلتی ہے اور اِسی دُنیا سے دین کی خوب تیاری ہوتی ہے، اور اگر دُنیا کی محبت کا پانی دل کے اندر گھس گیا یعنی آخرت کی کشتی میں دُنیا کا پانی داخل ہو گیا تو پھر دونوں جہاں کی تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ دُنیا کا نفع اور سکون بھی چھن جاوے گا جس طرح کشتی کے غرق ہوتے وقت پھر وہ پانی کشتی کے لیے باعثِ سکون ہونے کے بجائے باعثِ ہراس وتباہی ہو جاتا ہے، پس نافرمان انسان کے پاس یہ دُنیا سببِ نافرمانی بن جاتی ہے اور اللہ والوں کے پاس یہ دُنیا فرماں برداری میں صرف ہوتی ہے اور باعثِ سکون و چین ہوتی ہے۔

تعجب ہے کہ دُنیا کا پیدا کرنے والا تو دُنیا کو قرآن میں دَارُ الغرور (دھوکے کا گھر) فرمائے اور ہم مخلوق ہو کر اِس دھوکے کے گھر سے دل لگائے بیٹھے ہیں۔ حق تعالیٰ نے دُنیا کی محبت اور حیاتِ دُنیا سے اطمینان اور خوشی کا سبب آخرت پر عدمِ یقین ارشاد فرمایا ہے ورنہ آخرت کی فکر کے ساتھ تو ذکرِ الٰہی کے سوا کوئی چیز باعثِ اطمینان نہیں ہو سکتی۔ چوبِ بوسیدہ پر سہارا لگا کر کھڑا ہونا جس طرح حماقت ہے اسی طرح موت کے یقینی آنے کے باوجود دُنیا کی لذّتوں کو سہارۂ اطمینان بنانا بھی حماقت ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی پیاری دُعا مانگی کہ اے اللہ! جب اہلِ دُنیا کی آنکھیں تو اُن کی (فانی) دُنیا سے ٹھنڈی کرے تو ہماری آنکھیں اپنی عبادت سے ٹھنڈی فرما (جس کی لذّت غیر فانی ہے)۔

رنگِ تقویٰ رنگِ طاعت رنگِ دیں
تا اَبد باقی بود بر عابدیں

(رومی)

تقویٰ اور عبادت کا رنگ عابدین کی ارواح پر ہمیشہ قائم رہتا ہے کیوں کہ وہ معبود بھی تو حیّ و قیوم ہے۔

حُبِّ دُنیا کا علاج

1. موت کو بار بار سوچنا اور قبر کی تنہائی اور دُنیا سے جدائی کا مراقبہ کرنا۔
2. ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں دُنیا کی حقیقت'' احقر کی اِس کتاب کا مطالعہ ہر روز چند منٹ کر لیا جاوے جس میں اُن احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو جمع کر دیا گیا ہے جن کو پڑھ کر دل نرم ہو جاتا ہے اور آخرت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ یہ کتاب ایک سو پچاس حدیثوں کا مجموعہ ہے۔

3. اللہ والوں کی مجالس میں بار بار حاضری۔ بلکہ کسی اللہ والے سے جس کسی سے مناسبت ہو باضابطہ اصلاحی تعلق قائم کرلینا شفائے روح کے لیے اکسیر ہے۔
4. دُنیا کے عاشقوں سے دور رہنا کہ اس کے جراثیم بھی متعدی ہوتے ہیں۔
5. گاہ گاہ قبرستان میں یادِ آخرت کی نیت سے حاضری دینا۔
6. ذکر کا اہتمام والتزام کسی دینی مربی کے مشورے سے کرنا۔
7. آسمان اور زمین، چاند و سورج اور ستاروں میں اور رات دن کے آنے جانے میں غور کرنا اور اپنے خالق اور مالک کو پہچاننا اور اُن کو حساب دینے کی فکر کرنا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین!

(ماخوذ از: روح کی بیماریاں اور ان کا علاج)

☆☆☆☆☆

بقیہ: آخرت از شیخ انور العولقی

ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ جب انسان نیند کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم سے علیحدہ ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بعض اوقات سویا ہوا شخص جو خواب دیکھ رہا ہوتا ہے وہ اس قدر قوی و شدید ہوتا ہے کہ جسم اس خواب کی تاثیر سے حرکت کرنا شروع کر دیتا ہے اور حالتِ خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوتا ہے، حقیقت میں اس پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حالانکہ (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یتوفاکم عند منامکم......) روح اس جسم سے جدا ہوتی ہے اور اس کی آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ اسی طرح، عذابِ قبر کی شدت اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی شدت سے جسم حرکت پر مجبور ہو جاتا ہے اور قبر سے مردے نکل کر بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں جبکہ فرشتے انہیں عذاب دے رہے ہوتے ہیں۔

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

[یہ سلسلۂ مضامین نابغۂ روز گار، مجاہد و داعی، مبلغ و مقاتل فی سبیل اللہ شیخ انور العولقی شہید رحمۃ اللہ علیہ کے انگریزی میں ارشاد کیے گئے سلسلۂ دروس '*Al-Aakhirah* – The Hereafter' کا اردو ترجمہ ہیں، جو بتوفیق اللہ، قسط وار مجلّہ 'نوائے غزوۂ ہند' میں شائع کیے جا رہے ہیں۔]

بقیہ: امیر المومنین کی ہدایات

"بہت سے لوگ اللہ کے مال میں ناحق تصرف کرتے ہیں (یعنی زکوٰۃ، غنیمت اور بیت المال کے مال میں امام و حکمران کی اجازت کے بغیر تصرف کرتے ہیں اور اپنے حق اور اپنی محنت سے زیادہ وصول کرتے ہیں وہ قیامت کے دن دوزخ کی آگ کے سزاوار ہوں گے"۔ ابنِ حجرؒ کہتے ہیں، کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے اموال کو باطل اور ناحق خرچ کرتے ہیں۔

حضرت خولہ بنت قیسؓ کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ "بلاشبہ یہ مال ایک سبز و شیریں چیز ہے (یعنی مال ایک ایسی چیز ہے جو انسان کی نظر کو بھاتا ہے اور دل کو لبھاتا ہے) لہٰذا جو شخص اس مال کو حق یعنی حلال ذریعہ سے حاصل کرتا ہے اس کے لیے اس میں برکت عطا کی جاتی ہے اور یاد رکھو بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مال یعنی مال غنیمت میں سے جس چیز کو ان کا دل چاہتا ہے اپنے تصرف میں لے آتے ہیں، قیامت کے دن ان کے لیے صرف دوزخ کی آگ ہوگی"۔

صاحبِ مرقاۃ لکھتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مال سے مراد زکوٰۃ اور غنیمت ہے، یعنی اگر کوئی زکوٰۃ اور غنیمت کو بلاوجہ خرچ کردے اور جس طرح اس کا دل چاہے اس مال کو خرچ کرے، تو اسے قیامت کے دن سوائے دوزخ کی آگ کے کچھ نہیں ملے گا۔ لہٰذا مجاہدین کو چاہیے کہ ان جیسے اموال کے خرچ کے بارے میں معتمد علمائے کرام اور مسئولین سے رہنمائی لیں تاکہ ہر مال کے خرچ کی جگہ ان کو معلوم ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ خدانخواستہ مجاہد کی نیت اور قربانی تو اللہ کی رضا کے لیے ہو لیکن اس کا کام شریعت کے خلاف ہو اور اس کے عذاب کا سبب بن جائے۔

(وما علینا إلّا البلاغ المبین!)

بقیہ: شہادت کی قبولیت کی شرائط

الحمد للہ یہ بھی بالاصل یہاں نہیں موجود ہے، لیکن فرض کرلیں کہ کوئی اپنے قبیلے کی سربلندی کے لیے لڑے، کوئی اس لیے لڑے کہ وزیر قوم جو ہے وہ جیت جائے، وہ غالب آجائے، اس کا اعلائے کلمۃ الوزیر ہو جائے، یا اعلائے کلمۃ المحسود ہو جائے۔ یا اسی طرح وہ یہ چاہ رہے ہوں کہ جو بھی قوم ہے، وہ داوڑ ہے، وہ آفریدی ہے، وہ مہمند ہے یا وہ پنجابی ہے یا وہ کسی اور نسل کے ہیں، جو بھی مختلف نسلوں کے لوگ موجود ہیں، اگر وہ اپنی قوم و قبیلے کی سربلندی کے لیے لڑ رہے ہیں، اپنے قبیلے کو باقی سب پر غالب کرنے کے لیے۔ ان کو اسلام تو چاہیے لیکن اسلام اپنے قبیلے کے ہاتھ سے ہی چاہیے اور غلبہ تو چاہیے لیکن اس طرح چاہیے کہ بس ان کا قبیلہ سب کے اوپر حاکم ہو۔ جس کی جنگ اس بنیاد پہ ہے، اس کو شریعت سے پہلے کسی اور چیز سے غرض ہے تو وہ اللہ کی خاطر نہیں لڑ رہا اور وہ فی سبیل اللہ نہیں ہے۔

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

☆☆☆☆☆

سفر آخرت

(حصہ اول)

الحمد لله والصلاة والسلام على سيّدنا محمد وعلى آله وصحبه وسلم!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طویل حدیث ہمیں اس سفر کے بارے میں بتاتی ہے جو بدن سے نکلنے کے بعد روح کو درپیش ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب ایک مومن کا وقتِ آخر آتا ہے تو فرشتے جنت سے اس کے لیے کفن اور خوشبو لے کر آتے ہیں۔ وہ اس مرنے والے مومن کے ارد گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت تشریف لاتے ہیں اور اس مومن سے کہتے ہیں: ''يا ايتها الروح المطمئنة! ارجعي الى ربك راضية مرضية......''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ روح اتنی آسانی اور سہولت سے بدن سے نکلتی ہے جیسے کسی مَشک یا برتن سے پانی کا قطرہ پھسل جائے یا بہہ جائے۔ جیسے ہی ملک الموت اس روح کو بدن سے نکالتے ہیں، ارد گرد بیٹھے تمام فرشتے لپک کر آتے ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس خوش قسمت روح کو کفن میں لپیٹنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس روح کو آسمان کی جانب لے جاتے ہیں۔

جب بھی وہ ملائکہ کے کسی گروہ کے پاس سے گزرتے ہیں، تو اس روح سے آتی حسین خوشبو کے سبب وہ فرشتے پوچھتے ہیں کہ یہ کس کی روح ہے؟ اس پر اس روح کو لانے والے فرشتے جواب دیتے ہیں کہ یہ فلاں ابن فلاں کی روح ہے۔ اور وہ اس کے لیے اس کے بہترین نام اور القاب استعمال کرتے ہیں۔ پھر وہ پہلے آسمان کے دروازے تک جا پہنچتے ہیں اور داخلے کی اجازت چاہتے ہیں۔ آسمان کے دروازے ان کے لیے کھول دیے جاتے ہیں اور وہ آگے بڑھتے ہیں۔ ہر آسمان سے گزرتے ہوئے اس آسمان کے فرشتے ان کے ہمراہ چلتے ہیں یہاں تک کہ وہ اگلے آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور یونہی تمام آسمانوں سے گزرتے ہوئے آخر یہ روح اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوتی ہے۔ ربّ العالمین اس روح کو کامیابی اور جنت کا مژدہ سناتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس روح کو واپس زمین کی طرف لے جاؤ، کیونکہ وہیں سے ہم نے اسے پیدا کیا، وہیں یہ لوٹائی جائے گی اور وہیں سے ہم اسے دوبارہ زندہ کریں گے۔ اور یوں یہ روح اللہ تعالیٰ کے پاس سے خوش و خرم اور بسعادت واپس لوٹتی ہے۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ایک کافر و فاسق کی روح کی بابت بتاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ فرشتے ایسی روح کے لیے نارِ جہنم کا کفن لے کر آتے ہیں۔ وہ اس کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ملک الموت اسے مخاطب کر کے کہتے ہیں ''ياايتها الروح الخبيثة!.....(اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا سامنا کرنے کے لیے نکل!.....)''۔ مگر یہ روح بدن کے اندر چھپتی پھرتی ہے اور ہر رگ و ریشے سے چمٹتی ہے کیونکہ یہ اندر ہی رہنا چاہتی ہے، رب کے غیض و غضب کا سامنا کرنے کے لیے باہر نہیں آنا چاہتی۔ ملک الموت اسے نکالنے کے لیے کھینچتے ہیں اور نبی صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ اس شخص کی موت کی تکلیف اتنی سخت ہوتی ہے گویا کانٹوں سے بھری ایک جھاڑی ہو اور اس سے گیلی روئی کو کھینچ کھینچ کر علیحدہ کیا جا رہا ہو۔ اس شخص کے تمام رگ و ریشے تار تار ہو جاتے ہیں، اور جیسے ہی روح بدن سے باہر آتی ہے، فرشتے جلدی سے اسے جہنم سے لائے ہوئے اس بدبودار چیتھڑے میں لپیٹ دیتے ہیں اور آسمان کی جانب لے چلتے ہیں۔ جب بھی وہ ملائکہ کے کسی گروہ کے پاس سے گزرتے ہیں تو اس بری روح سے اٹھنے والی گلی سڑی بدبو کے باعث وہ فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ یہ کس کی روح ہے؟ اس کو لانے والے فرشتے اس کا اس کے بدترین ناموں اور القاب سے تعارف کراتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ پہلے آسمان کے دروازوں تک پہنچتے ہیں اور داخلے کی اجازت طلب کرتے ہیں تو اجازت نہیں ملتی اور دروازے نہیں کھولے جاتے اور اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ اس روح کو اسفل ترین زمین کی جانب پھینک دو، لہٰذا اس روح کو اللہ کی ناراضگی اور ذلت و رسوائی کے ساتھ نیچے پھینک دیا جاتا ہے۔

قبر

خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ابن عفانؓ کا جب بھی کبھی کسی قبر پر گزر ہوتا تو وہ رو پڑتے اور اس قدر روتے کہ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ ان سے پوچھا گیا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ جنت و جہنم کو یاد کر کے اتنا نہیں روتے اور آپ کی وہ کیفیت و حالت نہیں ہوتی جو قبر کو یاد کر کے ہوتی ہے؟ آپؓ نے جواب دیا:

"انی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول : إِنَّ الْقَبْرَ أَوَّلُ مَنَازِلِ الْآخِرَةِ فَإِنْ نَجَا مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَيْسَرُ مِنْهُ وَإِنْ لَمْ يَنْجُ مِنْهُ فَمَا بَعْدَهُ أَشَدُّ مِنْهُ"۔[1]

"قبر آخرت کی پہلی منزل ہے۔ اگر اس سے بخیر و عافیت گزر گئے تو اس کے بعد آنے والی ہر منزل آسان ہو گی۔ اور اگر اسے نہ پار کر سکے تو جو کچھ اس کے بعد آئے گا وہ اس سے زیادہ مشکل ہو گا۔"

اور اس کے بعد آپؓ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"مَا رَأَيْتُ مَنْظَرًا قَطُّ إِلَّا وَالْقَبْرُ أَفْظَعُ مِنْهُ."

"میں نے کوئی چیز ہولناک نہیں دیکھی مگر قبر اس سے زیادہ ہولناک ہے۔"

یعنی جتنی ہولناک چیزیں میں نے دیکھی ہیں قبر ان میں سب سے زیادہ ہولناک ہے۔

بہت جلد ہم سب وہاں ہوں گے۔ ہم میں سے ہر ایک کو وہاں جانا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اس دنیا کا عیش و آرام چھوڑنا ہو گا، پھر ہمیں وہاں لے جایا جائے گا اور زمین کے اندر ایک تاریک گڑھے میں اتار دیا جائے گا۔

دورِ نبوی ﷺ میں ایک بوڑھی عورت تھی جو مسجدِ نبوی ﷺ کی صفائی کیا کرتی تھی۔ وہ بیمار تھی اور ایک رات جب رات کافی بیت چکی تھی، اس کا انتقال ہو گیا۔ صحابہ کرامؓ نے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا اور اسے دفنا دیا۔ بعد ازاں نبی کریم ﷺ نے اس کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ بوڑھی عورت کہاں ہے؟ تو صحابہ کرامؓ نے جواب دیا کہ مرض سے اس کا انتقال ہو گیا تو ہم نے اسے دفنا دیا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ "تم نے مجھے کیوں نہ بلایا؟"۔ رسول اللہ ﷺ اس امت کے لیے ایک شفیق باپ کی مانند تھے۔ وہ اپنی امت میں سے ہر ایک کی پروا کرتے تھے، طاقتور و کمزور، مرد و عورت، جوان و بزرگ...... ہر ایک کا یکساں طور پہ خیال رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے اس کی قبر دکھاؤ" اور آپ ﷺ اس بوڑھی عورت کی قبر پر تشریف لے گئے، اس کے لیے دعا فرمائی اور فرمایا:

"ان ہذہ القبر ملیئۃ، ظلم علی اہلہا، وان اللہ عزو جل منورہا لہم بصلوتی علیہم."

" یہ قبریں تاریک ہیں لیکن اللہ تعالیٰ میری دعا کے سبب ان کو روشنی عطا فرمائیں گے۔"

قبر ہی انسان کا اصل گھر ہے، کیونکہ انسان مٹی سے پیدا ہوا، اور مٹی ہی میں لوٹ کر جائے گا، سو ہر شخص جب قبر میں ڈالا جاتا ہے تو قبر اسے زور سے بھینچتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذؓ کی بابت فرمایا کہ "ان للقبر ضغطۃ، لو کان احدا ناجیا منہا، نجی سعد ابن معاذ"، "قبر بھینچتی ہے اور اگر کوئی شخص اس کے بھینچنے سے بچ سکتا تو وہ سعد بن معاذؓ ہوتے"۔ "هَذَا الَّذِي تَحَرَّكَ لَهُ الْعَرْشُ وَفُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَشَهِدَهُ سَبْعُونَ أَلْفًا مِنْ الْمَلَائِكَةِ لَقَدْ ضُمَّ ضَمَّةً ثُمَّ فُرِّجَ عَنْهُ عَذَابُ الْقَبْرِ"[2]۔ سعد بن معاذؓ، جو اللہ کے ولی تھے، وہ بھی قبر کے بھینچنے سے بچ نہ سکے۔ یہ وہ شخص ہے کہ جس کے مرنے سے عرشِ الٰہی ہل گیا، یہ وہ شخص ہے کہ جس کے لیے آسمان کے دروازے کھل گئے...... یہ وہ شخص ہے جس کے جنازے میں ستر ہزار فرشتے شریک ہوئے لیکن اس کی قبر نے ایک مرتبہ اس کو دبایا، اس کے بعد پھر وہ عذاب ختم ہو گیا۔ سعد بن معاذؓ انصار کے ان سرداروں میں سے ایک تھے جنہوں نے مدینہ میں نبی کریم ﷺ کا استقبال کیا، ان ﷺ کی بہترین میزبانی کی اور اپنی موت کے وقت تک ہر طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کرتے رہے۔

اسی طرح ایک بار ایک چھوٹے بچے کو دفنایا جا رہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کوئی قبر کے بھینچنے سے بچ سکتا تو وہ یہ بچہ ہوتا لیکن یہ بھی بھینچا جاتا ہے۔

فتنۂ قبر

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہمیں قبر میں مردے سے سوال و جواب کے بارے میں بتاتی ہے۔ قبر میں موجود انسان کے پاس دو فرشتے آتے ہیں...... منکر اور نکیر۔ ان کی شکلیں خوفناک اور ہیبت ناک ہوں گی، وہ اس شخص کو اٹھا کر بٹھا دیں گے اور مردہ ان کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جائے گا۔ پھر وہ اس سے سیدھے سادے تین سوال پوچھیں گے۔ وہاں کسی ٹال مٹول، کسی حیل و حجت کی گنجائش نہیں ہو گی، تین سوال ہوں گے جن کے جواب بھی فوری اور سیدھے سادے دینے ہوں گے۔

"ما ربّک؟" "تمہارا رب کون ہے؟

"وما دینک؟" "تمہارا دین کیا ہے؟

"ومن نبیّک؟" اور تمہارا نبی کون ہے؟

محض تین سوال ہیں۔ اور یہ وہ اصل امتحان ہے جس کی تمام عمر تیاری کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اپنی زندگی کے کتنے ہی سال امتحانوں کی تیاری میں گزار دیتے ہیں۔ مگر اس اصل اور اہم ترین امتحان کی تیاری میں کتنا وقت صرف کرتے ہیں؟ سوال ہمیں بتا دیے گئے ہیں، اور جواب بھی ہمیں معلوم ہیں۔

مومن ان سوالوں کے یہ جواب دے گا: "میرا ربّ اللہ ہے، میرا دین اسلام ہے، اور میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں"۔ آسمان سے ایک آواز سنائی دے گی: "قد صدق عبدی" اور اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے بیان کی فوری تصدیق کر دیں گے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں

[1] سنن ابن ماجہ

[2] سنن النسائی

فرماتے ہیں: يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الآخِرَةِ[1] "جو لوگ ایمان لائے ہیں، اللہ ان کو اس مضبوط بات پر دنیا کی زندگی میں جماؤ عطا کرتا ہے اور آخرت میں بھی"، اور یہ مضبوط بات کیا ہے؟ یہ مضبوط بات لا الٰہ الا اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن و مسلم کو لا الٰہ الا اللہ پر استقامت عطا کرتے ہیں اور اس پر جما دیتے ہیں۔

جبکہ یہی سوال جب غیر مسلم یا منافق سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا نبی کون ہے؟ تو وہ کہتا ہے: "......کیا؟ میں نہیں جانتا!......میں نے لوگوں کو یہ کہتے سنا اور میں نے بھی یہ کہہ دیا......"۔ تو فرشتے لوہے کا بھاری گرز اس کے سر پر دے ماریں گے جو اسے مٹی میں ملا دے گا۔ اس شخص نے کیا کیا؟ محض یہ کہ جو لوگوں کو نبیوں کے بارے میں کہتے سنا اس نے بھی وہی دہرا دیا۔ 'میں نے ابو جہل کو محمدؐ کے بارے میں یہ کہتے سنا...'، '...میں نے ابو لہب کو سنا...'، '...میں نے اے بی سی نیوز پر دیکھا...'، '...میں نے سی این این پر سنا......'۔ مگر یہ وہ جواب نہیں ہے جو قبر میں فرشتے آپ سے سننا چاہتے ہیں۔ وہ تو صرف ایک صاف اور سیدھا جواب سننا چاہتے ہیں کہ "محمد ﷺ میرے نبی ہیں"۔ اور وہاں صرف یہی جواب قبول ہو گا۔

قبر میں جو تین سوال پوچھے جائیں گے، ان تینوں سوالوں کے جواب دینا لازم ہو گا، وہاں محض یہ کہنا کفایت نہیں کرے گا کہ میں ایک خدا پر یقین رکھتا ہوں۔ خدا کے نمائندوں یعنی اس کے نبیوں، محمد ﷺ، عیسیٰؑ، موسیٰؑ، ابراہیمؑ...... علیہم السلام......اور تمام انبیاءؑ جنہوں نے خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچایا، ان پر ایمان لانا قبر و آخرت میں عذاب سے نجات پانے کے لیے ضروری ہے۔

یہ وہ امتحان ہے جس کا قبر میں سامنا کرنا ہو گا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ آخری ابتلاء ہے جس کا مومن کو سامنا کرنا ہو گا۔

اسماء بنت ابی بکرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر فتنۂ قبر کے بارے میں خطبہ دیا یہاں تک کہ مسجد میں (صحابہ کے رونے سے) ایک بلند شور پیدا ہو گیا۔ اسماءؓ فرماتی ہیں کہ شور اتنا بلند تھا کہ میں نبی ﷺ کی بات سن نہ سکی۔ پھر جب شور ذرا کم ہوا تو میں نے ایک شخص سے پوچھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا؟ تو اس نے جواب دیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اوحی الی انکم تفتنون فی قبورکم قریبا من فتنة دجال"۔

رسول اللہ ﷺ نے قبر کی آزمائش کو اپنی شدت اور سختی میں فتنۂ دجال سے مماثل قرار دیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ما من فتنة منذ عن خلق آدم الی قیام الساعة اشد من فتنة دجال۔ "آدمؑ کی پیدائش سے لے کر قیامت کے دن تک، کوئی فتنہ دجال کے فتنے سے بڑا اور سخت نہیں ہے"۔ اور ہم میں سے ہر ایک اپنی قبر میں ایسے سخت ترین امتحان سے گزرنے والا ہے۔ یہ کوئی امکانی بات نہیں، بلکہ یقینی امر ہے۔ یہاں کسی اور کی نہیں بلکہ میری اور آپ کی بات ہو رہی ہے۔ بہت جلد، میں اور آپ اس فتنہ اور ابتلاء سے گزرنے والے ہیں۔

جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہ سنا تو مسجد میں ان کی آہ وزاری سے ایک شور مچ گیا۔ وہ اس لیے رو رہے تھے کیونکہ ان کے دل نرم تھے اور قبر و آخرت کا تذکرہ سن کر پسیج جاتے تھے، بھر آتے تھے۔ مگر ہم......ہم اس تذکرے سے متاثر نہیں ہوتے۔ اور اگر متاثر ہوتے بھی ہیں تو یہ تاثر بے حد عارضی ہوتا ہے، جو بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے انسانی زندگی ختم ہوتے دیکھتے ہیں، مردہ انسان کو قبر کے گڑھے میں ڈلتا دیکھتے ہیں، اپنی آنکھوں سے قبر اور موت کا مشاہدہ کرتے ہیں، مگر اس کے باوجود اسی قبرستان میں ہم آپس میں ہنسی مذاق بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ قسوۃ القلب کی علامت ہے۔ دلوں کی سختی کی، یہ دل ایسے سخت ہیں جیسے پتھر کی چٹانیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ حال تھا کہ ان کے سامنے محض قبر کا تذکرہ ہوتا اور ان کی آہ و بکا سے مسجد میں ایسا شور بپا ہو جاتا کہ کہنے والے کی بات سننا مشکل ہو جاتا۔

ہم قسوۃ القلب کی بیماری کا شکار ہیں، جس کا ہمیں علاج کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ مرض جو ہمیں لاحق ہے شدید سے شدید تر امراضِ دل سے کہیں زیادہ سنگین نوعیت کا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم لوگ جو دل کے معمولی سے مسئلے پر بھی انتہائی جان فشانی سے اپنا وقت، محنت اور پیسہ لگا کر علاج کرتے ہیں، دل کی ان (روحانی) بیماریوں کی جانب بالکل توجہ نہیں دیتے اور انہیں یونہی اندر ہی اندر بڑھنے اور پھیلنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> "إِنَّ هَذِهِ الْأُمَّةَ تُبْتَلَى فِي قُبُورِهَا فَلَوْلَا أَنْ لَا تَدَافَنُوا لَدَعَوْتُ اللَّهَ أَنْ يُسْمِعَكُمْ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِي أَسْمَعُ منه."
>
> "اس جماعت کو ان قبروں میں عذاب ہو رہا ہے، کاش کہ اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تم لوگ اپنے مردوں کو دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ وہ تمہیں بھی قبر کا عذاب سنا دے جسے میں سن رہا ہوں۔"[2]

ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قبر میں مردے کو ملنے والے عذاب کو سن سکتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ نہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مردے کی آوازیں سن سکتے تھے بلکہ ہم ایسے واقعات سن چکے ہیں جن میں عام لوگوں نے قبر سے مردوں کو باہر نکلتے، عذاب پاتے ہوئے چیختے چلّاتے سنا ہے اور ان کے جسموں پر ان کو ملنے والے عذاب کے نشان نظر آ رہے ہوتے۔

(باقی صفحہ نمبر 13 پر)

[1] الابراہیم: ۲۷

[2] صحیح مسلم: ۲۷۱۲

اسلامی نظامِ حکومت (خلافت اور امارت) کی اہمیت

خلیفہ اور سلطان کی امارت کے بغیر اسلامی بنیادوں پر قائم حکومت شرعی احکامات کی تطبیق نہیں کر سکتی۔ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ایک مکمل نظامِ حیات ہے جس میں مخلوق کے مصالح، معاملات، عقیدہ، جہاد، اوامر و نواہی، حدود، تربیت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اخلاق اور آداب سمیت ہر چیز موجود ہے اور ان تمام امور کی تطبیق ایک ایسی اسلامی حکومت کے ساتھ جڑی ہے، جس کے اوپر ایک ایسا خلیفہ یا سلطان ہو، جو اللہ کی طرف سے بھیجے گئے نظام کو حکومت کے طور پر نافذ کرے۔

جب فرض احکامات کو عملی زندگی میں لانا اسلامی نظام کے ساتھ مربوط ہو گیا، تو اسلامی نظام کا قیام فرض ہو جاتا ہے، ایک اصولی قاعدہ ہے ”ما لا يتم الواجب إلا به فهو واجب“، یعنی واجب کی تکمیل جس چیز پر موقوف ہو وہ بھی واجب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ○ (سورۃ البقرہ: ۳۰)

”میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

امام قرطبیؒ اپنی تفسیر میں اس آیت کے بارے میں لکھتے ہیں ”یہ آیت ایک ایسے امام و خلیفہ کے بارے میں ہے، جس کی بات سنی جائے اور اس کی اطاعت کی جائے، تاکہ جس پر مسلمان متحد ہوں اور جس پر خلافت کے احکام نافذ ہو جائیں، لہٰذا اس کے واجب ہونے میں کسی بھی قسم کا اختلاف نہیں، نہ ہی اُمت میں اور نہ ہی ائمۂ امت میں، لیکن صرف اور صرف ابو بکر اصم جو بڑے معتزلہ میں سے تھے وہ کہتے ہیں، کہ یہ واجب نہیں“۔

ہمارے لیے اس کے واجب ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ قول مبارک ہے کہ ’میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں‘، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ’اے داودؑ میں تمہیں زمین میں اپنا خلیفہ بناتا ہوں‘۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ’اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال کرتے ہیں، کہ انہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنائے گا‘“، اور ان جیسی اور آیات بھی موجود ہیں جو قیامِ خلافت کی دلیل ہے۔

امام قرطبی فرماتے ہیں ”جب خلیفہ کے انتخاب پر انصار و مہاجرین کے مابین اختلاف پیدا ہو گیا، انصار نے کہا کہ ہمارے درمیان سے بھی ایک امیر کا انتخاب ہو گا اور آپ میں سے بھی ایک امیر منتخب ہو گا۔ پس اگر کوئی یہ کہے کہ خلافت واجب نہیں، تو پھر بھلا کیوں صحابہؓ کے درمیان غیر واجب عمل میں تنازع پیدا ہوا“۔

محمد عمر النسفی رحمہ اللہ اپنی کتاب ”العقائد“ میں لکھتے ہیں:

”مسلمانوں کا ایک امیر ہونا چاہیے، جو احکامات نافذ کرے، حدود قائم کرے، سرحدات کی حفاظت کرے، ان کے لشکروں کو منظم کرے، مسلمانوں سے صدقات (عشر و زکوٰۃ) وصول کرے، ظالموں، چوروں، غاصبوں اور ڈاکوؤں کو روکے، جمعہ اور عیدین کی نمازوں کو قائم کرے، لوگوں کے درمیان جھگڑوں کو ختم کر دے، لوگوں کے حقوق دینے کے معاملے میں شہادتوں کو قبول کرے، ایسے چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں جن کا کوئی ولی وارث نہ ہو ان کا نکاح کرائے، غنیمت تقسیم کرے اور ان جیسے کئی دیگر امور نافذ کرے۔“

ابنِ خلدونؒ اپنے مقدمے میں کہتے ہیں:

”امیر کا انتخاب کرنا واجب ہے اور شریعت میں اس کے واجب ہونے کا حکم صحابۂ کرامؓ اور تابعین کے اجماع سے ثابت ہے، جب نبی کریم ﷺ نے رحلت فرمائی، تو صحابہ کرامؓ نے سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا انتخاب کیا، لہٰذا یہ ثابت ہے کہ ہر زمانے میں مسلمانوں نے اپنے اوپر امیر منتخب کیا ہے اور ایسا زمانہ نہیں گزرا جس میں مسلمان بغیر امیر کے رہے ہوں اور یہ اجماع امام کے انتخاب پر دلالت کرتا ہے۔“

علمائے کرام کہتے ہیں: ”امیر کا انتخاب دین کے اہم واجبات میں سے ہے، جب صحابۂ کرامؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبی کریم ﷺ کی تدفین سے قبل خلیفہ کا انتخاب کیا اور اس کے بعد آپ ﷺ کی تدفین کی، آپؐ کے اس عمل سے خلافت و امارت کے قیام کی اہمیت واضح ہوتی ہے اور اس بابت علمائے کرام سے کئی اقوال نقل ہیں جن سے کوئی انکار نہیں کر سکتا“۔

اگر حاکمیتِ اسلام نہ ہو، تو قرآنِ کریم اور احادیثِ مبارکہ میں موجود تمام شرعی احکامات معطل ہو جائیں گے، حالانکہ یہ شرعی احکامات نفاذ کے لیے آئے ہیں نہ کہ معطل کرنے کے لیے، لہٰذا مجاہدین کی طرف سے امارت اسلامیہ کے قیام کی جدوجہد دینِ اسلام کے اہم ترین واجب عمل کے لیے ہے۔

مجاہدین کو چاہیے کہ عشر و زکوٰۃ میں بلاوجہ اسراف سے بچیں

مجاہدین کو چاہیے کہ مسلمانوں کی طرف سے ادا کیے گئے صدقات یعنی عشر اور زکوٰۃ کو مناسب جگہوں میں استعمال کریں، ان اموال میں سے ذاتی استعمال اور اسراف سے اپنے آپ کو بچائیں، نبی کریم ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے کہ حضرت خولہ انصاریہؓ کہتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:......

(باقی صفحہ نمبر 13 پر)

شہادت کی قبولیت کی شرائط

شہید عالمِ ربّانی استاد احمد فاروق رحمہ اللہ

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ نعم إن قتلت في سبيل الله تعالیٰ... تیری شہادت قبول ہو گی، تیرے سارے گناہ بخش دیے جائیں گے ...إن قتلت في سبيل الله... اگر تو اللہ کے رستے میں مارا جائے۔ تو پہلی شرط کیا ہے کہ جو شخص مارا جا رہا ہو، وہ اللہ کے رستے میں مارا جا رہا ہو۔ اللہ کے رستے میں مارا جانے سے کیا مراد ہے؟ یہاں پہ اخلاص کے پہلو سے اور ریا سے بچنا، اس پہلو پہ بات نہیں ہو رہی، اس پہ حدیث میں آگے چل کے جو تیسری شرط ہے وہ اس پہ بات کرے گی۔ یہاں خود نفسِ سبیل کی بات ہو رہی ہے، کہ وہ جس رستے پہ چل رہا ہو وہ جہادِ شرعی کا رستہ ہو، وہ اللہ کا رستہ ہو، وہ کسی اور مقصد کی طرف جانے والا رستہ نہ ہو۔

تو ہم فی سبیل اللہ کس کو کہتے ہیں، دوسری حدیث سے اس کی تشریح ہوتی ہے، کہ...من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله...رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جس نے اس لیے جنگ کی، اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جو لڑا وہ اللہ کے رستے میں ہے۔ تو اللہ کے رستے میں کون ہے، جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے لڑ رہا ہے۔ اب یہ اعلائے کلمۃ اللہ کیا ہوتا ہے؛ اعلاء کہتے ہیں کسی چیز کو بلند کرنے کو، اونچا کرنے کو۔ تو جس کی جنگ اس لیے ہے کہ وہ بلند کرے کس چیز کو، کلمۃ اللہ کو۔ اب یہ کلمۃ اللہ کیا ہے؟ تو کلمۃ اللہ کی تشریح میں شارحینِ حدیث تین معنی بیان کرتے ہیں، تینوں ایک دوسرے سے ملتے جلتے معنی ہیں۔ ایک معنی یہ ہے کہ کلمۃ اللہ سے مراد ہے دینُ اللہ، کہ اللہ کا دین۔ کہ جو اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے لڑے، جیسا کہ ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں یا علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ کلمۃ اللہ سے مراد ہے کہ اللہ کا دین، دینُ اللہ۔ تو جو اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے لڑے، وہ کس رستے میں لڑ رہا ہے؟ فی سبیل اللہ! وہ اللہ کے رستے میں ہے اور اگر وہ اس رستے میں مارا جائے گا تو وہ شہید ہو گا، اگر وہ باقی بھی تین شرائط پوری کرے۔ دوسرا علماء فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ہے کہ توسیع دعوت الی اللہ، کہ جو اس لیے لڑے کہ اللہ کے دین کی دعوت پھیلے، اسلام کی دعوت عام ہو جائے، تو جو اس لیے لڑ رہا ہے وہ بھی اللہ کے رستے کے اندر لڑ رہا ہے جیسا کہ علامہ ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔ تو یہ دوسرا معنی بیان کرتے ہیں کہ ایک یہ معنی کہ جو اللہ کے دین کے غلبے کے لیے لڑے، باقی سب دین پست ہو جائیں، اسلام غالب آجائے، جو اس لیے لڑ رہا ہے، اس کا لڑنا فی سبیل اللہ ہے۔ جو اس لیے لڑ رہا ہے کہ اسلام کی دعوت پھیلے اور کفر و شرک کی دعوت مٹے، وہ اللہ کے رستے میں لڑ رہا ہے۔ تیسرا معنی وہ کہتے ہیں کہ کلمۃ اللہ سے مراد ہے، لا الہ الا اللہ!۔۔۔ کہ جو لا الہ الا اللہ کے لیے لڑتا ہے، جو توحید کے لیے لڑتا ہے، جیسا کہ علامہ عینیؒ لکھتے ہیں، جیسا کہ صاحبِ عون المعبود لکھتے ہیں کہ جو اس لیے لڑ رہا ہے کہ توحید کا بول بالا ہو، شرک ختم ہو، کفر ختم ہو، شرک کا ہر مظہر ختم ہو اور توحید اور لا الہ الا اللہ ہر سمت دنیا میں توحید کا کلمہ پھیل جائے، عملاً حاکمیت بھی توحید کی ہو اور قلوب کے اندر بھی توحید راسخ ہو، جو اس لیے لڑ رہا ہے اس کا لڑنا کس کے لیے ہے، اللہ کے لیے ہے، وہ اللہ کے رستے میں ہے۔ تو یہ تینوں معنی ملتے جلتے ہیں؛ جو اللہ کے دین کے لیے لڑے، وہ اللہ کے رستے میں ہے کہ دین غالب آئے اور باقی سب ادیان مغلوب ہوں۔ جو اس لیے لڑے کہ توحید غالب آئے، توحید پھیلے اور شرک ختم ہو، وہ اللہ کے رستے میں ہے۔ جو اس لیے لڑے کہ اسلام کی دعوت عام ہو جائے تو اس کا لڑنا جو ہے وہ اللہ کے رستے میں ہے۔

اس تعریف سے پیارے بھائیو! مجھے اور آپ کو مقصد سمجھ میں آجانا چاہیے کہ ہم جہاد کس لیے کر رہے ہیں۔ ہمارا جہاد اگر کسی ظلم کے خاتمے کے خلاف بھی اٹھنے سے شروع ہو تو یہاں پہ رکے گا نہیں۔ ہمارا جہاد اس لیے بھی شروع ہو کہ مسلمانوں کی سرزمین سے کفار کو نکالنا ہے تو یہ جہادِ شرعی تب بنے گا کہ جب اس کا ہدف یہ ہو کہ جب کافر کو نکال دیں گے تو پھر کیا کریں گے؟ شریعت نافذ کریں گے، اسلام غالب کریں گے اور توحید کو قائم کریں گے اور شرک کو مٹائیں گے۔ اسی طرح مظلومین جب ظلم ختم کر دیں گے، ظالم کا ہاتھ توڑ دیں گے تو پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟ اس کے بعد شرک ختم کریں گے، توحید قائم کریں گے، شریعت نافذ کریں گے۔ جو اس لیے لڑ رہا ہے، اسلام کی دعوت پھیلانے کے لیے، اسلام کو قائم کرنے کے لیے، تو اس کا لڑنا اللہ کے رستے کے اندر ہے۔

اس تعریف سے کچھ باتیں سمجھ میں آتی ہیں کہ پھر بعض جنگیں ایسی ہیں جو بظاہر کلمہ گو لوگ لڑ رہے ہیں لیکن وہ جہاد نہیں ہے۔ مثلاً کیا سمجھ میں آتا ہے؟ نمبر ایک تو یہ کہ جو وطنیت کی خاطر لڑے وہ جہاد نہیں کر رہا۔ جہاد کی تعریف بتا دی گئی، فی سبیل اللہ کی تعریف بتا دی گئی کہ جو فی سبیل اللہ نہیں ہے وہ کون ہے مثلاً جو وطنیت کی خاطر لڑ رہا ہے۔ ہم بھی زمین کی خاطر لڑتے ہیں لیکن صرف زمین پہ بات رکتی نہیں ہے ہماری۔ کیا ہم افغانستان کی زمین واپس نہیں لینا چاہتے؟ کیا ہم نہیں چاہتے کہ امریکا پاکستان کی سرزمین سے بے دخل ہو جائے؟ چاہتے ہیں۔ لیکن کیا ہماری جنگ یہیں پہ ختم ہو جاتی ہے، کیا بس اتنا ہی مطلوب ہے؟ تو جو شخص بس اس لیے لڑ رہا ہے کہ غاصبوں کو نکال دے، باہر والوں کو، اجنبیوں کو، جو باہر سے فارنرز آئے ہوئے ہیں ان کو نکال دے اور ان کو نکالنے کے بعد کیانی حکومت کرتا ہو، اس کے بعد کفر کا یہی نظام چلتا

ہو، اس کے بعد یہی نواز شریف، بے نظیر اور ان کی پارٹیاں چل رہی ہوں، اس کو اس سے غرض نہیں ہے، یہ جہاد نہیں کر رہاہے، یہ فی سبیل اللہ نہیں ہے، یہ وطن کی خاطر لڑ رہاہے۔ پاکستان کی فوج کس لیے لڑتی ہے، پاکستان کی فوج میں کوئی فوجی بھی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے لڑ رہاہوں، اس کو اس لفظ کا مطلب ہی نہیں پتہ ہو گا کہ یہ ہوتی کیا چیز ہے۔ وہ لڑ رہاہے وطن کی خاطر، ملکی سالمیت کی خاطر، پاکستان کی سرحدوں کی حفاظت کی خاطر، وطن بطور وطن اس کا خدا ہے، وہ اس کا معبود ہے، وہ اس کی خاطر لڑتا ہے۔ تو جب اس طرح لڑے گا تو وہ کس طرح کا مجاہد ہے اور وہ کیسے اللہ کے رستے میں مارا جانے والا شہید کہلائے گا، کیسے اس پہ یہ لفظ منطبق ہو گا۔ اس لفظ کو بہت سہل جان لیا گیا نا۔ ہر ایک شہید ہو گیا مثلاً ابھی سلمان تاثیر گستاخِ رسول ہونے کو باوجود، اس کا بیٹا کہتا ہے وہ شہید ہوا ہمیں اس پہ فخر ہے۔ تو شہید اتنے آرام سے بن جاتا ہے، شریعت نے شہید کے لیے کچھ اوصاف بتائے ہیں۔ اسی طرح پوری پیپلز پارٹی کیا کہتی ہے، ان کی اصطلاح میں شہید بی بی صاحبہ! تو وہ کس چیز کی شہید؟ یعنی اس قسم کی عورت کہ جس کا نہ دین نہ ایمان نہ کچھ اور، باقی تفصیلات بتانے کی ضرورت نہیں ہے، تو وہ بھی شہید ہو گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید، فلاں شہید، یعنی شہداء کی ایک لمبی فہرست ہے ہماری سیاست میں۔ کفر یہ سیاست کرتے کرتے مرے، ساری زندگی اللہ کی ایک حد نہیں نافذ کی، دین کا تمسخر اپنے عمل اور اپنے قول سے اڑایا، اس کے بعد بھی وہ شہید رہتے ہیں۔ اور یہ سارے فوجی وزیرستان میں اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے آتے ہیں؟ یہ توحید پھیلانے کے لیے آتے ہیں؟ اور یہ سوات میں اس لیے گئے تھے کہ شریعت نافذ کریں گے؟ تو یہ فی سبیل اللہ نہیں ہے، یہ سبیل الطاغوت میں لڑ رہے ہیں، یہ کفر کی خاطر لڑ رہے ہیں، یہ وطن کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ وطن کی خاطر پیارے بھائیو کافر بھی لڑتا ہے۔ کلمہ گو اگر وطن کی خاطر لڑنا شروع کر دے تو اس سے وہ لڑنا جہاد نہیں ہو جاتا۔ تو مثال دیتا ہوں کہ اگر صرف کلمہ پڑھنے سے ہو جاتا تو بہت سے ڈاکو ہیں جو کلمہ پڑھتے ہیں، کیا وہ جہاد کر رہے ہوتے ہیں؟ بہت سے لوگ ہیں نا! بہت سے چور ہیں جو کلمہ پڑھتے ہیں، بندوق لے کے گھستے ہیں لوگوں کے گھروں میں اور سب کچھ لوٹ کے نکل جاتے ہیں تو وہ جہاد کر رہے ہیں؟

ہر وہ بندوق جو مسلمان اٹھائے وہ جہاد نہیں کہلاتی، اس کے لیے شریعت نے کچھ حدود و قیود بتا دی ہیں۔ تو یہ فوجی جو یہ جنگ لڑ رہے ہیں، وہ کفر کی جنگ ہے، وہ وطنیت کی جنگ ہے، وطن کو آزاد کرانے کی جنگ ہے۔ ایسی جنگ کوئی بھی کرے، مثال کے طور پہ؛ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ لڑتی ہے، کس لیے لڑتی ہے؟ جموں و کشمیر لبریٹ ہو جائے، آزاد ہو جائے۔ یہ اسلام کی جنگ تو نہیں ہے، ان کو اس سے نہیں غرض کہ اس کے بعد وہاں پہ فاروق عبد اللہ حکومت کرتا ہے یا کون حکومت کرتا ہے اور کیا نظام چلتا ہے۔ ان کو صرف زمین چھڑانے سے غرض ہے، وطن آزاد کرانے سے غرض ہے، جس کو اس سے غرض ہو گی اس کی جنگ اسلام کے لیے نہیں ہے۔ الفتح لڑ رہی ہے فلسطین میں، کس لیے لڑ رہی ہے کہ زمینِ فلسطین آزاد ہو جائے چاہے محمود عباس جیسا کافر وہاں پہ حاکم ہو، ان کو اس سے فرق نہیں پڑتا ہے۔ ہر شرعی و غیر شرعی طریقے سے اپنے مقصد تک پہنچنا ہے تو وہ اللہ کے رستے میں نہیں لڑ رہے ہیں۔ جن کی جنگ اس لیے نہیں ہے کہ وہاں پہ اسلام آئے، جن کی جنگ اس لیے نہیں ہے کہ توحید آئے اور شرک و کفر مٹ جائے، جن کی جنگ شریعت کے نفاذ کے لئے نہیں ہے، وہ اللہ کے رستے میں نہیں ہے۔ تو یہ پہلی چیز ذہن میں رکھیے کہ جو وطن کی خاطر لڑتا ہے، اس کی جنگ فی سبیل اللہ جنگ نہیں ہے اور اس کا مرنا شہادت نہیں ہے، مردار ہو رہا ہے، حرام موت مر رہا ہے وہ۔

اسی طرح جو شخص بھی قومیت یا لسانیت کی خاطر لڑتا ہے، تو ہمارے ملک میں ایسی تحریکات موجود ہیں جو قوم کی خاطر لڑتی ہیں۔ مثال کے طور پہ اپنے ملک سے باہر بھی نکلے، اگر کوئی آج افغانستان میں اس لیے لڑے کہ پشتون قوم کو میں نے آزاد کرانا ہے۔ الحمدللہ افغانستان میں جو مجاہدین موجود ہیں ان کی غالب اکثریت اس لیے نہیں لڑ رہی ہے۔ ان شاء اللہ وہ امارت اسلامیہ کے قیام کے لیے اور شریعت کی دوبارہ واپسی کے لیے لڑ رہی ہے۔ لیکن بالفرض، اگر کوئی ایسے لوگ ہوں کہ جو کہیں کہ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ امریکا و نیٹو نکل جائیں اور ہماری کُل غرض اس سے ہے کہ یہاں پہ ایک پشتون قوم آزاد ہو، اس کے بعد پھر جب وہ نکل جائیں تو وہ مذاکرات بھی اسی بنیاد پہ کر رہے ہوں کہ بھئی نکلنے کے بعد کرزئی بھی بیٹھ جائے، دوستم بھی بیٹھ جائے، شمالی اتحاد بھی بیٹھ جائے، ملا عمر بھی بیٹھ جائے، باقی بھی سب بیٹھ جائیں، مل ملا کے، مشورہ کر کے جو بہتر ہو وہ کر لیں۔ تو جس کی مستقبل کی یہ نظر ہے، جس کا ہدف ہی واضح نہیں ہے کہ اس نے کس کے لیے لڑنا ہے اور وہ صرف و صرف اپنی قوم کو آزاد کرانا چاہتا ہے، اس کی جنگ فی سبیل اللہ جنگ نہیں ہے، اس لیے کہ مقصد یہاں نہیں پورا ہوتا۔ باہر کے کافر کی جگہ اندر کا کافر آ جائے تو کافر تو کافر ہی ہوتا ہے، جنگ ختم نہیں ہو گی، جنگ پھر بھی جاری رہے گی۔

تو یہ نقطہ ذہن میں واضح رہے کہ کوئی بھی، اسی طرح اے این پی ہے۔ اے این پی کا کیا جھگڑا ہے، اے این پی ایک پشتون قومیت کا نعرہ ہے، پختون خواہ کا نعرہ ہے۔ ایم کیو ایم ہے، یہ کیا ہے؟ متحدہ قومی موومنٹ ہے، تو یہ جو قومیت کی، عصبیت کی، لسانیت کی جتنی جنگیں ہیں، یہ سب کفر کی جنگیں ہیں، سب جاہلیت کی جنگیں ہیں، جو ان عصبیتوں پہ مرے گا، حدیث کہتی ہے کہ...فقتلته جاهلية...اس کا مرنا جاہلیت کی یعنی کفر کی موت ہو گا، وہ جنت کا مستحق نہیں ہوتا اس کفر کی لڑائی لڑنے کے بعد۔

تو اس کے اوپر ہی قیاس کر لیں باقی سب۔ کوئی سرائیکی قومیت کا نعرہ بلند کرے، کوئی بے ایل اے، بلوچ لبریشن آرمی ہو، تو یہ ساری کی ساری جنگیں فی سبیل اللہ جنگیں نہیں ہیں، چاہے ظاہراً کلمہ گو لوگ ہی ان جنگوں کے اندر اتر رہے ہوں۔ اسی طرح کوئی اپنے قبیلے کی بلندی کی خاطر لڑے۔

(باقی صفحہ نمبر 13 پر)

مجاہد جہاد کیوں چھوڑ جاتا ہے؟

ابو البـــراء الإِبــي

یہ تحریر یمن کے ایک مجاہد مصنف ابوالبراء الإبي کی تصنیف 'تبصرة الساجد في أسباب انتكاسة المجاهد' کا ترجمہ ہے۔ انہوں نے ایسے افراد کو دیکھا جو کل تو مجاہدین کی صفوں میں کھڑے تھے، لیکن آج ان صفوں میں نظر نہیں آتے۔ جب انہیں تلاش کیا تو دیکھا کہ وہ دنیا کے دیگر دھندوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا؟ اور اس سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟ یہ تحریر ان سوالوں کا جواب ہے۔ (ادارہ)

دوسری وجہ: خراب نیت اور دنیا کی خاطر جہاد

پس نیت پر ہر کام کا دارومدار ہے۔ نیت ہی عمل کی روح ہے۔ عمل تب ہی صحیح ہوتا ہے جب نیت صحیح ہو۔ اور اگر نیت فاسد ہو تو فاسد ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالی کی سنت ہے جو کہ نہ تبدیل ہوتی ہے نہ بدلتی ہے کہ ہر انسان کو اس کی نیت، اخلاص اور رب کے ساتھ معاملے کی بنا پر اجر دیا جاتا ہے۔ جبکہ ریاکار کو اللہ تعالی اتنا قابل نفرت او ذلیل بناتا ہے جو اس کے لائق ہو۔ پس مخلص کے لیے ہیبت اور محبت ہوتی ہے اور ریاکار کے لیے نفرت اور بغض۔

نبی اکرم ﷺ مسلمانوں کو جہاد میں نیت کی اصلاح پر توجہ دیتے تھے۔ کہ قتال کے پیچھے جذبہ غنیمت کا حصول، یا شہرت حاصل کرنا، یا وطن اور ذات کی عزت نہ ہو۔ نبی اکرم ﷺ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو شجاعت کی خاطر یا اپنی قومی غیرت کی خاطر لڑتا ہے۔ کہ ان میں سے کون اللہ کی راہ میں ہے۔ آپ نے فرمایا:

من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله.

"جو اللہ تعالی کا کلمہ بلند کرنے کے لیے لڑتا ہے وہ فی سبیل اللہ ہے۔"

پس اللہ تعالی کے لیے نیت خالص کرنا ناگزیر ہے۔ جہاد کے ساتھ کوئی دوسرا دنیوی غرض شامل نہ ہونے پائے۔ کیونکہ اللہ تعالی وہی عمل قبول کرتا ہے جو اس کے لیے خالص ہو اور صرف اللہ کی خاطر کیا جائے۔

حضرت ابوہریرہ سے مروی حدیث میں آتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

تضمن الله لمن خرج في سبيله، لا يخرجه إلا جهادا في سبيله، وإيمانا بي ، وتصديقا برسلي، فهو علي ضامن أن أدخله الجنة، أو أرجعه إلى مسكنه الذي خرج منه. نائلا ما نال من أجر أو غنيمة. والذي نفس محمد بيده! ما من كلم (أي جرح) يكلم في سبيل الله إلا جاء يوم القيامة كهيئته حين كلم، لونه لون دم، وريحه ريح مسك، والذي نفس محمد بيده، لولا أن يشق على المسلمين ما قعدت خلاف سرية تغزو في سبيل الله أبدا، ولكن لا أجد سعة فأحملهم ولا يجدون سعة، ويشق عليهم أن يتخلفوا عني. والذي محمد بيده لوددت أن أغزو في سبيل الله فأقتل، ثم أغزو فأقتل، ثم أغزو فأقتل.

"اللہ تعالی ایسے شخص کی ضمانت کرتا ہے جو اس کی راہ میں صرف جہاد فی سبیل اللہ کی غرض سے نکلے، اللہ پر ایمان لاتے ہوئے، پیغمبروں کی تصدیق کرتے ہوئے، کہ اسے جنت میں داخل کریں گے۔ یا اسے واپس جس ٹھکانے سے وہ نکلا تھا وہاں ایسی حالت میں پہنچا دیں گے کہ اسے اجر اور غنیمت سے اس کا حصہ مل چکا ہو۔
قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے! اللہ کی راہ میں جو بھی زخم پہنچتا ہے وہ قیامت کے دن اسی حال میں آئے گا۔ اس کا رنگ خون کا رنگ ہو گا اور اس کی خوشبو مشک کی ہو گی۔
قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے! اگر مسلمانوں پر شاق نہ گزرتا میں اللہ کی راہ میں نکلنے والے کسی سریہ کو چھوڑ کر ہرگز پیچھے نہ بیٹھتا۔ لیکن نہ میرے پاس اتنی گنجائش ہے کہ سب کو سفر پر بھیج سکوں اور نہ خود ان کے پاس ہے۔ اور ان کے لیے یہ انتہائی شاق ہے کہ مجھے بھیج کر خود پیچھے رہ جائیں۔
قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے! میری تمنا ہے کہ میں فی سبیل اللہ غزا کروں اور قتل کر دیا جاؤں۔ پھر غزا کروں پھر قتل کر دیا جاؤں۔ پھر غزا کروں پھر قتل کر دیا جاؤں۔"

یہ مشکل ہو گا کہ ہم وہ بے شمار نمونے پیش کریں جن سے واضح ہو کہ ان نبوی ارشادات سے مسلم مجاہد کی نفسیات پر کیا اثر پڑا۔ یہاں ہم عام سپاہیوں میں سے محض دو نمونے پیش کرتے ہیں۔ غزوہ احد میں نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کو لڑائی کے وقت فرمایا:

قوموا إلى جنة عرضها السماوات والأرض

"اس جنت کی طرف بڑھو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔"

حضرت عمیرؓ بن حمام انصاری نے یہ سنا تو کہا:
"اے اللہ کے رسول ﷺ! آسمانوں اور زمین کے برابر عرض والی جنت!!"

آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں"

حضرت عمیرؓ نے کہا: ”واہ، واہ!“

پیغمبر پاک ﷺ نے فرمایا: ”تم نے واہ واہ کیوں کہا؟“

حضرت عمیرؓ نے فرمایا: ”اے رسول اللہ ﷺ میرا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ بس میں نے تمنا کی کہ میں اس جنت والوں میں سے ہوں۔“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تو تم اس جنت والوں میں سے ہو۔“

حضرت عمیرؓ اپنے توشے میں چند کھجور نکال کر کھانے لگے تھے کہ فرمایا: ”ان کھجوروں کو ختم کرنے تک عرصہ گزر جائے گا۔“

چنانچہ انہوں نے وہ کھجوریں پھینک دیں اور دشمن سے اتنا لڑے کے شہید ہو گئے۔

یہ پہلا نمونہ تھا۔

اور دوسرا نمونہ؛ غزوہ خیبر میں ایک اعرابی نے بھی شرکت کی۔ نبی اکرم ﷺ نے ارادہ کیا کہ اسے غنیمت کا کچھ حصہ دیں لیکن وہ موجود نہ تھا۔ جب آیا تو صحابہؓ نے اس کا حصہ اسے دیا۔ تو وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہا:

”میں اس کی خاطر آپ کے پیچھے نہ ہوا تھا۔ میں نے تو آپ کی پیروی اس لیے کی کہ مجھے یہاں تیر مارا جائے (اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تاکہ میں جنت میں داخل ہو جاؤں۔“

آپ ﷺ نے فرمایا:

إن تصدق يصدقك الله

”اگر تم سچ کہو گے تو اللہ بھی تمہارے ساتھ سچائی کا معاملہ فرمائیں گے۔“

کچھ عرصے بعد صحابہؓ دشمن سے لڑنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ اور لڑائی کے بعد اس شخص کو لائے جب کہ اسے وہیں تیر لگا تھا جہاں اس نے اشارہ کیا تھا۔ پس نبی اکرم ﷺ نے اپنے جبے میں اسے کفنایا، اس پر نماز پڑھی اور دعا دی۔ جس میں یہ فرمایا:

> اللهم هذا عبدك خرج مهاجرا في سبيلك فقتل شهيدا، وأنا عليه شهيد.
>
> ”یا اللہ! یہ تیرا بندہ تیری راہ میں مہاجر بن کر نکلا اور شہید قتل ہوا۔ اور میں اس پر گواہ ہوں۔“

یہ روایت اس بات پر انتہائی زور سے دلالت کرتی ہے کہ ایک ایسے اعرابی پر ایمان کا کتنا اثر ہوا جس کی زندگی جاہلیت میں لوٹ مار سے بھری تھی۔ اور اب وہ اپنے جہاد کے بدلے جنت کے علاوہ کوئی قیمت نہیں قبول کرتا۔ تو سوچیے کہ رسول اللہ ﷺ کے خاص صحابہؓ کے دلوں میں ایمان کا کیا حال ہو گا؟ (بحوالہ نضرت النعیم)

نیت کے اثر کے حوالے سے یہاں سلف کے چند اقوال ذکر کرتے ہیں:

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا گیا: کیا آپ جنازے میں شریک نہ ہوں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ: اگر میری نیت ہوتی تو میں چلا جاتا۔

جب حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ وفات ہوئے تو حضرت ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ ان کے جنازے میں شریک نہ ہوئے۔ جب ان سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: میری نیت نہیں تھی۔

علماء سے کسی کام کے بارے میں جب پوچھا جاتا تو فرماتے: اگر اللہ تعالیٰ ہمیں نیت دیں تو ہم وہ کام کر لیں گے۔

حضرت یحییٰ بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: عمل میں حسن نیت خود عمل سے بڑھ کر ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بغیر نیت کے بات نہ کرنا۔

بعض یہ کہتے تھے: نیت کے خراب ہونے اور تبدیل ہو جانے کا ڈر خود عمل چھوڑنے سے زیادہ ہونا چاہیے۔

حضرت ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ اعلام الموقعین میں فرماتے ہیں:

حضرت عمرؓ بن الخطاب کا یہ کہنا کہ:

”اگر حق بات میں کسی کی نیت خالص ہو چاہے وہ بات اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو تو اللہ اس کے اور لوگوں کے درمیان معاملہ کے لیے کافی ہو جاتا۔ اور جو شخص ایسی خوبی سے اپنے آپ کو مزین کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس میں نہ پائی جاتی ہو تو اللہ تعالیٰ اسے بدنما کر دیتا ہے۔“

یہ کلام نبوی کے قریب قریب ہے۔ اور ایسا کلام الہام یافتہ شخص ہی کہہ سکتا ہے۔ یہ دونوں باتیں علم کے خزانوں میں سے ہیں۔ جو اس خزانے میں سے خرچ کرے گا دوسرے کو بھی نفع دے گا اور خود بھی انتہائی نفع اٹھائے گا۔

پہلی بات خیر کا منبع اور اصل ہے۔ جبکہ دوسری بات شر کا اصل اور اس کی تفصیل ہے۔ اگر بندے کی نیت خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور اس کا مقصد، اس کا ہم و غم اور عمل اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی خاطر ہو۔ تو اللہ متقین اور محسنین کا مددگار ہے۔ [جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے]

﴿إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ﴾

تقویٰ اور احسان کی بنیاد یہ ہے کہ جب حق کی خاطر کھڑا ہونا ہو نیتیں اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر دیں۔ اور چونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ پر کوئی غالب نہیں اس لیے جس کے ساتھ اللہ ہو جائے تو اس پر کون غالب آ سکتا ہے؟ یا اسے کون نقصان پہنچا سکتا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ ہوں تو وہ بندہ کسی سے کیوں ڈرے؟ اور اگر نہ ہوں تو بندہ آخر کس سے توقع رکھے؟ اور کس پر اعتماد کرے؟ اللہ تعالیٰ کے بعد کون اس کی نصرت کرے گا؟ اگر کوئی شخص کسی دوسرے پر حق قائم کرے، اور اس سے بھی پہلے اپنے آپ پر قائم کرے، اور اس کا یہ کرنا اللہ کی مدد سے اور اللہ کی خاطر ہو، تو اس کے مقابل کوئی چیز نہیں آ سکتی۔ چاہے آسمان، زمین اور پہاڑ اس کے خلاف چال چلیں تو ان کے سامنے اللہ تعالیٰ اس بندہ کے لیے کافی ہو جائیں گے۔ اور ایسے شخص کے لیے خلاصی اور نجات کا راستہ بنا دیں گے۔ بندے کا کام تب خراب ہوتا ہے جب وہ ان تین، دو یا کسی ایک بات میں تفریط اور کوتاہی کرے:

- جو باطل کے لیے کھڑا ہو اس کی نصرت نہیں کی جائے گی۔ اور اگر نصرت ہو بھی جائے تو عارضی ہو گی اور بالآخر اس کا انجام برا ہو گا۔ آخر کار وہ ملامت زدہ اور رسوا ہو گا۔
- اور اگر حق کے لیے کھڑا ہو لیکن اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں بلکہ لوگوں کی ستائش، سپاس اور بدلے میں کچھ حاصل کرنے کے لیے، یا اس کا مقصود پہلے سے ہی کوئی دنیوی غرض ہو اور حق کو محض اس کے حصول کا ذریعہ بنائے، تو اس کے لیے بھی نصرت کی ضمانت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نصرت کی ضمانت اسے دی ہے جو اس کی راہ میں جہاد کرے اور کلمۃ اللہ بلند کرنے کے لیے قتال کرے۔ نہ کہ جو اپنی جان اور خواہشات کی خاطر کھڑا ہو۔ ایسا شخص نہ متقین میں سے ہے نہ محسنین میں سے۔ اگر اسے نصرت کی بھی جائے گی تو فقط جتنا وہ حق کا ساتھ دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ صرف حق کی نصرت کرتے ہیں۔
- اور اگر اقتدار اہل باطل کا ہو تو یہ اقتدار اتنا ہی رہے گا جتنا وہ صبر کریں گے۔ کیونکہ صبر کو بھی ہمیشہ تائید حاصل ہوتی ہے۔ اب اگر صبر کرنے والا حق پر بھی ہو تو اس کی نصرت بھی ہو گی اور انجام کار بھی بھلا ہو گا"۔

کام زیادہ ہو لیکن خراب نیت سے کیا جائے تو یہ کام کرنے والے کو ہلاکتوں میں ڈالتا ہے۔ اللہ رب العزت نے منافقین کے بارے میں بتایا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں، مال خرچ کرتے ہیں، اور لڑتے بھی ہیں، اور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ کتاب اللہ کی تلاوت بھی کرتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

> ومثل المنافق الذي يقرأ القرآن كالريحانة ريحها طيب وطعمها مر.
>
> "ایسے منافق کی مثال جو قرآن پڑھتا ہو اس سیب کی ہے جس کی خوشبو تو اچھی ہے لیکن اس کا ذائقہ کڑوا ہے"۔ (متفق علیہ)

لیکن منافقین کے اخلاص میں کھوٹ کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾

"کچھ شک نہیں کہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے درجے میں ہوں گے۔"

[النساء:145]

اور حدیث میں آیا ہے:

> وأول من تسعر بهم النار يوم القيامة قارئ القرآن والمجاهد والمتصدق بماله، الذين لم تكن أعمالهم خالصة لله، وإنما فعلوا ذلك ليقال فلان قارئ، وفلان شجاع، وفلان متصدق.
>
> "سب سے پہلے جن سے قیامت کے دن آگ دہکائی جائے گی، قرآن کا وہ قاری، وہ مجاہد اور مال خرچ کرنے والا وہ شخص جن کے اعمال اللہ تعالیٰ کے لیے خالص نہ تھے۔ بلکہ انہوں نے اس لیے کیے تاکہ کہا جائے کہ فلاں قاری ہے۔ فلاں شجاع ہے، فلاں سخی ہے۔" (بروایت مسلم)

اس کے برعکس عمل چاہے کم ہو لیکن حسن نیت، سچائی اور اخلاص کے ساتھ کئی گنا ہو جاتا ہے اور جنت کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

> مر رجل بغصن شجرة علي ظهر طريق، فقال: والله لأنحين هذا عن المسلمين لا يؤذيهم، فأدخل الجنة.
>
> "ایک شخص کا گزر راستہ میں درخت کی ایک ٹہنی پر ہوا۔ اس نے کہا: اللہ کی قسم میں اس ٹہنی کو مسلمانوں کے راستہ سے ہٹاؤں گا تاکہ انہیں نقصان نہ دے۔ اس پر وہ جنت میں داخل کیا گیا۔" (بروایت مسلم)

> وامرأة بغي رأت كلبا يطيف بركية كاد يقتله العطش، فسقته بموقها ماء، فغفر الله لها.
>
> "اور ایک زناکار عورت نے ایک کتا دیکھا جو کہ کنویں کے کنارے گھوم رہا ہے اور نزدیک ہے کہ پیاس سے مر جائے۔ اس نے اپنے جوتے سے اس کتے کو پانی پلایا تو اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی۔" (متفق علیہ)

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"کتنے ایسے چھوٹے اعمال ہوتے ہیں جو نیت سے بڑھ جاتے ہیں۔ اور کتنے ایسے بڑے اعمال ہوتے ہیں جو نیت کی وجہ سے گھٹ جاتے ہیں۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾

"اور خدا جس کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔"(سورۃ البقرہ:۲۶۱)

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں:
"یعنی کہ اللہ عمل کو اخلاص کے حساب سے بڑھادے گا۔"

تنبیہ:

امام ابن حجر ہیتمی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب زواجر میں فرماتے ہیں:

"تین سو کے بعد سینتیسواں کبیرہ گناہ: کسی دنیاوی غرض کی وجہ سے امام کی بیعت توڑنا۔"

شیخان نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ثلاثة لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا ينظر إليهم ولا يزكيهم ولهم عذاب أليم: رجل على فضل ماء بالفلاة يمنعه ابن السبيل، ورجل بايع رجلا سلعة بعد العصر فحلف بالله لأخذها بكذا وكذا فصدقه وهو علي غير ذلك. ورجلا بايع إماما لا يبايعه إلا لدنيا، فإن أعطاه منها وفي وإن لم يعطه منها لم يف.

"تین شخص ایسے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ کلام کریں گے، نہ ان کی طرف دیکھیں گے، نہ انہیں پاک کریں گے۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ایک وہ شخص جس کے پاس صحراء میں اضافی پانی ہو اور وہ راہ گزر کو نہ دیتا ہو۔ اور ایک وہ شخص جو عصر کے بعد کوئی چیز قسم کھا کر فروخت کرے کہ میں نے اتنے کی لی یا اتنے کی اور اس پر لینے والا اس کی بات مان لے، لیکن حقیقت اس کے بر خلاف ہو۔ اور ایک وہ شخص جو کسی امام کی بیعت صرف دنیا کی خاطر کرے۔ اگر امام اسے دنیا میں سے دے تو بیعت پر قائم رہے اور اگر نہ دے تو بیعت توڑ ڈالے۔"

نیز امام ابن ابی حاتم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

الكبائر: الإشراك بالله، وقتل النفس، وأكل مال اليتيم، وقذف المحصنة، والفرار من الزحف، والتعرب بعد الهجرة، والسحر، وعقوق الوالدين، وأكل الربا، وفراق الجماعة، ونكث البيعة.

"کبیرہ گناہ یہ ہیں: اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک۔ قتل ناحق۔ مال یتیم کھانا۔ پاک دامن پر تہمت باندھنا۔ پیش قدمی کے وقت لڑائی سے بھاگنا۔ [فرض] ہجرت کے بعد پھر واپس لوٹ جانا [بعض نے اس سے مرتد ہو جانا مراد لیا ہے]۔ جادوگری۔ والدین کی نافرمانی۔ سود کھانا۔ [مسلمانوں کی] جماعت کو چھوڑنا۔ اور بیعت توڑنا۔"

اس مقام پر یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ بیعتیں اور معاہدے جو مسلمان آپس میں کرتے ہیں اور اپنے اوپر لازم کرتے ہیں، چاہے وہ جہاد فی سبیل اللہ پر عہد ہو، یا علم نافع حاصل کرنے پر، یا کسی خاص کام ادا کرنے کے لیے کسی جماعت کے ساتھ حق پر عہد ہو، میں کہتا ہوں: کسی بھی حالت میں ایسے معاہدوں اور بیعتوں کو باندھنے کے بعد توڑنا جائز نہیں۔ الا یہ کہ کوئی شرعی وجہ ہو جس سے عہد اور بیعت توڑنا ضروری ہو جائے۔ اس کے سوا جو بھی عہد توڑتا ہے وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس سے ایک بڑا جرم سرزد ہوتا ہے۔ وہ اللہ رب العزت کی مقرر کردہ حدوں کو پار کرتا ہے جس کے سبب وہ اللہ کی ناراضگی کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا﴾

"اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی۔"

[الاسراء:34]

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"مراد وہ عہد ہیں جو تم لوگوں کے ساتھ کرتے ہو۔ اور وہ عقد ہیں جن پر تم ان کے ساتھ معاملات کرتے ہو۔ عہد اور عقد کے بارے میں طرفین سے ضرور پوچھا جائے گا۔ (عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہوگی)۔"

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا﴾

"اور جب خدا سے عہد واثق کرو تو اس کو پورا کرو اور جب پکی قسمیں کھاؤ تو اُن کو مت توڑو کہ تم خدا کو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہو۔"(سورۃ النحل:۹۱)

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا:

"(خدا سے عہد) لفظ عام ہے جس میں ہر وہ چیز شامل ہے جس پر زبان سے عقد کیا جائے اور انسان اپنے اوپر لازم کر دے۔ چاہے بیع ہو، یا قرابت داری ہو، یا دین کے موافق کسی بات پر اتفاق ہو۔"

(پس جس کی گردن میں بیعت یا عہد ہے، یا اس نے اپنے آپ کو کسی میثاق کا پابند کیا ہے تو اسے چاہیے کہ جس چیز کا اس نے خود اقرار کیا ہے اس کے بارے میں اللہ سے ڈرے۔ اور کوئی بھی عقد کرنے کے بعد اسے نہ توڑے جب تک معتبر شرعی ضرورت نہ ہو۔

(باقی صفحہ نمبر 32 پر)

سیرتِ محمدی ﷺ کی عملی عزیمت

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ

توکل واعتماد کی روشن مثال

اللہ پر اعتماد، توکل اور بھروسے کی شان دیکھنا ہو تو محمد رسول اللہ ﷺ میں دیکھو۔ حکم تھا ...فاصبر كما صبر اولوا العزم من الرسل...'جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر و استقلال دکھایا، تو بھی دکھا' آپ ﷺ نے وہی کر دکھایا۔ آپ ﷺ ایک ایسی جاہل اور اَن پڑھ قوم میں پیدا ہوئے تھے جو اپنے معتقدات کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی تھی اور اس کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی تھی، مگر آپ ﷺ نے اس کی کبھی پروانہ کی، عین حرم میں جا کر توحید کی آواز بلند کرتے تھے اور وہاں سب کے سامنے نماز ادا کرتے تھے۔ حرم محترم کا صحن قریش کے رئیسوں کی نشست گاہ تھا، آپ ﷺ ان کے سامنے کھڑے ہو کر رکوع و سجود کرتے تھے، جب آیت ...فاصدع بما تؤمر...(اے محمد ﷺ! جو تم کو حکم دیا جاتا ہے، اس کو علی الاعلان سنا دو) نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر تمام قریش کو پکارا اور اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچایا۔

قریش نے آپ ﷺ کے ساتھ کیا کیا نہ کیا، کس کس طرح کی اذیتیں نہیں پہنچائیں، جسم مبارک پر صحن حرم کے اندر نجاست ڈالی، گلے میں چادر ڈال کر پھانسی دینے کی کوشش کی، راستہ میں کانٹے بچھائے، مگر آپ ﷺ کے قدم کو راہِ حق سے لغزش ہونی تھی نہ ہوئی۔ ابو طالب نے جب حمایت سے ہاتھ اٹھالینے کا اشارہ کیا تو آپ ﷺ نے کس جوش اور ولولہ سے فرمایا کہ ''چچا جان! اگر قریش میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب بھی رکھ دیں، تب بھی میں اس فرض سے باز نہ آؤں گا''۔ آخر آپ ﷺ کو مع بنی ہاشم کے پہاڑی درّے میں تین سال تک گویا قید رکھا گیا، آپ ﷺ کا اور آپ کے خاندان کا مقاطعہ کیا گیا۔ اندر غلّہ جانے کی روک تھام کی گئی، بچے بھوک سے بلبلاتے تھے، جوان درخت کے پتے کھا کھا کر زندگی بسر کرتے تھے۔ آخر آپ ﷺ کے قتل کی سازش ہوئی، یہ سب کچھ ہوا مگر صبر و استقلال کا سرشتہ آپ ﷺ کے ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ ہجرت کے وقت غارِ ثور میں پناہ لیتے ہیں، کفار آپ ﷺ کا پیچھا کرتے ہوئے غار کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں، بے یار و مددگار نہتے محمد ﷺ اور مسلح قریش کے درمیان چند گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے، ابو بکرؓ گھبرا کر اٹھتے ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم دو ہی ہیں، لیکن ایک تسکین سے بھری ہوئی آواز آتی ہے، ابو بکر! ہم دو نہیں تین ہیں، لا تحزن إن الله معنا... گھبراؤ نہیں ہمارا اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اسی ہجرت کے زمانہ میں اثنائے راہ میں آنحضرت ﷺ کی گرفتاری کے لیے سراقہ بن جعشم نیزہ ہاتھ میں لیے گھوڑا دوڑاتا ہوا آپ ﷺ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کہتے ہیں؛ رسول اللہ ﷺ! ہم پکڑ لیے گئے، مگر وہاں محمد رسول اللہ ﷺ کے لب بدستور قرآن خوانی میں مصروف ہیں اور دل کی سکینت کا وہی عالم ہے۔

مدینہ پہنچ کر یہود کا، منافقین کا اور قریش کے غارت گروں کا ڈر تھا، لوگ آنحضرت ﷺ کے مسکن کا راتوں کو پہرہ دیتے تھے، کہ ایک دفعہ یہ آیت نازل ہوئی ...والله يعصمك من الناس...یعنی اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔ اس وقت خیمہ سے سر باہر نکال کر پہرے کے سپاہیوں سے فرمایا؛ لوگو! واپس جاؤ، مجھے چھوڑ دو کہ میری حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے لے لی ہے۔

غزوۂ نجد سے واپسی میں آپ ﷺ ایک درخت کے نیچے آرام فرماتے ہیں، صحابہؓ اِدھر اُدھر ہٹ گئے، ایک بدو تلوار کھینچ کر سامنے آتا ہے، آپ ﷺ بیدار ہوتے ہیں، موقع کی نزاکت دیکھو۔ بدو پوچھتا ہے؛ بتاؤ اے محمد ﷺ! اب کون تم کو میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے۔ اطمینان اور تسکین سے بھری ہوئی آواز آتی ہے کہ ''اللہ''۔ اس پُر اثر جواب سے دشمن متاثر ہو جاتا ہے اور تلوار نیام میں پہنچ جاتی ہے۔

بدر کا معرکہ ہے، تین سو نہتے مسلمان ایک ہزار لوہے میں غرق قریشی لشکر سے نبرد آزما ہیں۔ مگر ان تین سو سپاہیوں کا سپہ سالار خود کہاں ہے؟ معرکۂ کارزار سے الگ اللہ کی بارگاہ میں دست بدعا ہے۔ کبھی پیشانی زمین پر ہوتی ہے اور کبھی ہاتھ آسمان کی جانب اٹھتے ہیں کہ ''اے اللہ! اگر آج یہ چھوٹی سے جماعت صفحۂ عالم سے مٹ گئی تو پھر کوئی تیرا پرستار اس دنیا میں باقی نہ رہے گا''۔

ایسے مواقع بھی آئے کہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پیچھے ہٹ گئے مگر اللہ کی نصرت اور مدد پر اعتماد کامل اور پورا بھروسہ رکھنے والا، پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہا۔ اُحد میں اکثر مسلمانوں نے قدم پیچھے ہٹا لیے، مگر محمد رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ پر تھے، پتھر کھائے، تیروں، تلواروں اور نیزوں کے حملے ہو رہے تھے، خود کی کڑیاں رخسار مبارک میں دھنس گئی تھیں، دندان مبارک شہید ہو چکا تھا، چہرۂ اقدس زخمی ہو رہا تھا، مگر اس وقت بھی اپنا ہاتھ لوہے کی تلوار پر نہیں رکھا، بلکہ اللہ ہی کی نصرت پر بھروسہ اور اعتماد رہا، کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری کا پورا یقین تھا۔ حنین کے میدان میں ایک دفعہ دس ہزار تیروں کا جب مینہ برسا تو تھوڑی دیر کے لیے مسلمان پیچھے ہٹ گئے، مگر ذاتِ اقدس ﷺ اپنی جگہ پر تھی، ادھر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی اور ادھر سے ''أنا النبي لا كذب، أنا ابن عبدالمطلب'' (میں پیغمبر ہوں

جھوٹ نہیں، میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں) کا نعرہ بلند تھا، سواری سے نیچے اتر آئے اور فرمایا: "میں اللہ کا بندہ اور پیغمبر ہوں" اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

عزیزو! تم کو کسی اور ایسے سپہ سالار کا حال بھی معلوم ہے جس کی بہادری اور استقلال کا یہ عالم ہو کہ فوج کتنی ہی کم ہو، کتنی غیر مسلح ہو، وہ اس کو چھوڑ کر پیچھے بھی کیوں نہ ہٹ گئی ہو، مگر وہ نہ تو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتا ہے اور نہ اپنی حفاظت کے لیے تلوار اٹھاتا ہے، بلکہ ہر حال میں زمین کی طاقتوں سے غیر مسلح ہو کر آسمان کی طاقتوں سے مسلح ہونے کی درخواست کرتا ہے۔

یہ تھی اس راہ میں آپ ﷺ کی مثال۔

مخالفین اور دشمن سے برتاؤ

تم نے دشمنوں کو پیار کرنے کا وعظ سنا ہو گا لیکن اس کی عملی مثال نہیں دیکھی ہو گی، آؤ مدینہ کی سرکار میں میں تم کو دکھاؤں۔ مکہ کے حالات چھوڑتا ہوں کہ میرے نزدیک محکومی، بے کسی اور معذوری، عفو و درگزر اور رحم کے ہم معنی نہیں ہیں۔ ہجرت کے وقت قریش کے رئیس یہ اشتہار دیتے ہیں کہ جو محمد ﷺ کا سر قلم کر کے لائے گا، اس کو سو اونٹ انعام میں دیے جائیں گے۔ سراقہ بن جعشم اس انعام کی لالچ میں مسلح ہو کر آپ ﷺ کے تعاقب میں گھوڑا ڈالتا ہے، قریب پہنچ جاتا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ گھبرا جاتے ہیں۔ حضور ﷺ دعا کرتے ہیں، تین دفعہ گھوڑے کے پاؤں دھنس جاتے ہیں، سراقہ تیر کے پانسے نکال کر فال دیکھتا ہے، ہر دفعہ جواب آتا ہے کہ ان کا پیچھا نہ کرو، یعنی سائیکولاجیکل حیثیت سے سراقہ مرعوب ہو چکتا ہے، واپسی کا عزم کر لیتا ہے، حضور ﷺ کو آواز دیتا ہے اور خطِ امان کی درخواست کرتا ہے کہ جب حضور ﷺ کو خدا قریش پر غالب کرے تو مجھ سے باز پرس نہ ہو۔ آپ ﷺ یہ امان نامہ لکھوا کر اس کے حوالے کرتے ہیں، فتح مکہ کے بعد وہ اسلام لاتا ہے، تاہم آپ ﷺ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ سراقہ تمہارے اس دن کے جرم کی اب کیا سزا ہو؟

ابو سفیان کون ہے؟ وہ جو بدر، احد، خندق وغیرہ میں لڑائیوں کا سرغنہ تھا۔ جس نے کتنے مسلمانوں کو تہہ تیغ کرایا، جس نے کتنی دفعہ خود حضور سرور عالم ﷺ کے قتل کا فیصلہ کیا، جو ہر قدم پر اسلام کا سخت ترین دشمن ثابت ہوا۔ لیکن فتح مکہ سے پہلے جب حضرت عباسؓ کے ساتھ آپ ﷺ کے سامنے آتا ہے تو لوگو! اس کا ہر جرم اس کے قتل کے مشورہ دیتا ہے مگر رحمت عالم ﷺ کا عفوِ عام ابو سفیان سے کہتا ہے کہ ڈر کا مقام نہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ انتقام کے جذبہ سے بالاتر ہیں، پھر حضور ﷺ نہ صرف اس کو معاف فرماتے ہیں بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں،..."من دخل دار ابی سفیان كان امنا" (جو ابو سفیان کے گھر میں پناہ لے گا اس کو بھی امن ہے)۔

ہند، ابو سفیان کی بیوی، وہ ہند جو اُحد میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گا گا کر قریش کے سپاہیوں کا دل بڑھاتی ہے، وہ جو حضور ﷺ کے سب سے محبوب چچا اور اسلام کے ہیرو حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ بے ادبی کرتی ہے، ان کے سینہ کو چاک کرتی ہے، ان کے کان ناک کاٹ کر ہار بناتی ہے، کلیجہ کو نکال کر چبانا چاہتی ہے، لڑائی کے بعد اس منظر دیکھ کر آپ ﷺ بیتاب ہو جاتے ہیں۔ وہ فتح مکہ کے دن نقاب پوش سامنے آتی ہے اور یہاں بھی گستاخی سے باز نہیں آتی، لیکن حضور ﷺ پھر بھی کچھ تعرض نہیں فرماتے اور یہ بھی نہیں پوچھتے کہ تم نے یہ کیوں کیا۔ عفوِ عام کی اس معجزانہ مثال کو دیکھ کر وہ پکار اٹھتی ہے "اے محمد ﷺ! آج سے پہلے تمہارے خیمہ سے زیادہ کسی خیمہ سے مجھے نفرت نہ تھی لیکن آج تمہارے خیمہ سے زیادہ کسی کا خیمہ مجھے محبوب نہیں ہے"۔

وحشی، حضرت حمزہؓ کا قاتل، فتح طائف کے بعد بھاگ کر کہیں چلا جاتا ہے اور جب وہ مقام بھی فتح ہو جاتا ہے تو کوئی دوسری جائے پناہ نہیں ملتی۔ لوگ کہتے ہیں "وحشی! تم نے ابھی محمد ﷺ کو پہچانا نہیں، تمہارے لیے خود محمد ﷺ کے آستانہ سے بڑھ کر کوئی دوسری جائے امن نہیں ہے"۔ وحشی حاضر ہو جاتا ہے، حضور ﷺ دیکھتے ہیں، آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں، پیارے چچا کی شہادت کا منظر سامنے آجاتا ہے، آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، قاتل سامنے موجود ہے مگر صرف یہ ارشاد ہوتا ہے؛ "وحشی! جاؤ، میرے سامنے نہ آیا کرو، کہ شہید چچا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے"۔

عکرمہؓ اسلام، مسلمانوں اور خود محمد رسول اللہ ﷺ کے سب سے بڑے دشمن یعنی ابو جہل کے بیٹے تھے، جس نے آپ ﷺ کو سب سے زیادہ تکلیفیں پہنچائیں، وہ خود بھی اسلام کے خلاف لڑائیاں لڑ چکے تھے، مگر جب مکہ فتح ہوا تو ان کو اپنے اور اپنے خاندان کے تمام جرائم یاد تھے، وہ بھاگ کر یمن چلے گئے، ان کی بیوی مسلمان ہو چکی تھیں اور محمد رسول اللہ ﷺ کو پہچان چکی تھیں۔ وہ خود یمن گئیں، عکرمہؓ کو تسکین دی اور ان کو لے کر مدینہ آئیں۔ حضور ﷺ کو ان کی آمد کی خبر ہوتی ہے تو ان کے خیر مقدم کے لیے تیزی سے اٹھتے ہیں کہ جسم مبارک پر چادر تک نہیں رہتی، پھر جوشِ مسرت میں فرماتے ہیں، "مرحبا باالراکب المہاجر" اے مہاجر سوار تمہارا آنا مبارک ہو۔ غور کرو! یہ مبارک باد کس کو دی جا رہی ہے، یہ خوشی کس کے آنے پر ہے، یہ معافی نامہ کس کو عطا ہو رہا ہے۔ اس کو جس کے باپ نے آپ ﷺ کو مکہ میں سب سے زیادہ تکلیفیں پہنچائیں، جس نے آپ ﷺ کے جسم مبارک پر نجاست ڈلوائی، جس نے بحالتِ نماز آپ ﷺ پر حملہ کرنا چاہا، جس نے آپ ﷺ کے گلے میں چادر ڈال کر آپ ﷺ کو پھانسی دینی چاہی، جس نے دارُ الندوہ میں آپ ﷺ کے قتل کا مشورہ دیا۔ جس نے بدر کا معرکہ برپا کیا اور ہر قسم کی صلح کی تدبیر کو برہم کیا، آج اس کی جسمانی یادگار کی آمد پر یہ مسرت اور شادمانی ہے۔

ہبار بن الاسود وہ شخص ہے جو ایک حیثیت سے حضور ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا قاتل ہے اور کئی شرارتوں کا مرتکب ہو چکا ہے، مکہ کی فتح کے موقع پر اس کا خون ہدر کیا جاتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ بھاگ کر ایران چلا جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر سیدھا دربِ دولت پر حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے ''یارسول اللہ ﷺ! میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا ہوں، لیکن پھر مجھے حضور ﷺ کا رحم و کرم اور عفو و حلم یاد آیا، میں حاضر ہوں، میرے جرائم کی جو اطلاعات آپ کو ملی ہیں وہ درست ہیں۔ اتنا سنتے ہی آپ ﷺ کی رحمت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور دوست دشمن کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔

عمیر بن وہب بدر کے بعد ایک قریش رئیس کی سازش سے اپنی تلوار زہر میں بجھا کر مدینہ آتا ہے اور اس تاک میں رہتا ہے کہ موقع پا کر نعوذ باللہ آپ ﷺ کا کام تمام کر دے، کہ ناگاہ وہ گرفتار ہو جاتا ہے، آپ ﷺ کے پاس لایا جاتا ہے، اس کا گناہ ثابت ہو جاتا ہے، مگر وہ رہا کر دیا جاتا ہے۔

صفوان بن اُمیّہ یعنی وہ رئیس جس نے عمیر کو آپ ﷺ کے قتل کے لیے بھیجا تھا اور جس نے عمیر سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم اس مہم میں مارے گئے تو تمہارے اہل و عیال اور قرضہ کا میں ذمہ دار ہوں۔ فتح مکہ کے بعد وہ ڈر کر جدہ بھاگ جاتا ہے کہ سمندر کا راستہ سے یمن چلا جائے، وہی عمیر خدمتِ نبوی ﷺ میں آکر عرض کرتے ہیں کہ یارسول اللہ ﷺ! صفوان اپنے قبیلہ کا رئیس ڈر کر بھاگ گیا ہے کہ اپنے کو سمندر میں ڈال دے۔ ارشاد ہوتا ہے ''اس کو امان ہے''۔ عمیر دوبارہ گزارش کرتے ہیں کہ اس امان کی کوئی نشانی مرحمت ہو کہ اس کو یقین آئے۔ آپ ﷺ اپنا عمامہ اٹھا کر دے دیتے ہیں۔ عمیر یہ عمامہ لے کر صفوان کے پاس پہنچتے ہیں، صفوان کہتا ہے ''مجھے محمد ﷺ کے پاس جانے میں اپنی جان کا خطرہ ہے''۔ وہ عمیر جو زہر میں تلوار بجھا کر محمد رسول اللہ ﷺ کو مارنے گئے تھے، صفوان سے کہتے ہیں ''اے صفوان! ابھی تم کو محمد رسول اللہ ﷺ کے حلم اور عفو کا حال معلوم نہیں''۔ صفوان آستانۂ نبوی ﷺ پر حاضر ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ سے کہا گیا ہے کہ تم نے مجھے امان دی ہے، کیا یہ سچ ہے؟ لیکن میں تمہارا دین ابھی قبول نہیں کروں گا، مجھے دو مہینے کی مہلت دو۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں ''تمہیں دو نہیں چار مہینے کی مہلت ہے''۔ لیکن یہ مہلت ختم بھی نہ ہونے پائی کہ دفعۃً اس کے دل کی کیفیت بدل جاتی ہے اور وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔

آپ ﷺ خیبر جاتے ہیں، جو یہودی قوت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ لڑائیاں ہوتی ہیں، شہر فتح ہوتا ہے۔ ایک یہودیہ دعوت کرتی ہے، آپ ﷺ بلا پس و پیش منظور فرما لیتے ہیں، یہودیہ جو گوشت پیش کرتی ہے اس میں زہر ملا ہوتا ہے، آپ ﷺ گوشت کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کو اطلاع ہو جاتی ہے، یہودیہ بلائی جاتی ہے، وہ اپنے قصور کا اعتراف کرتی ہے لیکن رحمتِ عالم ﷺ کے دربار سے اس کو کوئی سزا نہیں ملتی حالانکہ اس زہر کا اثر آپ ﷺ کو عمر بھر محسوس ہوتا رہا۔

غزوۂ نجد سے واپسی کے وقت آپ ﷺ تنہا ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے ہیں، دوپہر کا وقت ہے، آپ ﷺ کی تلوار درخت سے لٹک رہی ہے، صحابہؓ اِدھر اُدھر درختوں کے سائے میں لیٹے ہیں، کوئی پاس نہیں ہے، ایک بدو تاک میں رہتا ہے، وہ اس وقت سیدھا آپ ﷺ کے پاس آتا ہے، درخت سے آپ ﷺ کی تلوار اتارتا ہے، پھر نیام سے باہر کھینچتا ہے، کہ آپ ﷺ کی آنکھ کھل جاتی ہے، وہ تلوار ہلا کر پوچھتا ہے کہ ''محمد! بتاؤ اب کون تم کو مجھ سے بچا سکتا ہے''۔ ایک پُراطمینان صدا آتی ہے، ''اللہ''۔ اس غیر متوقع جواب کو سن کر وہ مرعوب ہو جاتا ہے، تلوار نیام میں کر لیتا ہے، صحابہؓ آجاتے ہیں، بدو بیٹھ جاتا ہے، اور آپ ﷺ اس سے کوئی تعرض نہیں فرماتے ہیں۔

ایک دفعہ اور ایک کافر گرفتار ہو کر آتا ہے، کہ یہ قتل کے لیے آپ ﷺ کی گھات میں تھا، وہ سامنے پہنچتا ہے، تو آپ ﷺ کو دیکھ کر ڈر جاتا ہے، آپ ﷺ اسے تسلی دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر تم قتل کرنا چاہتے بھی تب بھی نہیں کر سکتے تھے۔ غزوۂ مکہ میں اسّی آدمیوں کا دستہ گرفتار ہوا جو جبل تنعیم سے اُتر کر آپ ﷺ کو قتل کرنا چاہتا تھا، آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا، ان کو چھوڑ دو۔

دوستو! طائف کو جانتے ہو؟ وہ طائف جس نے مکہ کے عہد ستم میں آپ ﷺ کو پناہ نہیں دی، جس نے آپ ﷺ کی بات بھی سنی نہیں چاہی، جہاں کے رئیس عبدیالیل کے خاندان نے آپ ﷺ سے استہزاء کیا، بازاریوں کو اشارہ کیا کہ وہ آپ ﷺ کی ہنسی اڑائیں، شہر کے اوباش ہر طرف سے ٹوٹ پڑے، اور دو رویہ کھڑے ہو گئے اور جب آپ ﷺ بیچ سے گزرتے تو دونوں طرف سے پتھر برسائے، یہاں تک کہ پائے مبارک زخمی ہو گئے، دونوں جوتیاں خون سے بھر گئیں، جب آپ ﷺ تھک کر بیٹھ جاتے تو یہ شریر آپ ﷺ کا بازو پکڑ کر اٹھا دیتے۔ جب آپ ﷺ چلنے لگتے تو پھر پتھر برساتے، آپ ﷺ کو اس دن اس قدر تکلیف پہنچی کہ نو برس کے بعد حضرت عائشہؓ نے ایک دن دریافت فرمایا کہ ''یارسول اللہ ﷺ تمام عمر میں آپ پر سب سے زیادہ سخت دن کون سا آیا؟''۔ تو آپ ﷺ نے اسی طائف کا حوالہ دیا تھا۔

۸ ہجری میں مسلمانوں کی فوج اسی طائف کا محاصرہ کرتی ہے، ایک مدت تک محاصرہ جاری رہتا ہے، قلعہ نہیں فتح ہوتا، بہت سے مسلمان شہید ہوتے ہیں، آپ ﷺ واپسی کا ارادہ کرتے ہیں، پُرجوش مسلمان نہیں مانتے، طائف پر بددعا کرنے کی درخواست کرتے ہیں، آپ ﷺ ہاتھ اٹھاتے ہیں مگر کیا فرماتے ہیں ''اے اللہ! طائف والوں کو ہدایت دے اور اسلام کے آستانے پر جھکا''۔ دوستو! یہ کس شہر کے حق میں دعائے خیر ہے، وہی شہر جس نے آپ ﷺ پر پتھر برسائے تھے، آپ ﷺ کو زخمی کیا تھا اور آپ ﷺ کو پناہ دینے سے انکار کیا تھا۔

اُحد کے غزوے میں دشمن حملہ کرتے ہیں، مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں، آپ ﷺ نرغۂ اعداء میں ہوتے ہیں، آپ ﷺ پر پتھر، تیر اور تلوار کے وار ہورہے ہیں، دندانِ مبارک شہید ہوتا ہے، خود کی کڑیاں رخسار مبارک میں گڑ جاتی ہیں، چہرہ مبارک خون سے رنگین ہوتا ہے، اس حالت میں آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ آتے ہیں، ''وہ قوم کیسے نجات پائے گی جو اپنے پیغمبر کے قتل کے درپے ہے، اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ جانتی نہیں ہے''۔ یہ ہے 'تو اپنے دشمن کو پیار کر' کے زیتونی وعظ پر عمل! جو صرف شاعرانہ فقرہ نہیں، بلکہ عمل کا خطرناک نمونہ ہے۔

وہی ابن عبد یالیل جس کے خاندان نے طائف میں آپ ﷺ کے ساتھ یہ مظالم کیے تھے، جب طائف کا وفد لے کر مدینہ آتا ہے تو آنحضرت ﷺ اس کو اپنی مقدس مسجد میں خیمہ گاڑ کر اتارتے ہیں، ہر روز نماز عشاء کے بعد اس کی ملاقات کو جاتے ہیں، اور اپنی رنج بھری مکہ کی داستان سناتے ہیں، کس کو؟ اس کو جس نے آپ ﷺ پر پتھر برسائے تھے اور آپ ﷺ کو ذلیل کیا تھا۔ یہ ہے 'تو اپنے دشمن کو پیار کر اور معاف کر'۔

مکہ جب فتح ہوا تو حرم کے صحن میں، کس حرم کے صحن میں؟ جہاں آپ ﷺ کو گالیاں دی گئیں، آپ ﷺ پر نجاستیں پھینکی گئیں، آپ ﷺ کے قتل کی تجویز منظور ہوئی، قریش کے تمام سردار مفتوحانہ کھڑے تھے، ان میں وہ بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے تھے، وہ بھی تھے جو آپ ﷺ کو جھٹلایا کرتے تھے، وہ بھی تھے جو آپ ﷺ کی ہجویں کہا کرتے تھے، وہ بھی تھے جو آپ ﷺ کو گالیاں دیا کرتے تھے، وہ بھی تھے جو خود اس پیکر قدسی ﷺ کے ساتھ گستاخیوں کا حوصلہ رکھتے تھے، وہ بھی تھے جنھوں نے آپ ﷺ پر پتھر پھینکے تھے، آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے تھے، آپ ﷺ پر تلواریں چلائی تھیں، وہ بھی تھے جنھوں نے آپ ﷺ کے عزیزوں کا خون ناحق کیا تھا، ان کے سینے چاک کیے تھے اور ان کے دل و جگر کے ٹکڑے کیے تھے، وہ بھی تھے جو غریب اور بے کس مسلمانوں کو ستاتے تھے، ان کے سینوں پر اپنی جفاکاری کی آتشیں مہریں لگاتے تھے، ان کو جلتی ریتوں پر لٹاتے تھے، دہکتے کوئلوں سے ان کے جسم کو داغتے تھے، نیزوں کی انی سے ان کے بدن کو چھیدتے تھے۔ آج یہ سب مجرم سرنگوں سامنے تھے، پیچھے دس ہزار خون آشام تلواریں محمد رسول اللہ ﷺ کے ایک اشارہ کی منتظر تھیں، دفعتاً زبان مبارک کھلتی ہے، سوال ہوتا ہے ''قریش بتاؤ، میں آج تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟''۔ جواب ملتا ہے ''محمد! تو ہمارا شریف بھائی اور شریف بھتیجا ہے''۔ ارشاد ہوتا ہے ''آج میں وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے ظالم بھائیوں سے کہا تھا کہ ''لا تثریب علیکم الیوم'' آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں، ''اذھبو فانتم الطلقاء'' جاؤ تم سب آزاد ہو۔

یہ ہے دشمنوں کو پیار کرنا اور معاف کرنا۔ یہ ہے اسلام کے پیغمبر کا عملی نمونہ اور عملی تعلیم۔ جو صرف خوش بیانیوں اور شیریں زبانیوں تک محدود نہیں بلکہ دنیا میں واقعہ اور عمل بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔

یہی نکتہ ہے جس کے باعث تمام دوسرے مذاہب اپنے پیغمبروں اور رہنماؤں کے میٹھے میٹھے الفاظ کی طرف دنیا کو بلاتے ہیں اور بار بار ان ہی کو دہراتے ہیں، ان کے سوا ان کے پاس کوئی چیز نہیں، اور اسلام اپنے پیغمبر ﷺ کے صرف الفاظ نہیں بلکہ عمل اور سنت کی دعوت دیتا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت فرمایا تھا:

ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ و سنتی

''میں تم میں دو مرکز ثقل چھوڑے جاتا ہوں، اللہ کی کتاب اور اپنا عملی راستہ۔''

یہی دونوں مرکزِ ثقل اب تک قائم ہیں اور تا قیامت قائم رہیں گے۔ اسی لیے اسلام کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ اپنے پیغمبر ﷺ کی سنت کی پیروی کی بھی دعوت دیتا ہے۔

﴿لقد کان لکم فی رسول اللہ أسوة حسنة﴾

''لوگو! تمہارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہتر پیروی ہے۔''

پیغمبرِ اسلام مجسمۂ عمل

اسلام خود اپنے پیغمبر کو اپنی کتاب کا عملی مجسمہ، نمونہ اور پیکر بنا کر پیش کرتا ہے، تمام دنیا میں یہ فخر صرف اسلام کے پیغمبر کو حاصل ہے کہ وہ تعلیم اور اصول کے ساتھ ساتھ اپنا عمل اور اپنی مثال پیش کرتا ہے۔ طریقۂ نماز کے ناواقف سے کہتا ہے ''صلوا کما رأیتمونی'' تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتا دیکھتے ہو۔ بیوی بچوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کی تعلیم ان الفاظ میں دیتا ہے، ''خیرکم خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی'' تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے بیوی بچوں کے لیے سب سے اچھا ہے اور میں اپنے بیوی بچوں کے لیے تم سب سے اچھا ہوں۔

آخری حج کا موقع ہے، شمع نبوت کے گرد ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم ہے۔ انسانوں کو اللہ کا آخری پیغام سنایا جارہا ہے۔ سب باطل رسوم اور نہ ختم ہونے والی لڑائیوں کا سلسلہ آج توڑا جارہا ہے مگر تعلیم کے ساتھ ساتھ دیکھو کہ اپنی ذاتی نظیر اور عملی مثال بھی ہر قدم پر پیش کی جارہی ہے۔ فرمایا:

''آج عرب کے تمام انتقامی خون باطل کر دیے گئے یعنی تم سب ایک دوسرے کے قاتلوں کو معاف کر دو! اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون، اپنے بھتیجے ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔''

”جاہلیت کے تمام سودی لین دین اور کاروبار آج باطل کیے جاتے ہیں، اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبد المطلب کا سودی بیوپار توڑتا ہوں۔“

مساوات اور اخوت انسانی

جان اور مال کے بعد تیسری چیز آبرو ہے۔ وہ غلط اور قابل اصلاح رسوم و رواج جن کا تعلق لوگوں کی عزت و آبرو سے ہوتا ہے، ان کو سب سے پہلے عملاً مٹانے کی ہمت گویا بظاہر اپنی بے عزتی اور بے آبروئی کے ہم معنی ہے، اسی لیے ملک کے بڑے بڑے مصلحین کے پاؤں بھی کسی ملکی رسم و رواج کی اصلاح کی جرأت مشکل سے کرتے ہیں۔ محمد ﷺ نے لوگوں کو مساوات کی تعلیم دی۔ عرب میں سب سے زیادہ ذلیل غلام سمجھے جاتے تھے، آپ ﷺ نے مساوات، اخوتِ انسانی اور جنسِ انسانی کی برابری کی یہ عملی مثال پیش کی، ایک غلام کو اپنا فرزند متبنیٰ بنایا۔ عرب میں قبائل کی باہمی شرافت کی زیادتی اور کمی کا اس درجہ لحاظ تھا کہ لڑائی میں بھی اپنے سے کم رتبہ پر تلوار چلانا عار سمجھا جاتا تھا کہ ذلیل خون اس کی شریف تلوار کو ناپاک نہ کر دے۔ لیکن آپ ﷺ نے آج یہ اعلان کیا کہ

> ”اے لوگو! تم سب آدمؑ کے بیٹے ہو، اور آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔ کالے کو گورے پر، گورے کو کالے پر، عجمی کو عربی پر، عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔ تم میں افضل وہ ہے جو اپنے رب کے نزدیک سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔“

تو اس تعلیم نے دفعۃً بلند و پست، بالا و زیر، اعلیٰ و ادنیٰ، آقا و غلام، سب کو ایک سطح پر لا کھڑا کر دیا، لیکن ضرورت تھی عملی مثالوں کی، یہ مثال خود آپ ﷺ نے پیش کی۔ اپنی پھوپھی زاد بہن کو، جو قریش کے شریف خاندان سے تھیں، اپنے غلام سے بیاہا، منہ بولے بیٹے کا قاعدہ جب اسلام میں توڑا گیا تو سب سے پہلے زید بن محمد، زید بن حارثہ کہلائے۔ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح عرب میں ناجائز تھا، مگر چونکہ یہ محض ایک لفظی رشتہ تھا، جس کا واقعیت سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس رسم سے بہت سی خاندانی رقابتوں اور خرابیوں کی بنیاد عربوں میں قائم ہو گئی تھی، اس لیے اس کا توڑنا ضروری تھا، لیکن اس کو توڑنے کے لیے عملی مثال پیش کرنا، انسان کی سب سے عزیز چیز آبرو سے تعلق رکھتا تھا، جو سب سے مشکل کام تھا۔ پیغمبرِ عرب ﷺ نے آگے بڑھ کر خود اس کی مثال پیش کی اور زید بن حارثہؓ کی مطلقہ بیوی حضرت زینبؓ سے شادی کر لی۔ جب ہی سے یہ رسم عرب سے ہمیشہ کے لیے مٹ گئی اور متبنیٰ کی بیہودہ رسم سے ملک نے نجات پائی۔ واقعات کی انتہا نہیں ہے، مثالوں کی کمی نہیں ہے، مگر وقت محدود ہے اور آج شاید میں نے سب سے زیادہ آپ کا وقت لیا ہے۔

دعوتِ فکر

میرے دوستو! میرے معروضات کی روشنی میں آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک اور شام سے لے کر ہندوستان تک، ہر ایک تاریخی انسان کی مصلحانہ زندگی پر ایک نظر ڈالو، کیا ایسی عملی ہدایتوں اور کامل مثالوں کا نمونہ کہیں نظر آتا ہے؟

حاضرین! چند لفظ اور! بعض شیریں بیان واعظ شاعرانہ پیرائے میں اپنے اللہ تعالیٰ کی ربانی محبت اور الٰہی عشق کا تذکرہ کرتے ہیں مگر انہی کے مقولہ کے مطابق کہ ’درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے‘......اس پاک عشق و محبت کا کیا اثر ان کی زندگی میں نمایاں تھا، عرب کے دعویدار محبت کی سیرت پڑھو، راتیں گزرتی ہیں، دنیا سوتی ہے اور اس کی آنکھیں جاگتی ہیں، ہاتھ اللہ کے آگے پھیلے ہیں، زبان ترانۂ حمد گا رہی ہے، دل پہلو میں بیتاب تڑپ رہا ہے اور آنکھوں سے آنسوؤں کی تار جاری ہے...... کیا محبت کی یہ تصویر ہے یا وہ ہے؟

حضرت عیسیٰؑ سولی پر چڑھتے ہیں تو بیتابانہ زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

ایلی ایلی لما سبقتی

”اے میرے اللہ! اے میرے اللہ! تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا؟“

لیکن محمد رسول اللہ ﷺ جب موت کے بستر پر ہوتے ہیں اور زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہیں تو زبان پر یہ کلمہ ہوتا ہے:

اللھم الرفیق الاعلیٰ

”اے میرے اللہ! اے میرے بہترین ساتھی!“

ان دونوں فقروں میں سے کس میں محبت کا ذائقہ، عشق کی چاشنی اور ربانی سکینت کا لطف ہے۔

اللھم صلی علیه و علی سائرا الانبیاء والمرسلین

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

وضاحت: مجلہ ’نوائے غزوۂ ہند‘ کے سابقہ شمارے (اکتوبر ۲۰۲۱ء) میں شائع ہونے والے مضمونِ بالا کے پہلے حصے میں حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام خطاءً ’سلیمان‘ کے بجائے ’سلمان‘ شائع ہو گیا تھا، ہم قارئین و جملہ متعلقین سے اس غلطی پر معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

☆☆☆☆☆

سانحۂ بابری مسجد: کوئی ہے جو اس سے عبرت حاصل کرے؟!

ابو انور الہندی

تین دہائیاں قبل بابری مسجد شہید کر دی گئی۔ حقیقتاً یہ واقعہ برِّ صغیر کی سیاست کے ایک نئے دور میں داخل ہونے کا نقطۂ آغاز تھا۔ تقریباً ساڑھے چار سو سالہ تاریخی مسجد کو دن دہاڑے ڈھایا گیا اور ہندوو ادی کے منصوبے کو دوبارہ شروع کرنے کا اعلان کیا گیا۔ بابری مسجد کے سانحۂ شہادت کے بعد ہندوؤں نے اپنی مہلک طاقت میں اضافہ کیا اور مذہبی عقیدت اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے منصوبے کو آگے بڑھایا۔ اس منصوبے کا مقصد برِّ صغیر کے سب نظاموں خصوصاً اسلام کو زیر کر کے رام راج سے بدلنا، مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا، جلاوطن کرنا یا مکمل طور پر کچل دینا ہے۔

آج ہندو کونسل کے رہنما متھورا کی شاہی عید گاہ مسجد میں کرشنا کی مورتی رکھنے کی دھمکی دے رہے ہیں اور اس اعلان سے بابری مسجد کا واقعہ ایک بار پھر تازہ ہونے جا رہا ہے۔ اسی ہندو کونسل کے لوگ ۱۹۴۹ء میں رات کے اندھیرے میں بابری مسجد کے اندر گھس کر کرشنا کی مورتی رکھ آئے تھے۔ یہ وہ مکروہ و خطرناک فعل تھا جس سے دراصل بابری مسجد کی تباہی کا عمل شروع ہوا اور ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو یہ عمل اپنی تکمیل کو پہنچا۔ لیکن غور کیجیے کہ ۱۹۴۹ء میں جو اندھیرے میں کیا گیا تھا وہ ۲۰۲۱ء میں دن دہاڑے کرنے کو کہا جا رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صورتِ حال کس قدر سنگین ہو چکی ہے!

افسوسناک بات یہ ہے کہ مسلمانانِ برِّصغیر اور کثیر مسلم سیاسی قیادت آج بھی اس حقیقت کو سمجھ نہیں سکی۔ لیکن کبوتر کے آنکھیں موند لینے سے خطرہ ٹل نہیں جاتا، دشمن اب بھی اپنا کام کر رہا ہے اور ہم اب بھی بے خبر ہیں۔

اس تحریر میں ہم کوشش کریں گے کہ بابری مسجد کی شہادت کے پیچھے اصل عوامل کی نشان دہی کریں، دشمن کی منصوبہ بندی پر نظر ڈالیں اور مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں کچھ گفتگو کریں۔

ہندوو ادی

بھارت کی ہندوو ادی طاقت نے بابری مسجد کو توڑ کر رام مندر کو تعمیر کرنے کے منصوبے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ ہندوؤں نے سب سے پہلے بابری مسجد کی بنیادوں میں ایک خیالی پوجا پاٹ کی جگہ 'رام مندر' کا شور اٹھایا۔ ۱۹۴۹ء میں مسجد میں ہندوؤں نے رام کی مورتی رکھی۔ ان کے اس اقدام سے 'رامائی لنکا تحریک' تیار کی گئی، رتھ یاترا شروع ہوئی، اور ۱۹۹۲ء میں مسجد شہید کر دی گئی۔

ہندوو اد ایک نظریاتی تحریک ہے۔ اس کی مثال اسرائیل کے صہیونیوں کی سی ہے۔ آر ایس ایس کے ہندوؤں نے کھلم کھلا اسرائیل کے طرزِ عمل کی تقلید کی۔

اس نظریاتی تحریک کا احاطہ ایک بڑا کام ہے۔ ہم اکثر بی جے پی یا آر ایس ایس کے بارے میں بات کرتے ہیں لیکن ہندوو ادی منصوبے کے مختلف شعبے اور مختلف ذیلی حصّے ہیں۔ ان میں سے دو اہم حصے 'اکھیل ہندوستانی ہندو مہاسبھا' اور 'ریاستی خود مختار سنگھ' (آر ایس ایس) ہیں۔

ہندو مہاسبھا ۱۹۱۵ء میں قائم کیا گیا تھا۔ Binayak Damodar Savarkar سمیت کچھ دوسرے ہندو رہنما اس کے بانی تھے۔ دس سال بعد ۱۹۲۵ء میں آر ایس ایس قائم کی گئی۔ ابتدائی طور پر ہندو مہاسبھا ہندوو ادی سیاست کی اہم تنظیم تھی۔ نظریات اور طریقۂ کار کے اعتبار سے ہندو مہاسبھا نسبتاً زیادہ شدت پسند ہے۔ گاندھی اسی تنظیم کی سازش کے سبب قتل ہوا۔ اور اسی ہندو مہاسبھا کے منصوبے کے مطابق بابری مسجد میں رام کی مورتی رکھی گئی۔

لیکن آہستہ آہستہ، اثر و رسوخ کے لحاظ سے آر ایس ایس ہندو مہاسبھا سے آگے نکل گئی۔ اس وقت، آر ایس ایس ایک بہت بڑا ہندو نیٹ ورک ہے۔ جس کی تقریباً ستاون (۵۷) ہزار شاخیں اور ساٹھ (۶۰) لاکھ ارکان ہیں۔ اس کے علاوہ آر ایس ایس کے پریوار کے حصے کے طور پر، ورلڈ ہندو کونسل، بجرنگ ٹیم سمیت مختلف تنظیمیں ہیں۔ بھارت کی موجودہ حکمرانی پارٹی بی جے پی بھی آر ایس ایس کے ساتھ منسلک ہے، اگرچہ وہ باقاعدہ ایک علیحدہ تنظیم بھی ہے۔ بھارتی سیاست میں بی جے پی کو ہندوو ادی پراجیکٹ کی خاص حمایت و توجہ حاصل ہے اور یہی بی جے پی کی سیاسی ترقی کے پیچھے ایک اہم عنصر ہے اور یہ سب ہندُتوا ایجنڈے کا حصہ ہے۔

ہندو مہاسبھا کے بانیوں میں ایک مغربی بنگال کا شیاما پرشاد مکھرجی اہم فرد تھا۔ ۱۹۴۷ء میں نہرو نے اسے وزیر بنا دیا، لیکن مسلمانوں کے بارے میں کانگریس کی 'نرم' پالیسی کے سبب اس نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور پھر ۱۹۵۱ء میں 'بھارتیا جانا سنگھ' کے نام کی ایک نئی پارٹی تشکیل دی۔ لیکن یہ نئی پارٹی بھارتی سیاست میں ایک مضبوط جماعت کے طور پر نہ ابھر سکی اور پھر ہندتوائی نظریے والی آر ایس ایس کے ذریعے بھارتیا جنتا پارٹی یعنی بی جے پی کا بطور ایک مضبوط سیاسی پارٹی جنم ہوا۔

دراصل ۱۹۷۷ء میں بھارتیا جانا سنگھ ٹوٹی اور اس سے ایک نئی پارٹی تیار ہوئی۔ ۱۹۸۰ء میں یہ پارٹی بھی ٹوٹ گئی۔ اس وقت بھارتیا جنتا پارٹی یا بی جے پی کی تشکیل ہوئی۔ ۱۹۸۴ء کے انتخابات میں بی جے پی نے صرف دو نشستیں حاصل کیں۔ لیکن ۱۹۹۱ء میں اسی پارٹی نے ایک سو بیس (۱۲۰) نشستیں حاصل کیں۔ محض سات (۷) سال میں دو (۲) سے ایک سو بیس (۱۲۰)! اس

حیرت انگیز ترقی کے پیچھے اہم سبب 'رامانی لنکا تحریک' اور 'رتھ یاترا پروگرام' تھا۔ ان دو پروگراموں کے ذریعہ، بی جے پی ہندوستانی سیاست کے بیرونی دائرے سے دو مرکزی دھاروں میں سے ایک دھارا بن گئی۔ یوں بھارت میں ہندووادی سیاست کے عروج کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ بابری مسجد کو شہید کرنے کے لیے یہ دو پروگرام براہ راست ہندووادی منصوبہ بندی سے متعلق تھے۔

تاہم بی جے پی اور آر ایس ایس کے کھلم کھلا منظرِ عام پر ہونے کے باوجود ہندو مہاسبھا اور دیگر نسبتاً چھوٹی ہندووادی تنظیموں کا کردار بھی ہندووادی منصوبے کے لیے بہت اہم ہے اور یہ بات بابری مسجد کے واقعے سے واضح ہوتی ہے۔

۱۹۴۹ء میں مسجد میں مورتی رکھنے کا کام ہندو مہاسبھا کے ذریعے شروع ہوا۔ ۱۹۸۳ء میں 'رامانی لنکا تحریک' کو بھارتیا جانا سنگھ کے سب سے شدت پسند ارکان کے ایک گروپ ورلڈ ہندو پرشاد نے شروع کیا۔ 'ورلڈ ہندو پرشاد' کی شروع کی ہوئی 'رامانی لنکا تحریک' کو بی جے پی موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قومی سطح پر لے آئی۔ بی جے پی کے لال کرشنا ایڈوانی نے ہندوؤں کی شکست کی علامت کے طور پر بابری مسجد کو پیش کیا۔ اور ہندوؤں کی اس شکست کے کفارے کے طور پر بابری مسجد کو توڑ کر رام مندر کی تعمیر کے خیال پر زور دیا۔

شروع سے ہندوؤں کا بنیادی تصور یہ رہا ہے کہ ہندوستان کی ریاست صرف ہندوؤں کی ہے۔ ہندوؤں کے علاوہ دوسروں کو ایک چھوٹی سی تعداد میں رکھا جا سکتا ہے، لیکن انہیں ایک دوسرے درجے کے شہری کے طور پر رہنا ہو گا۔ لہٰذا ہندووادی یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا حق نہیں ہے، اور اگر انہیں رہنا ہے، تو انہیں ایک دوسرے درجے کے شہری کے طور پر رہنا ہو گا۔

بی جے پی اس وقت جو بھی قوانین بنا رہی ہے یا کارروائیاں کر رہی ہے وہ ہندووادی کی سیاست کا حصہ ہیں۔

مثال کے طور پر، شیاما پرشاد کی جانا سنگھ نے ۱۹۵۳ء میں جموں و کشمیر کی خود مختاری کو ختم کرنے کے لیے بھارتی آئین کے آرٹیکل 370 کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا۔ ۶۰ء کی دہائی کے آخر میں انہوں نے گائے کے ذبیحے پر پابندی کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے پورے ہندوستان کے لیے یکساں سول کوڈ بنانے کا بھی مطالبہ کیا۔ ان میں سے کچھ تجاویز کو حال ہی میں نافذ کیا جا چکا ہے اور دوسروں کو لاگو کیا جا رہا ہے۔ آرٹیکل 370 کی منسوخی، گائے کے ذبیحے پر زبردستی، یکساں سول کوڈ(uniform civil code)، شہریت ترمیمی بل(NRC)...... یہ سب ہندوستان کو ایک 'ہندو ریاست' بنانے کے منصوبے کا حصہ ہیں۔

ہندُتوا تنظیمیں تقریباً سو سال سے نہایت صبر، استقامت اور حکمت عملی کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ اگرچہ انہوں نے مختلف اوقات میں سیاسی وجوہات کی بنا پر ان مسائل کو چھپایا، لیکن انہوں نے کبھی بھی اصل مقصد کی طرف سے آنکھ نہیں ہٹائی۔ موقع ملتے ہی انہوں نے دوبارہ کام شروع کر دیا۔ اور اس منصوبے کی پہلی اور سب سے بڑی کامیابی بابری مسجد کی تباہی تھی۔

'سیکولر' انڈیا

لیکن بابری مسجد کے انہدام اور رام مندر کے تعمیراتی منصوبے کو صرف ہندتوا تنظیموں کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ اس میں سیکولر کانگریس اور ہندوستانی عدالت کا بھی کردار ہے۔ یہ کانگریس کی حکومت تھی جس نے مسجد کے اندر رام مورتی رکھنے کے ساتھ 'وشو ہندو سبھا' اور 'آر ایس ایس' کی شمولیت پر پردہ ڈالا۔ کانگریس کا ایک طبقہ بھی پردے کے پیچھے رہتے ہوئے ایسی تنظیموں کو اپنی حمایت دیتا ہے۔ ۱۹۸۶ء میں راجیو گاندھی کے فیصلے پر بابری مسجد کا صحن ہندوؤں کے لیے کھولا گیا تھا۔ بابری مسجد کے انہدام کے وقت کانگریس کا 'نرسنگ راؤ' ہندوستان کا وزیر اعظم تھا۔ وہ ہندتوا نظریے کے فروغ میں معاون کا کردار ادا کرتا رہا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ مسجد کو مسمار کرنے کی تیاریاں جاری ہیں، کانگریس حکومت نے کام کو خاموشی سے آگے بڑھنے دیا۔

اس کے علاوہ ۱۹۴۹ء سے ہندوستانی سیکولر عدالت نے بار بار ہندتوا کا ساتھ دیا۔ عدالتی فیصلوں کے ذریعے ہندتوا کے مطالبات کو نافذ کیا گیا۔ دراصل سیکولر کانگریس اور سیکولر عدالتوں کی مدد کے بغیر آج ہندتوا کا منصوبہ اس مرحلے پر نہیں آسکتا تھا۔

افسوسناک حقیقت

تاریخ سے یہ بات واضح ہے کہ بابری مسجد کو تباہ کر کے رام مندر کی تعمیر کسی ایک فریق کا منصوبہ نہیں ہے۔ ہندوستانی ہندو جماعتوں اور رہنماؤں کا ایک بڑا طبقہ براہ راست اس سے وابستہ ہے۔ باقی سب حامی ہیں۔ لیکن افسوس کہ برِّ صغیر میں مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اس حقیقت کو سمجھنے میں ناکام رہا ہے۔ یہ بھی ایک بہت بڑی ناکامی ہے کہ اس بات کا تصور بھی صحیح سے موجود نہیں ہے کہ یہ ہندتوا اسکیم مسلمانوں کے لیے کتنی خطرناک ہے؟! افسوس کہ روایتی سیاسی جماعتوں سے لے کر اسلامی جماعتوں تک کوئی بھی اس خطرے کو صحیح طور پر شناخت نہیں کر سکا۔

خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اور سیاست میں حصہ لینے والے اہلِ دین کا ایک بڑا حصہ اب بھی گمان کرتا ہے کہ 'سیکولر ہندوستان' مسلمانوں کی حفاظت کرے گا۔ وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ سیکولر ہندوستان کی سیکولر آئینوں، سیکولر عدالتوں، سیکولر اداروں اور سیکولر

فوجوں کے ذریعے مسلمانوں پر بار بار حملوں کی تاریخ موجود ہے۔ سیکولر ہندوستان کشمیر کا گلا گھونٹ کر مسلمانوں کو قتل کر تا رہا ہے۔

دوسری طرف پاکستان میں مسلمان ایک ایسی حکومت اور فوجی جرنیلوں کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کی نصرت کی امید لے کر بیٹھے ہیں جنھوں نے اپنے قیام سے لے کر آج تک صرف مسلمانوں کے مفادات پر ضرب لگائی۔ اور ہندوتوا کی جارحیت اور بھارتی ایجنٹوں کے ظلم و ستم کے باوجود بنگلہ دیش کے مسلمان اب بھی انتخابات اور جمہوریت کے اندر حل نکالنے کا بے فائدہ خواب دیکھ رہے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی سیاسی جماعتوں سے لے کر مذکورہ بالا دینی قائدین تک ہر کوئی دینِ اسلام اور امتِ مسلمہ کی فلاح و کامیابی چاہتا ہے۔ لیکن وہ اب بھی کچھ خاص دائروں کے اندر رہ کر سوچ رہے ہیں جو بہت پہلے سے غیر موثر ثابت ہوئے ہیں۔ برصغیر میں موجودہ حکومتیں اس خطے میں مسلمانوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ موجودہ حکومتیں مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ میں دلچسپی نہیں رکھتیں۔ بلکہ ان کا تعلق حملہ آوروں کے ایک گروہ سے ہے۔ ان حقائق کی محض تردید کر دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ باتیں ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش تمام ممالک کے لیے درست ہیں۔

ستّر سال سے زیادہ عرصے سے جمہوریت، سیکولر آئین، قوم پرست اصولوں اور 'ریاست کے قوانین' پر عمل کے ذریعے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ، ایمان و عزت کے تحفظ، اور اسلامی شریعت کے قیام کا خواب دیکھا گیا ہے۔ نتائج ہمارے سامنے واضح ہیں۔ یہ خواب آج ایک ڈراؤنا خواب بن چکا ہے۔ آخر کب ہم پر اس راستے کا عبث ہونا واضح ہو گا؟

کیا ہمیں لگتا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی خطرہ نہیں ہے؟ جہاں ہندتوا پراجیکٹ کھلے عام موجود ہے اور اس کے مطابق ریاست قائم ہو رہی ہے؟ یا کیا ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ نظام کسی نہ کسی طرح ہماری حفاظت کرے گا؟ ہماری ماؤں اور بہنوں کی حفاظت کرے گا؟ کیا ہم آج بھی سیکولر آئین، عالمی برادری، انسانی حقوق کی تنظیموں یا اقوام متحدہ پر بھروسہ کریں گے؟

کیا بوسنیا یا میانمار میں قتل عام کے دوران مسلمانوں کے تحفظ کے لیے کوئی آگے بڑھا؟ پچھلے دس سالوں سے شام کے اہل سنت کا بے دردی سے قتل، عصمت دری، تشدد، کیمیکل ہتھیار، بیرل بم ہمارے سامنے نہیں؟ کیا ابھی تک کوئی اور ان مسلمانوں کے تحفظ کے لیے آگے آیا ہے؟ مصر میں ایک دن میں چودہ سو (۱۴۰۰) مسلمانوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ کیا کسی نے کچھ کہا؟ ہم ستّر سال سے زیادہ عرصے سے صہیونیوں کے ہاتھوں مارے جا رہے ہیں۔ کیا کسی نے کچھ کیا؟

آئین، اقوام متحدہ، انسانی حقوق کی تنظیمیں، عالمی برادری کیا مسلمانوں کے کام آئی ہیں؟

ہمیں مزید کتنی مثالوں کی ضرورت ہے؟ چین کے خلاف امریکی نئی سرد جنگ (new cold war) میں اس خطے میں بھارت امریکہ کا اہم حلیف ہے۔ بھارت کے اسرائیل کے ساتھ بھی گہرے تعلقات ہیں۔ کشمیر میں بھارتی جارحیت فلسطین میں اسرائیل کی جارحیت کی مقلد ہے۔ بھارت کے روس کے ساتھ بھی تعلقات ہیں۔ اگر عالمی برادری شام جیسے ملک کی حکومت کو نہیں روک سکتی تو ہم کس بنیاد پر توقع کرتے ہیں کہ بھارت کو کوئی روکے گا؟ کس دلیل سے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی ہندتوا کے تباہ کن منصوبے کو روک دے گا؟

آخری بات

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی حفاظت کے لیے کوئی آگے نہیں آئے گا۔ جس طرح اس سے پہلے کوئی نہیں آیا ہے۔ ملک کا کوئی آئین یا عدالت مسلمانوں کی حفاظت نہیں کرے گی۔ جس طرح پہلے بھی کبھی نہیں کی گئی۔ عالمی برادری مسلمانوں کے لیے اسی طرح اب بھی نہیں روئے گی جس طرح وہ پہلے کبھی نہیں روئی۔ کشمیر اور آسام میں جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ ہوا ہے وہ دنیا کے سامنے ہے۔ دنیا نے دیکھا ہے کہ فسادات کے نام پر دہلی میں کیا ہوا۔ لیکن کوئی نہیں آیا، نہ ہی کوئی آئے گا!

ہندتوا پراجیکٹ اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ایک صدی پر محیط تیاریوں کو اب عملی قالب میں ڈھالا جا رہا ہے۔ چھوٹی موجوں نے وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ سونامی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ لہریں اب برِّصغیر کی طرف بڑھ رہی ہیں، خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کی جانب، ان کو بہالے جانے کے لیے۔ یہ سونامی بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کی وطنی سرحدوں کی پابندی نہیں کرے گا۔ اس کا اثر پورے خطے میں پھیل جائے گا۔

موجودہ نظاموں کے اندر ہمارے لیے کوئی حل نہیں ہے۔ ان نظاموں میں صرف ہمارا قتل ہوتا ہے، ہم پر تشدد ہوتا ہے اور ہماری توہین کی جاتی ہے۔ انگریزوں کی آمد سے شروع ہونے والی ذلت اور شکست کا باب ابھی تک جاری ہے۔ اگرچہ انگریز چلے گئے لیکن پیچھے رہ جانے والے نظام نے ہمیں اسی پنجرے میں قید کر رکھا ہے۔

چنانچہ برِّصغیر کے مسلمانوں کو نئے سرے سے سوچنا ہو گا۔ حقیقت کو سمجھنا ہو گا۔ جیسے بچوں کو بہلا وا دیا جاتا ہے اس طرح کی طفل تسلّیوں سے کام نہیں چلے گا۔ کسی بھی حکومت، فوج یا ادارے کی طرف دیکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ مزاحمت پیدا کرنے کے لیے مسلمانوں کو کھڑا ہونا ہو گا۔

اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے، کھوئی ہوئی شان و شوکت اور عزت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے برِّصغیر کے مسلمانوں کے پاس جہاد فی سبیل اللہ کے سوا کوئی متبادل نہیں ہے۔ اور اس جہاد کا مقصد ایمان کی حفاظت اور اسلامی شریعت قائم کرنا ہے نہ کہ کسی ریاست کے مفاد کو پورا

کرنا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو 'سیکولر انڈیا' کے جھوٹے وعدے سے منہ موڑنا ہوگا۔ اپنے دفاع کے لیے انہیں خود تیار ہونا ہوگا۔ پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو سوچنا ہوگا کہ آیا وہ قومی و وطنی سرحدوں کے اندر اپنے ایمان کو قید ہونے دیں گے یا وہ اپنے اعمال کا فیصلہ خدائے عظیم کی شریعت کے مطابق کریں گے؟

ہمارے سامنے ایک مشکل وقت ہمارا منتظر بیٹھا ہے۔ غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے راستے سے زیادہ آسان اسلامی شریعت قائم کرنے کے سفر میں کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ یہ راستہ طویل ہے، خون آلودہ ہے، لیکن دوسرے کسی راستے سے تو یہ منزل حاصل ہو ہی نہیں سکتی! اور اسی راستے پر چل کر سفر کے آخر میں برابری، عزت اور فتح حاصل ہوگی۔ باقی تمام راستے ہمیں رسوائی، ذلت اور تباہی کی طرف لے جائیں گے۔ بابری مسجد نے یہی سبق ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

☆☆☆☆☆

بقیہ: مجاہد جہاد کیوں چھوڑ جاتا ہے؟

شیطان کے وسوسوں اور للچانے سے بچے۔ کیونکہ شیطان ایک شخص کے قریب ہوتا ہے اور دو سے دور۔ چنانچہ کسی لڑائی، جھگڑے یا اختلاف رائے کو عہد توڑنے کا سبب نہ بنائے۔ اور جو اسے حکم دیا جاتا ہے اس معاملے میں اللہ سے ڈرے۔

جو اپنے امیر کی جانب سے ایسی چیز دیکھے جو اسے پسند نہ ہو تو اسے چاہیے کہ صبر کرے اور اس پر اللہ سے اجر کی امید رکھے۔ اللہ تعالیٰ بہترین ثواب دینے والا ہے۔ یہ باتیں اللہ کے دین کی نصرت کے لیے متحد ہونے والی صفوں کو توڑنے کے ہتھیار نہ بن جائیں ایسے زمانے میں جس میں فتنے بڑھ چکے ہیں)۔ (بحوالہ التذاکر الجہاد)

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

بقیہ: بابر مسجد (ایک اجمالی خطِ تاریخ)

بالآخر ۹ نومبر ۲۰۱۹ء کو سپریم کورٹ آف انڈیا نے اس مقدمے کا فیصلہ 'رام مندر' کے حق میں سنا دیا۔ اس فیصلے میں یہ بھی کہا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے شہادتیں ناقص رہیں، فریقین میں سے کوئی بھی اپنا دعویٰ (بابری مسجد یا رام مندر کا) ثابت نہیں کر سکا۔ لہٰذا اس کے باوجود 'سیکولر' ہندوستان کے 'سیکولر' ججوں نے فیصلہ ہندوؤں کے حق میں دے دیا۔ اور آج بابری مسجد کی جگہ رام مندر کھڑا ہے۔

بابری مسجد دوبارہ تعمیر ہوتی ہے اور غزوۂ ہند جاری ہے!

غزوۂ ہند، یعنی جس معرکے کی آخری لڑائی کو آخر الزمان میں برپا ہونا ہے، کشمیر اور ہند و سندھ میں اس وقت جاری ہے۔ باذن اللہ اسی غزوۂ ہند کی ایک کڑی رام مندر اور اس کے پجاریوں کی چِتا کو خاکستر کر کے گنگا میں بہانا ہوگی۔

بابری مسجد کے خطِ تاریخ کی آخری بات، مسلمانوں کا پھر سے بیدار ہونا، سندھ و ہند کو تاراج کرنا اور بابری مسجد کا پوری شان و شوکت کے ساتھ دوبارہ قیام ہے، جس کے بعد ان شاء اللہ کبھی کسی مسجد کی میلی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی کسی کافر میں ہمت نہ ہوگی!

''ضرور تمہارا ایک لشکر ہندوستان سے جنگ کرے گا، اللہ ان مجاہدین کو فتح عطا فرمائے گا، حتیٰ کہ وہ (مجاہدین) ان کے بادشاہوں (حاکموں) کو بیڑیوں کو جکڑ کر لائیں گے اور اللہ ان (مجاہدین) کی مغفرت فرمادیں گے۔'' (کتاب الفتن از نعیم بن حماد رحمہ اللہ)

☆☆☆☆☆

بقیہ: ہندُتوا کیا ہے؟

اس کے برعکس سامی مذاہب ہندوستانی تہذیب کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے، اس لیے وہ کبھی بھی اس قوم کا حصہ نہیں بن سکتے۔ اس کا کہنا تھا کہ چونکہ سامی مذاہب کے ماننے والوں کے مقدس مقامات مشرقِ وسطیٰ میں ہیں، اس لیے ان کی وفاداریاں کبھی بھی مکمل طور پر ہندوستان کے ساتھ نہیں ہو سکتیں۔

ساورکر نے اگرچہ یہ کوشش کی کہ اس کی طرف سے وضع کی گئی 'ہندو' کی نئی تعریف کے ذریعے سے سب دھارمک مذاہب کے لوگ ہندو کہلائیں، لیکن یہ تعریف عملی طور پر رائج نہ ہو سکی اور آج تک ہندو وہی ہے جو ہندومت کا پیروکار ہو اور دیگر دھارمک مذاہب کے ماننے والے ہندو کہلانے کا حق نہیں رکھتے۔ لیکن ساورکر کی لفظ 'ہندو' کی تعریف کو آج بھی سنگھ پریوار اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

☆☆☆☆☆

بابری مسجد

(ایک اجمالی خطِ تاریخ)

میاں سعد خالد

مسجد کا قیام

۱۵۲۸-۱۵۲۹ء میں سلطنتِ مغلیہ کے مؤسس، ظہیر الدین محمد بابر کے حکم پر، بابر کے تابع فرمان اور ریاستِ اَوَدھ کے والی میر باقی تاشقندی نے، ضلع فیض آباد کے شہر ایودھیا میں ایک مسجد تعمیر کروائی، جسے بابر ہی کے نام کی نسبت سے 'بابری مسجد' پکارا گیا۔

فنِ تعمیر/Architecture

اس مسجد کا طرزِ تعمیر 'سلطنتِ دہلی' کے شاہان کے انداز کا ہے۔ فنِ تعمیر کے لحاظ سے یہ تغلقوں کی بنائی مساجد کی نقل ہے۔ اس انداز کی مساجد پورے ہندوستان (برِّ صغیر) میں پائی جاتی ہیں۔ مغلوں، تغلقوں، خلجیوں، سوریوں...... سب نے ہی اسی طرزِ تعمیر کو برِّ صغیر میں پروان چڑھایا۔ کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ جس زمانے میں برِّ صغیر کے اندر قلعے، محلات اور مساجد و منارے بنائے جا رہے تھے، اس وقت اہلِ یورپ فن و سائنس کا بلند زینہ چڑھ رہے تھے۔ جانتے بوجھتے یہ بات کرنا ایک تاریخی خیانت ہے۔ اسی کا ایک ثبوت خود بابری مسجد کا طرزِ تعمیر ہے۔ یاد رہے کہ بابری مسجد آج سے پانچ سو سال پہلے تعمیر کی گئی تھی۔ فنِ تعمیر کے لحاظ سے دو باتیں اس مسجد کا امتیازِ خاص ہیں۔

پہلا امتیاز: علمِ صوت کے اعتبار سے تعمیر

بابری مسجد کو تعمیر کرتے ہوئے اس کی دیواروں اور محراب میں کچھ 'خلا' رہنے دیا گیا اور ایسے بھر بھرے پتھر کا استعمال کیا گیا جو آواز کو جذب نہیں کرتا، بلکہ آواز اس سے ٹکرا کر آگے کو پھیل جاتی ہے، یعنی ایک گونج پیدا ہوتی ہے۔ برِّ صغیر پر قابض دشمن، گورنر جنرل آف انڈیا 'لارڈ ولیم بنٹنک' کا ماہرِ فنِ تعمیرات 'گراہم پک فورڈ' کہتا ہے کہ "بابری مسجد کے محراب میں کی گئی سرگوشی، مسجد کے آخری کونے تک واضح سنائی دیتی تھی۔ یہ آواز لمبائی اور چوڑائی دونوں میں پھیلتی ہوئی ہر طرف واضح قابلِ سماعت ہوتی۔ بابری مسجد کے دو کونوں کے درمیان دو سو فٹ یا ساٹھ میٹر کا فاصلہ تھا۔"۔ انگریز دشمن خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ "سولہویں صدی میں تعمیر کی گئی عمارت کے اعتبار سے منبر سے لے کر باقی مسجد تک آواز کا پھیلاؤ مدارجِ ترقی میں اپنے زمانے سے آگے کی بات ہے، اس تعمیر میں آواز کے پھیلاؤ کا انداز دیکھنے والے کو حیران کر دے گا"۔

دوسرا امتیاز: ہوا کی آمد و رفت کا انتظام

بابری مسجد میں ہوا کی آمد و رفت کا بہترین نظام تھا۔ اس کے لیے خاص انداز سے گنبدوں، محرابوں اور قبوں کو بنایا گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے لیے اونچی چھتیں تعمیر کی گئیں جن کے ساتھ متعدد طاقیں تھیں اور چھ عدد جالی دار بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جو زیبائشی لحاظ سے بھی شاہکار تھیں۔

اصلی امتیاز عمارتوں کا نہیں، ان کو آباد کرنے والوں کا ہوتا ہے!

بابری مسجد کا جو نقشہ اوپر کے الفاظ میں بیان کیا گیا، اس کا سبب یہ تھا کہ ہم اس کی عمارت سے، اس زمانے کے مسلمان حکمرانوں کی مساجد کو آباد کرنے کی کاوشوں وغیرہ کا اندازہ کر سکیں۔ لیکن اصلی امتیاز عمارتوں کا نہیں ہوتا، بلکہ ان عمارتوں کو آباد کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ غرناطہ و قرطبہ کیا کم شاہکار تھے؟ کیا اشبیلیہ کم خوبصورت تھا؟ لیکن جب غرناطہ و قرطبہ کو آباد کرنے والے، غیرت و حمیت سے عاری ہونے لگے تو حسین و جمیل عمارتیں، ان کا فنِ تعمیر، وہاں کا انتظام و انصرام کہ جسے دیکھ کر آج بھی ایک لمحے کو یہ گمان ہونے لگے کہ شاید جنت ایسی ہو...... یہ سب بے کار گئے۔ مادی اسباب جتنے بھی ہو جائیں بے کار رہتے ہیں، یہاں تک کہ نگہبانی کرنے کے لیے ایمان اور غیرت کا عقیدہ و جذبہ پیدا ہو رہے۔

پھر کیا ہمیں بابری مسجد کے حسن و فنِ تعمیر سے محبت ہے؟ ہاں یہ فخر ضرور ہے کہ ہم دنیا کی بہترین جگہوں یعنی مساجد کو اپنے گھروں سے بہر لحاظ اچھا رکھتے ہیں...... لیکن محبت تو اس عمارت سے لا الٰہ الا اللہ کی وجہ سے ہے۔ یہ عمارت نہ ہوتی، یہ ایک خستہ سا جھونپڑا ہوتا، تب بھی ہمیں اس سے اسی قدر آشنائی ہوتی۔ بلکہ آج جب یہ مسجد نہیں رہی، جب یہ توڑ دی گئی ہے، تب بھی ہمیں اس سے اتنی ہی محبت ہے۔

جب تک ہمارا ایمان مضبوط رہا اور ہم غیرت کی فصیل پر پہرے دار بنے، اپنے مقدسات کی نگہداری کرتے رہے، کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ مسجد ڈھا کر رام مندر بنانے کے خیال کو اپنی زبان پر بھی لا سکے، بلکہ خیال کو زبان پر لانا دور کی بات، کسی نے یہ سوچا بھی نہ تھا۔ اگر کسی نے کوشش کی تو اس کا فیصلہ ہماری تلوار کیا کرتی تھی۔

رام مندر کی کہانی

ہندو کہتے ہیں کہ ان کا ایک اوتار اور بعض کہتے ہیں کہ خدا 'رام' ایودھیا میں پیدا ہوا۔ خدا پیدا ہوا؟! ایک ماں سے! یہ لغویات موضوع نہیں۔ بہر کیف...... آج جو ہندوؤں کے دل کے دل

بابری مسجد پر چڑھ دوڑ رہے ہیں یا ماضی میں چڑھے ہیں تو یہ اصل میں رام مندر کی 'بحالی' کی خاطر ایسا نہیں کر رہے، بلکہ یہ بابری مسجد اور اسلام و مسلمانوں کے خلاف نفرت و دشمنی ہے۔

ایودھیا میں درجن سے زیادہ مندر ایسے تھے جس کے پجاری اور مجاور اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ 'ہمارا' ہی مندر، رام کی جنم بھومی ہے۔ یہ سب دعوے کیا ہوئے؟ کہاں گئے؟

ایک ناٹکی مذہب جس کا ان ویدوں سے بھی کوئی تعلق نہیں جن کو ہندو اپنا روحانی 'صحیفہ' قرار دیتے ہیں۔ وہ ہندو مت جس میں کوئی بات مَت میں آنے والی نہیں۔ ہر ایک کا 'پرسنل' بت ہے، ذاتی خدا ہے۔ اور تو اور ایک نام کے مسلمان شاہ رخ خان کو بھی پوجنے والے ہندو موجود ہیں۔ ایک کرکٹ کے مہان کھلاڑی 'سچن ٹنڈولکر' کی پوجا کرنے والے جس مذہب میں پائے جاتے ہیں، جو اسے 'کرکٹ کا خدا' کہتے ہیں۔ ایسے مذہب پر چلنے والے جنونی صرف مسلمانوں اور ان کے متعلقات کے دشمن ہیں۔

کیسی لغو بات ہے کہ تاریخی کتابیں جو ہندوؤں ہی کی لکھی اور مرتب کردہ ہیں میں لکھا ہے کہ رام کب پیدا ہوا اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، دو چار دن، مہینے، دو چار سالوں کا اختلاف نہیں، ایک کہتا ہے پانچ ہزار سال قبل مسیح میں رام، ایودھیا میں 'جنا' گیا اور دوسرا کہتا ہے کہ ڈیڑھ سو برس قبل مسیح میں یہ 'پاپ' ہوا۔ یعنی بس زیادہ فرق نہیں ہے چار پانچ ہزار سال بیتتے وقت ہی کتنا لگتا ہے؟!

پھر یہ بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ جس ایودھیا کا کتابوں میں ذکر ہے یہ یہی فیض آباد میں واقع ایودھیا ہے یا کوئی اور؟!

پھر کچھ کہتے ہیں کہ وہی رام جو پیدا ہوا، جس کی ماں تھی، باپ تھا، سیتا جس کی بیوی تھی، لاوا اور کوشا جس کے بیٹے تھے جو بادشاہ بھی تھا اور بعد میں مر گیا۔ وہی رام ایک پجاری کو بابری مسجد میں نظر آیا۔ کہنے والے نے کہا ۲۳ دسمبر (۱۹۴۹ء) کی رات میں نے دیکھا کہ بابری مسجد میں یکایک چاندنی سی اٹھی، اور اس تیز روشنی میں مَیں نے دیکھا کہ چار پانچ سال کا ایک بے حد خوبصورت لڑکا کھڑا ہے۔ جب بے ہوشی ٹوٹی تو میں نے دیکھا کہ صدر دروازے کا تالا ٹوٹ کر زمین پر پڑا تھا۔ تخت پر بت رکھا ہوا تھا، اور لوگ اس کی پوجا کر رہے تھے'۔

جب کہ وہ پجاری جس نے ۲۲ اور ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات بابری مسجد میں گھس کر بت اور مورتیاں رکھیں...... اس کا نام ماہنت رام سیوک داس شاستری ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اس رات میں اکیلا نہیں تھا میرے اور بھی ساتھی میرے ہمراہ تھے۔ میں نے خواب میں خدا کا ظہور ہوتے دیکھا اور اس خواب کی تعبیر میں ہم نے بت مسجد میں رکھ دیے۔ ان سب کی سرپرستی کے کے نیئر (K. K. Nayyer) کر رہا تھا جو ایودھیا کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا۔

بابری مسجد بند کر دی گئی

بابری مسجد کے پیش امام حاجی عبد الغفار صاحب کہتے ہیں کہ 'وہ عشاء کی نماز پڑھا کر گھر آئے اور صبح فجر کی نماز پڑھانے جانا تھا کہ رات میں ہی مسجد کے مؤذن صاحب آئے اور کہا کہ ہندو اس میں گھس گئے ہیں اور بت مسجد میں رکھ دیے ہیں'۔ امام صاحب نے کہا کہ 'یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور خود گئے۔ وہاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نیئر موجود تھا۔ اس نے کہا کہ آج جمعے کی نماز آپ کہیں اور پڑھ لیجیے، اس کے بعد دو چار جمعوں میں اس کا فیصلہ کر کے مسجد آپ کے حوالے کر دیں گے'۔ یوں مسجد تو بند ہو گئی، فیصلہ نہیں آیا اور ہندو مسجد کے چبوترے پر چڑھ کر بت پوجتے رہے۔

مسلم کش فسادات اور مسجد کا انہدام

مسلمانوں نے کچھ احتجاج وغیرہ کیا۔ اس کے نتیجے میں سنہ ۱۹۸۶ء میں ڈھائی ہزار سے زیادہ مسلمان شہید کیے گئے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو صبح کے وقت 'رام رتھ یاترا' کے نام پر ایل کے ایڈوانی کی قیادت میں جو تخریب کاروں اور دہشت گردوں کا کاروان روانہ ہوا تھا وہ ایودھیا میں بابری مسجد کے مقام پر پہنچ گیا۔ یہاں ان 'یاتریوں' نے پوجا کی اور دوپہر بارہ بجے ایک پجاری مسجد کے ایک گنبد پر بھگوا (زرد) رنگ کے جھنڈے لے کر چڑھ گیا اور باقی بھگوا دہشت گردوں نے مسجد پر یلغار کر دی اور کچھ ساعتوں میں مسجد کا فقط ڈھانچہ یا شاید بنیادیں ہی رہ گئیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مسجد کے انہدام کے بعد ایک بار پھر ہندوستان بھر میں فسادات پھوٹ پڑے جس کے نتیجے میں دو ہزار مسلمان شہید کیے گئے۔

ہائی کورٹ کا فیصلہ

ان سب واقعات کے بعد ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کروایا گیا اور ۲۰۱۰ء کے ستمبر کی آخری تاریخ (۳۰) کو عدالت نے فیصلہ دیا کہ بابری مسجد کی زمین کو تین حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ ایک تہائی حصہ 'ہندو مہا سبھا' کو دے دیا جائے جو رام مندر تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ ایک تہائی مسلمانوں کے سنی وقف بورڈ کو دے دیا جائے، جہاں وہ اپنی مسجد تعمیر کر لیں۔ جبکہ آخری ایک تہائی 'نرموہی اکھاڑہ' والے ہندوؤں کو دے دیا جائے۔ یہ فیصلہ بھی ایسا تھا کہ دو تہائی حصہ عملاً ہندوؤں کو دیا جائے اور ایک تہائی مسلمانوں کو۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ

ہائی کورٹ کا فیصلہ مسلمانوں نے بھی اور ہندوؤں نے بھی یعنی فریقین نے ماننے سے انکار کر دیا اور مقدمہ سپریم کورٹ آف انڈیا میں دائر کیا گیا۔ (باقی صفحہ نمبر 32 پر)

سقوطِ ڈھاکہ

ڈھاکہ اس شہر کا نام ہے، جو شہر کل مشرقی پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ وہ پاکستان جس کے قیام میں آج کے پاکستان میں شامل علاقوں کے اہالیان سے اگر زیادہ نہیں تو مساوی جدوجہد و قربانیاں اہلِ بنگال نے پیش کی تھیں۔ اہلِ بنگال نے تحریکِ پاکستان کا ساتھ اپنے حقوق کی بازیابی، آزادی اور آئندہ حقوق کے تحفظ کی خاطر دیا تھا جو اکھنڈ بھارت میں ممکن نہ تھا۔ جب کہ اہلِ بنگال میں خصوصاً اہلِ دین کے یہاں مقصد محض حقوق و آزادی نہ تھا بلکہ اسلام کا نفاذ بھی تھا۔ گویا اہلِ بنگال کے پیشِ نظر دو مقاصد تھے: آزادی و حقوق کا تحفظ اور اسلام۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی حقوق کی بازیابی کی جدوجہد میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی تحریک چلی جو اس خِطّے کی آزادی پر منتج ہوئی، مگر کیا آزادی مل سکی؟ اہالیانِ مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کے جرنیلوں، بیوروکریٹوں اور سیاستدان حکمرانوں کی دستبرد سے نکل کر بھارت کی دہلیز پر پہنچ گئے۔ رہ گیا اسلام تو نہ بقیہ پاکستان میں اس کے بارے میں کچھ پیش رفت ہوئی، اور بنگلہ دیش کے تو قیام کے ساتھ اس مقصد سے عدول اور سیکولرازم کا اعلان کر دیا گیا۔ تو کیا تحریکِ پاکستان میں بنگال کے اہلِ دین اور اہلِ سیاست نے جو حصہ لیا اور جن مقاصد سے حصہ لیا تھا، وہ حاصل ہوئے یا اس کے برعکس دوبارہ وہیں جا کھڑے ہوئے جس پر تحریکِ پاکستان چلی تھی۔

ایسے میں حل کیا ہے؟

اسلام کے ساتھ تمسک اور اس تمسک کے ساتھ حقوق کی حقیقی بازیابی!

فلہٰذا یہاں ہماری سقوطِ ڈھاکہ سے مراد، ڈھاکہ میں لا الٰہ الا اللہ کا سقوط ہے، وہ لا الٰہ الا اللہ جو پورے برِّ صغیر میں کہیں بھی نافذ نہ ہو سکا۔ وہ لا الٰہ الا اللہ جو پاکستان ہی نہیں پورے برِّ صغیر کا مطلب، مقصد اور منزل ہے! وہ لا الٰہ الا اللہ جو ہر ذی روح کے حقوق کا حقیقی ضامن ہے!

(ادارہ)

ہزار سالہ عظمتوں کا جنازہ

شہید مولانا سمیع الحق رحمہ اللہ

زیرِ نظر مقالہ شہید مولانا سمیع الحق رحمۃ اللہ علیہ نے سقوطِ ڈھاکہ کے وقت ماہنامہ 'الحق' میں قلمبند کیا تھا۔(ادارہ)

وہ دیکھو ڈھاکہ فتح ہو گیا اور سقوطِ مشرقی پاکستان کے ساتھ...... اسلام کے لحاظ سے نہیں، مگر مسلمانوں کے لحاظ سے...... دنیا کی عظیم اسلامی مملکت سرنگوں ہو گئی۔

﴿وَمَا تَشَآءُونَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾

"اور تم چاہو گے نہیں جب تک اللہ نہ چاہے۔ اور اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔"

برّصغیر پر افقِ مغرب سے طلوع ہونے والا فتح و کامرانی کا روشن ستارہ، مشرق کی وادیوں میں ٹوٹ گیا۔ آج دیبل کے ساحل پر محمد بن قاسم کا لہرایا ہوا پرچم سرنگوں ہے۔ احمد شاہ ابدالی کی عظمتوں کا آبگینہ چکنا چور ہو گیا ہے۔ اور سومنات کا جامد اور ساکت بت محمود غزنوی کی ناخلف اولاد پر قہقہہ لگا رہا ہے۔ جو گلشن محمد بن قاسم سے لے کر اورنگزیب اور سید احمد شہید و محمود حسن (شیخ الہند) کے خون سے سینچا گیا، آج وہ اجڑا اجڑا سا ہے۔ پاکستان، ہمارے خوابوں کا آئینہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے اور اس کا ہر ذرّہ ہماری تصویر پر خندہ زن ہے۔ اللہ کی رسی، اسلام، کو کاٹ کر مشرق و مغرب کو ملانے کے لئے ہماری تمام تدبیریں نہ صرف ناکامی بلکہ اس شرمناک رسوائی میں اضافہ کا باعث بن گئیں اور آج ملتِ اسلامیہ کے سات کروڑ جگر پارے ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ إنّا لله وإنا إليه راجعون!

ايها النفس اجملى جزعا
فان ما تحذرين قد وقعا

یارائے صبر و شکیب نہیں، نہ صبر کا مقام ہے۔ نالہ و شیون کا طوفان برپا کیجیے۔ اور اگر ضمیر احساسِ ندامت کا ساتھ نہ دے، اور غیرت کا پانی خشک ہو جانے سے آنکھیں اشکبار نہیں ہوتیں، تو مر جائیے، ڈوب مرنے کے لیے اس سے بہتر موقع نہ پا سکو گے۔

بہت سعی کیجیے تو مر رہیے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

سقوطِ ڈھاکہ سے ایک ہفتہ تک جب احساس و شعور کی ساری توانائی یاس و قنوط کے سامنے بے بس ہو چکی تھی اور پچھلے نقشِ آغاز میں قلم اعترافِ عجز پر مجبور تھا تو آج جبکہ یہ واقعۂ ہائلہ اور قیامتِ کبریٰ ایک حقیقت بن چکا ہے، تو کسے تاب ہے کہ برّصغیر کے تقریباً بیس کروڑ مسلمانوں کے ساتھ سانحۂ مرگ پر مجلس عزیٰ برپا کر کے برصغیر میں اپنی ہزار سالہ عظمتوں کی مرثیہ خوانی کر سکے۔ اور کہنے کو رہ کیا گیا ہے......؟ يليتنى مت قبل هذا وكنت نسيا منسيا!

نہیں ہے طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پر کہیے کہ مدعا کیا ہے

خلافتِ بغداد کی تباہی کا ماتم کرتے ہوئے مؤرخِ کبیر علامہ ابن اثیر کو کئی سال تردّد رہا۔ قلبی کیفیت کو چھپا نہ سکے اور لکھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبرِ موت سنانا کس کو آسان ہے اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سنائے۔ کاش! میں نہ پیدا ہوتا، کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا اور بھولا بسرا ہو جاتا (الکامل جلد ۱۲ ص ۱۴۷)۔ آج کی یہ ذلتِ فاضحہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہماری پوری تاریخ کا ذلیل ترین سانحہ ہے۔ بابل کا جابر بادشاہ بخت نصر یروشلم سے ایک لاکھ یہودیوں کو قیدی بنا کر لے گیا تھا کہ ان کی ذلت و مسکنت کی انتہا ہو چکی تھی، مگر عہدِ اسلام تو اس مثال سے نا آشنا ہے۔ مسلمان اور شکست، مومن اور ہتھیار ڈالنا تو اتنی متضاد چیزیں ہیں جتنا کہ خود اسلام اور کفر۔ اسلام کی تاریخ میں نہایت شاذ و نادر مثال فتوحات عراق میں صرف ایک جگہ ملتی ہے، کہ نہایت مجبوری کی وجہ سے چند لوگوں کو پیچھے ہٹنا پڑا جبکہ ساتھیوں نے میدان جیت کر دم لیا، پھر بھی اس واقعے کا اتنا افسوسناک اثر ہوا کہ جن لوگوں کو پیچھے ہٹنا پڑا وہ مدتوں خانہ بدوش پھرتے رہے، شرم سے اپنے گھروں کو نہیں جاتے تھے، اکثر رویا کرتے اور لوگوں سے منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ مدینہ منوّرہ میں یہ خبر پہنچی تو ماتم پڑ گیا۔ جو لوگ مدینہ پہنچ کر روپوش تھے اور شرم سے باہر نہیں نکلتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے پاس جا کر تسلی دیتے تھے اور کہتے تھے کہ تم أوْ مُتَحَيِّزًا إلى فئة میں داخل ہو، مگر ان کو اس تاویل سے تسلی نہیں ہوتی تھی۔ (الفاروق)

مگر چرخِ نیلگوں نے یروشلم کے بعد پہلی مرتبہ ڈھاکہ سے ایک لاکھ قیدیوں کی شکل میں تاریخ کو دہراتے دیکھا، پھر کیا یہ ہماری بے مثال ذلت کی شہادت نہیں؟

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾

"یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اللہ کا دستور یہ ہے کہ اس نے جو نعمت کسی قوم کو دی ہو اسے اس وقت تک بدلنا گوارا نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت تبدیل نہ کر لیں اور اللہ ہر بات سنتا، سب کچھ جانتا ہے۔"

یہ قدرت کا قانون ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمتوں کی بے قدری کرنے والوں کو ذلت اور نامرادی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہاں تک کہ وہ قوم اپنی حالت نہ بدل ڈالے۔ پھر کیا یہ اسلام کی شکست ہے؟ کیا نصرتِ خداوندی اب عصر حاضر کے مظالم اور باطل کا سامنا نہیں کر سکتی؟ کیا

حق باطل کے سامنے سپر انداز ہو چکا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا خدائے حی و قیوم سومنات کے مردہ اور جامد پتھروں کے سامنے عاجز اور بے بس ہو چکا ہے؟ نہیں! ہزار بار نہیں۔ اپنی رسوائی اور ناکامی کو اسلام کے سر تھوپنے والو! کیا یہ اسلام اور کفر کا مقابلہ تھا؟ اور کیا یہ آخری مقابلہ تھا؟ کیا بدر و حنین اور یرموک و قادسیہ مسلمانوں کے نہیں ہندوؤں کے تھے؟ کیا بحر الکاہل کی متلاطم موجوں کو چیر کر جبل الطارق پر علمِ توحید نصب کرنے والے کوئی اور تھے؟ کیا پانی پت اور میسور کے میدان کسی اور کے خون سے لالہ زار بنے تھے؟ کیا برّ صغیر میں پھیلے ہوئے شکستہ کھنڈرات کسی اور کے عہدِ اقبال کی شہادت دے رہے تھے؟ اور کیا جلال و جبروت کا سرچشمہ خدائے بزرگ و برتر ہندو کی بے جان مورتیوں سے شکست کھا سکتا ہے؟ کبھی نہیں! حق و باطل کی پوری تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہ پاسکو گے۔ پھر یہ کیا تھا......؟ یہ شکست قانونِ مکافاتِ عمل کا ظہور اور شامتِ اعمال کا نتیجہ تھا۔

﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾

”ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا، بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔“

نصرت اور قوتِ خداوندی تو ہمیشہ قائم اور دائم رہنے کے لیے ہے۔ اور کسی کو اس پر یقین نہ ہو تو پھر اسے چاہیے کہ اوپر کی طرف ایک رسی تان کر اس کا پھندا بنالے اور اس طرح اپنے گلے میں پھانسی لگالے۔

﴿مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ﴾

”جس شخص کو یہ گمان ہو کہ اللہ ہرگز اس کی مدد نہیں کرے گا دنیا اور آخرت میں تو اسے چاہیے کہ وہ ایک رسی آسمان کی طرف تانے، پھر اسے کاٹ دے پھر دیکھے کہ کیا اس کی یہ تدبیر اس چیز کو دور کر دیتی ہے جو اسے غصہ میں لاتی ہے؟“

پس یہ اسلام کی شکست نہیں جو ایک ابدی حقیقت اور سرمدی صداقت ہے، بقاء اس کی معیت اور فنا اس سے گریز میں ہے۔ بلکہ یہ عروج وزوالِ امم کے لیے اللہ کے اٹل قوانین اور سنت اللہ کا ٹھیک ٹھیک ظہور ہے۔ ذرا بھی اپنے شکستہ دل کے گوشوں میں اس المیہ کے اسباب ٹٹولو گے تو یہ نتائج تعجب خیز نہیں بلکہ سنت اللہ کے عین مقابل معلوم ہوں گے۔ ایسا نہ ہوتا تو اس سنت کی تبدیلی سب کو محوِ حیرت کر دیتی۔ پس یہ رسوائی اسلام کی نہیں اللہ کے مخلص بندوں کی ہے بلکہ اعمال کا سنگدلانہ ردعمل اور گھناؤنا انتقام ہے۔ نفاق اور کھوکھلے نعروں کی شکست، قول و عمل کے تضاد، اسلام کو نعرۂ فریب و استحصال بنانے کی شکست ہے۔ یہ عیاری، فحاشی اور بے حیائی کی شکست ہے۔ یہ اختلاف و انتشار اور اقتدار کے لیے رسہ کشی کا نتیجہ ہے۔ سیاست کی موت ہے کہ فاروقی سیاست تو غالب رہنے کے لیے تھی۔ یہ خود غرضی اور ہوسِ اقتدار کا وبال ہے اور گاڑی ہلاکت اور بربادی کی اپنی اسی منزل میں جا گری ہے، جس کی راہ پر ہم نے اسے ڈال دیا تھا۔ اب ہم لاکھوں تحقیقاتی کمیشن قائم کریں، جنگی اور سیاسی اسباب ٹٹولیں، ایک دوسرے کو قربانی کا بکرا بنا کر اپنے مجرم ضمیر کی آسودگی کا سامان کریں، ہماری عظمت کا قصرِ رفیع، جو پیوندِ خاک ہو چکا ہے، بلند نہیں ہو سکتا۔ حتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ لٹی ہوئی آبرو تحقیقاتی کمیشنوں سے واپس نہیں ہو سکتی۔ نہ نفس اور قوم کو فریب دینے کے لیے اس سعی لاحاصل کی ضرورت ہے۔

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہو گا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

اپنی حالت بدلنے کے بجائے ان ابلہ فریبیوں میں پڑنے والو! کہیں کلکِ تقدیر نے یہ کہہ کر پوری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا حکم تو نہیں دیا، ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ۔ بیشک مایوسی کفر اور یاس و قنوط پیغامِ موت ہے۔ مسلمان مایوس نہیں ہوتا لیکن وہ اسلام جو مردہ قوموں کے لیے حیاتِ جاودانی کا مژدہ بنتا تھا، اس پورے عرصہ آزادی میں کبھی اپنایا گیا؟ اگر اپنایا ہوتا تو یہ روزِ بد کیوں دیکھتے؟ پھر آج امید کی دنیا بسائی جائے بھی تو کیسے؟ ہمارے پاس رہ کیا گیا ہے، چند آنسو، چند حسرتیں اور چند آہیں؟ قوم کا سازِ حیات ٹوٹ چکا ہے اور وہ جسے ہم عالمِ اسلام کا حصار کہتے تھے، خود ہمارے ہاتھوں ٹوٹ چکا ہے۔ ہم نے صلاح الدین کی آبرو، مسجدِ اقصیٰ، یہودیوں کے ہاتھوں لٹادی، وسط ایشیاء، سمرقند و بخارا میں اپنی سرخروئیوں کا خزانہ اپنے ہاتھوں دفن کیا۔

اسپین اور سسلی میں اپنی متاعِ عظمت و شوکت تاراج کرنے والو! آج ہند میں محمود غزنوی کی قبائے عزت و افتخار بھی ہمارے ہاتھوں تار تار ہو چکی ہے۔ مگر ہماری عشرت ناکی اور ہوس ناکیوں میں لمحہ بھر کے لیے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہم میں سے کتنے ہیں جنہیں اس مصیبتِ کبریٰ کا واقعی احساس ہے؟ کتنی آنکھیں خونبار ہو چکی ہیں؟ کتنے قلوب فرطِ غم سے پھٹ چکے ہیں؟ کتنے ہیں جو زندگی کی رنگینیوں کو چھوڑ کر دشت و صحراء کے ویرانوں کو اپنی آہ و بکاء سے آباد کر چکے ہیں؟ اور کتنے ہیں جنہیں اب اس ”عظیم المیہ“ سے سبق لینا ہے......

اٹھو! دیکھو پورا برصغیر اسلام کا غربت کدہ بن چکا ہے۔ اور اگر تمہارے مقدر میں رونا ہی رہ گیا ہے، تو اٹھو اور اپنے نالہ و شیون سے عالمِ افلاک میں تہلکہ مچادو۔ شاید رب السموات والارض کو ہماری پستی اور بے بسی پر ترس آجائے۔ مسلمانو! سقوطِ ڈھاکہ وقتی حادثہ نہیں، یہ ہند میں تمہارے اسلاف کی تیرہ سو سالہ عظمتوں اور قربانیوں کا جنازہ ہے۔ اب تمہیں روٹی کپڑا اور مکان کی نہیں کھوئے ہوئے لباسِ مجد و شرف کی ضرورت ہے۔ اور اگر اس حال پر خوش ہو تو یاد رکھو کہ خدا کی بستی میں اس لباس سے ننگی قوم کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔

یہی ہے زندگی تو زندگی سے موت اچھی
کہ انسان عالمِ انسانیت پر بار ہو جائے

☆☆☆☆☆

غدّار کون؟

مولانا محمد اسحاق صدیقی

سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب کی طرف اہلِ دین اور علماء و مشائخ کی توجہ مبذول کراتی ہوئی اچھوتی تحریر۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اس تحریر کو خاص توجہ کے ساتھ دل و نظر سے پڑھیں کہ پچاس سال قبل سقوطِ ڈھاکہ کے وقت ہمارے ملک و ملت کے جو حالات تھے، آج وہ حالات کہیں بدتر ہو چکے ہیں اور ایسے میں اہلِ دین اور علماء و مشائخ پر ذمہ داری کا بار ماضی سے کہیں زیادہ ہو گیا ہے۔

یہ تحریر ماہنامہ 'الحق' کے جنوری فروری ۱۹۷۲ء کے شمارے میں نشر ہوئی تھی۔ (ادارہ)

کلیجہ خون اور دل ناصبور ہے، دیکھنے کی طاقت کہاں سے لاؤں، ہزیمت فلسطین کا زخم ابھی ہرا تھا کہ دوسری ذلت آمیز شکست کا منحوس اور بھیانک چہرہ دیکھنا پڑا۔ مومن کا کام صبر، اس کے ساتھ عبرت و نصیحت حاصل کرنا ہے۔ اس لیے اسبابِ شکست پر روشنی ڈالنا بھی ایک فریضہ ہے جسے اس عالمِ دل شکستگی میں بھی کسی نہ کسی طرح ادا کرنا ضروری ہے۔

یہ بات تو بالکل کھلی ہوئی ہے، اور غالباً پاکستان کا ہر فرد اس سے واقف ہو گیا ہو گا کہ ہماری شکست غداری کی وجہ سے ہوئی، ورنہ ہماری پوزیشن ایسی نہ تھی کہ ہمیں اتنی ذلت کے ساتھ ہتھیار ڈالنا پڑتے اور اپنے لاکھوں بھائیوں کو دشمنوں کی درندگی اور اس کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے لیے چھوڑ دینا پڑتا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ غدّاری ان گروہوں نے کی ہے جو اسلام کے مدعی ہیں، لیکن درحقیقت اسلام کے دشمن ہیں۔ وہ جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں تو اسلام کی ایک مخصوص اصطلاحی تعریف پیشِ نظر رکھتے ہیں جو انہی پر منطبق ہوتی ہے۔ ہم سُنّی جس دین کو اسلام کہتے ہیں اس سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہے، بلکہ عداوت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انہیں اس غداری کی جرأت کیوں ہوئی جبکہ ہماری یعنی اہل سنت کی اکثریت ہے۔ اور ہم میں سے بعض افراد ان کے اس ناپاک مقصد کو پورا کرنے کے لیے ان کے معاون کیوں بن گئے؟ یہ اتفاقی طور پر ہو گیا یا اس بارے میں ہم میں سے ہی کوئی قصوروار ہوا ہے؟ اس چیز کا دیکھنا اس وقت زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ مغربی پاکستان بھی اس وقت خطرے میں ہے۔ ہم اگر اپنی غلطیوں کی تلافی کر لیں تو ان شاء اللہ اسے نقصان نہ پہنچے گا، ورنہ اندیشے تو ایسے ہیں جن کا تصور بھی لرزہ بر اندام کر دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہوا خلاف توقع نہیں ہوا۔ اصحابِ بصیرت اور باخبر افراد بہت دن سے اس اندوہناک انجام کو دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ ہماری مسلسل غلطیوں کا منطقی نتیجہ یہی نکلنا چاہیے تھا۔ اور سنت اللہ بھی ہے کہ جب اس قسم کی غلطیاں کی جاتی ہیں تو عذاب الٰہی اسی صورت سے آتا ہے۔ جس سازش کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے اس کے بارے میں بعض باخبر افراد نے، جو عوام میں غیر مؤثر ہونے کی وجہ سے خود کچھ نہ کر سکتے تھے اور جن کی آواز سننے کے لیے پبلک تیار نہ ہوتی، بعض ذمہ دار مقبولِ عام اور مؤثر آواز رکھنے والے سیاسی قائدین کو ایک سال پہلے مطلع کر دیا تھا۔ بلکہ بعض کو تو سازش کے ابتدائی مدارج سے دو ڈھائی سال پہلے مطلع کر دیا تھا۔ مشرقی پاکستان کو بھارت کی گود میں ڈال دینے کی سازش کا اس وقت تک انہیں علم نہ تھا، لیکن اس کی تمہید کا علم ہو گیا تھا، جس کی اطلاع انہوں نے بعض ذمہ دار سیاسی قائدین کو دے دی تھی، لیکن یہ قائدین جرأت و ہمت سے محروم ہیں، ان میں وہ جذبۂ قربانی نہیں ہے جو ایک سیاسی قائد کا جوہر ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ساکت و صامت رہے اور سازش کی کھلی ہوئی علامتیں دیکھنے کے بعد بھی اس سے بے خبر بنے رہے۔ مارشل لاء کا خوف، جیل جانے کا خطرہ، اور آرام دہ زندگی چھوٹنے کا اندیشہ افضل الجہاد سے مانع رہا۔ حالانکہ اگر وہ دوسری مؤثر شخصیتوں کو مطلع کر کے اجتماعی طور پر اس راز کو فاش کر دینے اور غداروں کے چہرے پبلک کو دکھا کر انہیں نکالنے کا مطالبہ کرتے تو حکومت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور اس حادثہ جانکاہ تک نوبت نہ پہنچتی۔

ان غلطیوں کی تفصیل تو بہت طویل ہے، ان کا اس وقت تذکرہ مقصود نہیں ہے۔ میں تو اس بنیادی بات کا تذکرہ کر کے دعوتِ فکر و عمل دینا چاہتا ہوں جو ہماری سب غلطیوں کا اصل سبب ہے۔ یہ بات تو بالکل کھلی ہوئی ہے کہ جس ایسے سے ہمیں دوچار ہونا پڑا وہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے، جو ہماری غیر اسلامی زندگی، ہمارے معاشرے کے گناہوں اور اس میں انابت الی اللہ کے فقدان کی سزا اور اس کا وبال ہے۔ ہمارے معاشرے کی معصیت کوشی عمل کی حد تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ زہر عقائد تک پہنچ گیا۔ اور ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا جو کھلم کھلا لادینیت کی دعوت دیتا ہے اور اسلام کے بنیادی عقائد کا مذاق اڑاتا ہے۔ ان ملحدین سے قطع نظر کثیر تعداد ایسے افراد کی پائی جاتی ہے، جن کے بنیادی عقائد تو صحیح ہیں لیکن عملاً انہوں نے ان عقائد کو زندگی سے خارج کر دیا ہے۔ یہ عقائد ان کے ذہن کے ایک گوشے میں تو ضرور پڑے ہوئے ہیں، لیکن ان کی عملی زندگی ان سے بالکل بے نیاز ہے۔ اور وہ فسق و فجور میں اس قدر بے باک ہیں جس قدر ایک غیر مسلم۔ کیا یہ حالات اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینے والے نہیں ہیں؟

اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی سامنے رکھیے کہ پورا پاکستان فاسقوں سے بھرا ہوا نہیں ہے۔ الحمد للہ کہ ہمارے ہاں دیندار طبقہ بھی خاصی تعداد میں ہے۔ اس میں علماء و مشائخ بھی ہیں، اور عوام بھی۔ جن کے اعمالِ صالحہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو متوجہ کرنے والے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دیندار طبقہ کا ہمارے معاشرے پر کیا اثر ہوا؟ اور ان صالحین کے ہوتے ہوئے ہمارے معاشرے میں اس قدر شدید اور اس قدر وسیع پیمانے پر فساد کیسے پیدا ہو گیا جو اللہ تعالیٰ

کے اس عذابِ شدید کا موجب بنا؟ بلا شبہ اس زمانے میں جبکہ دنیا فساد سے بھر گئی ایسے معاشرے کا وجود جس میں گناہ و معصیت کا شمار اتفاقی حادثات میں شمار کیا جائے بہت مشکل ہے۔ لیکن ایسے معاشرے کا وجود بالکل ممکن ہے جس میں توبہ کرنے والوں اور گناہوں پر نادم ہونے والوں کی تعداد بھی عاصیوں اور گنہگاروں کے مساوی یا اس کے قریب قریب ہو، اگر ایک گروہ معصیت کے گندے نالے میں غوطہ لگاتا ہوا دکھائی دے تو دوسرا نادم و خجل ہو کر اس میں سے نکلتا ہوا بھی نظر آئے، گناہگاروں کی زندگی کا ایک پہلو تاریک ہو تو دوسرا اعمالِ صالحہ سے روشن بھی دکھائی دے، گویا ہمارا معاشرہ قرآنی زبان میں ﴿خلطوا عملا صالحا وآخر سیئا﴾ ترجمہ: اعمالِ صالحہ اور اعمالِ سیئہ دونوں کو ملا دیا ہے (یعنی دونوں قسم کے اعمال کیے ہیں) کا مصداق ہو۔

یہ تو ممکن بھی ہے اور اس کے نمونے بھی موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ صالحین کی موجودگی میں اس درجہ پر کیوں نہیں رکا اور اس قدر پستی میں کیوں جا پڑا؟ جو شخص پاکستان کی ۲۵ سالہ تاریخ سے واقف ہے، وہ اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ بیرونی طاقتیں اور اندرونی منافق یا مسلم نما دشمنانِ اسلام نے، جو ہمارے لیے مارِ آستین کی حیثیت رکھتے ہیں، فسق و فجور اور الحاد پھیلانے کی کتنی کوشش کی ہے اور ہمارے سنّی نوجوانوں کو برباد کرنے کے لیے کیا کیا جتن کیے ہیں۔ انہوں نے ہمیں برباد اور گمراہ کرنے کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے۔ اور جب وہ اقتدار پر قابض ہوئے تو اپنے مناصب کی پوری طاقت ہماری قوم کو گمراہ کرنے پر صرف کر دی۔ یہی وہ مارِ آستین ہیں جنہوں نے غدّاری کر کے ہمیں اتنا شدید نقصان پہنچایا اور لاکھوں اہلِ سنت کا خون بہا کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ یہاں پہ پہنچ کر ہمارے سامنے چند سوالات آتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ منافقوں کے ان گروہوں کو اس قدر استطاعت کیسے حاصل ہو گئی کہ وہ ہماری قوم کو اس قدر پستی میں پہنچا دیں اور اس کے اخلاق و اطوار اس قدر بگاڑ دیں؟ یہ لوگ ایسے مناصب تک کیسے پہنچ گئے کہ ان کی غداری ہمارے لیے اس قدر تباہ کن ثابت ہوئی؟ ان میں اتنی بڑی غداری کی جرأت کیوں ہوئی، جبکہ اغلب اکثریت ہماری ہے؟ یہی وہ سوالات ہیں جن پر غور کرنے سے ہماری اس تباہی کا اصل سبب روشن ہو جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ خود ہم نے اس بارے میں کیا غلطی کی ہے۔ اس پر بحث کرنا میرا اصل مقصود ہے کیونکہ غدر تو دوسروں نے کیا، فسق و فجور کی ترویج دوسروں نے کی، دوسرے کا فعل تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہمارے اختیار میں جو کچھ ہے وہ ہمیں کرنا چاہیے۔ دیکھنا یہی ہے کہ خود ہم سے کیا غلطی ہوئی، تاکہ اگر ممکن ہو تو اس کی کسی درجہ میں تلافی کر سکیں۔

کسی قوم کا آزاد مستقل وجود اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کا ایک قومی و اجتماعی ذہن نہ ہو۔ اس کا قومی ذہن ہی اس کی بقا اور اس کی آزادی کا ضامن ہوتا ہے اور قوم کے افراد اجتماعی امور میں بھی اس ذہن سے سوچتے ہیں۔ اگر قوم میں مختلف فرقے ہوں اور اکثریت کا یہ ذہن بن جائے تو عموماً ذہنیتیں بھی اسی ذہن سے سوچنے پر مجبور ہوتی ہیں ورنہ کم از کم انہیں اس کی رعایت کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً انگلستان کا ایک قومی ذہن ہے جو نسل و وطن کے تصورات پر مبنی ہے، وہ اپنے اجتماعی مسائل کو اسی ذہن سے سوچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا شیرازہ بکھرنے نہیں پاتا، وہاں آپ کو کوئی غدار نہیں ملے گا۔ اس میں سیاسی پارٹیاں بھی ہیں اور ان کے درمیان کشمکش بھی، لیکن کوئی پارٹی اپنے ملک کے ساتھ غداری نہیں کرے گی۔ کیونکہ اول تو وہ اپنے قومی ذہن سے بے نیاز ہو کر سوچ ہی نہیں سکتی اور وہ بھی غدر کی اجازت نہ دے گا۔ دوسرے اگر بالفرض وہ سوچے بھی تو ملک کا قومی ذہن فوراً اس کا احساس کرے گا اور اس کا خوف اسے کبھی غدر کی جرأت نہ کرنے دیگا۔

تقسیمِ برصغیر سے پہلے ہی بھارت نے اپنا ایک قومی ذہن بنا لیا جو ہندو قومیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبائی، لسانی، نظریاتی ہر قسم کے کثیر اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے مقابلے میں پوری ہندو قوم متحد ہے۔ دورانِ جنگ ان کے یہاں کوئی بھی ایسی تحریک نہیں پیدا ہوئی جو انہیں کمزور کر سکتی۔ نہ وہاں ''بنگلہ دیش'' کا نعرہ سنائی دیا۔ حالانکہ مغربی بنگال انہی کے پاس ہے۔ اور نہ ''سکھستان'' کی صدا بلند ہوئی، حالانکہ یہ موقع تھا کہ پاکستان کی امداد سے سکھوں کے اس خواب کی تعبیر نکل آتی۔

ہماری قومیت ہمارے دین پر مبنی ہے، اگر دین کو درمیان سے نکال دیجیے تو کوئی عنصر ایسا نہیں باقی رہتا جو پاکستان کے مختلف اجزاء اور صوبوں کو متحد رکھ سکے۔ اس لیے ہماری بقاء اور آزادی کے قیام کے لیے لازم ہے کہ ہمارا ذہن دینی ہو۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ۲۵ سال کی طویل مدت میں ہماری قوم کا دینی ذہن وجود میں نہ آسکا، بلکہ اس کے جو آثار تحریکِ پاکستان کے وقت موجود تھے وہ بھی برباد ہو گئے۔ مناسب یہ ہے کہ میں پہلے اس 'دینی ذہن' کی تشریح کر دوں۔

'دینی ذہن' کا مفہوم یہ ہے کہ انسان ہر مسئلے کو دینی نقطۂ نظر سے دیکھے اور اس کے دینی مصالح اور مفاسد کو پیش نظر رکھ کر دنیاوی مصالح و مفاسد کو قانونی حیثیت دے۔ یہ طرزِ فکر انفرادی حیثیت میں بھی پایا جاسکتا ہے اور اجتماعی حیثیت میں بھی۔ جہاں تک انفرادی حیثیت کا تعلق ہے، ہماری قوم میں ایسے افراد کی معتدبہ تعداد پائی جاتی ہے جو اپنی انفرادی زندگی میں یہی طرزِ فکر اور ذہن رکھتے ہیں اور اپنے ذاتی مسائل پر دین ہی کے نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں۔ لیکن جو چیز ہم میں مفقود ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارا قومی و اجتماعی ذہن دینی نہیں رہا، یعنی ہماری قوم جب اپنے اجتماعی مسائل پر غور کرتی ہے تو وہ خالص دنیاوی نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ اختیار کرتی ہے اور دنیاوی مصالح و مفاسد کو پیش نظر رکھ کر دینی مصالح و مفاسد کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ قوم کے 'دینی ذہن' ہونے کا مطلب یہی ہے کہ قوم کے افراد خواہ اپنی انفرادی و شخصی زندگی میں بے راہ روی کے مرتکب ہوتے ہوں اور دنیاوی زاویۂ نظر سے غور و فکر کرنے کے عادی ہوں لیکن ایسے اجتماعی مسائل پر خواہ وہ سیاسی ہو یا معاشی یا تعلیمی یا اور قسم کے، دینی زاویۂ نظر سے دیکھنے

کے عادی ہوں اور ہر اجتماعی معاملے کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ اس کا اثر ہمارے دین پر کیا پڑتا ہے؟

یہاں یہ نکتہ پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ 'قومی ذہن' کو 'دینی' بنانے کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ قوم کا ہر فرد دیندار اور متقی ہو جائے۔ قوم میں فساق و فجار کی اکثریت کے باوجود قوم کا اجتماعی و قومی ذہن دینی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ان فاسقوں کا انفرادی ذہن دنیاوی ہو گا، مگر ان کا اجتماعی ذہن دینی ہی ہو گا اور اجتماعی مسائل پر وہ اسی سے نظر کریں گے۔

یہ صرف امکان نہیں ہے بلکہ واقعہ بھی ہے۔ شواہد تو بہت ہیں، لیکن اسی برصغیر کی قریبی تاریخ کا مطالعہ تصدیق و تائید کے لیے کافی ہے۔ تحریکِ خلافت کو ابھی زیادہ دن نہیں گزرے ہیں، اسے دیکھنے والے بھی ابھی موجود ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں نے خلافت عثمانی کی حفاظت وبقاء کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی، صرف اس لیے کہ اس کے زوال کو دینی نقصان سمجھتے تھے۔ دنیا کے اعتبار سے انہیں اس کا کوئی بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ قوم میں اس وقت بھی اکثریت فساق ہی کی تھی، لیکن بحیثیت مجموع قوم کا ذہن دینی تھا، اس لیے اس نے اس اجتماعی مسئلہ کو اسی ذہن سے سوچا۔ اس سوچنے میں وہ لوگ بھی شریک تھے جن کا انفرادی ذہن بالکل دنیاوی تھا۔ تحریکِ پاکستان کے وقت بھی اس 'دینی ذہن' کی کارفرمائی ظاہر ہوئی۔ اسی وجہ سے تحریک میں ان مسلمانوں نے بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا جو آج بھی بھارت کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں، اور ہندوؤں کے ماتحت رہنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنا انجام جانتے تھے، مگر صرف دین کے فروغ کی لالچ میں انہوں نے تحریک میں پوری سر گرمی کے ساتھ حصہ لیا۔

جس خطے پر پاکستان بنا ہے اس پر برطانوی اثرات بہت زیادہ تھے۔ یہ قومیں مسلمانوں کے 'دینی ذہن' کو ختم کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں، تاہم تحریکِ پاکستان کے وقت مسلمانوں کے اس ذہن میں ایک حرکت پیدا ہوئی، اور زندگی کے آثار اس سے ظاہر ہوئے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ تحریک پاکستان دین کے نام پر شروع کی گئی تھی۔ مگر قیامِ پاکستان کے بعد مسلم نما اسلام دشمن مارہائے آستین اور بیرونی طاقتوں کی طرف سے اس ذہن کو ختم کر دینے کی کوشش شروع ہو گئی جو بہت ہوشیاری اور تسلسل کے ساتھ جاری رہی اور آج تک جاری ہے۔ چند ہی سال کے بعد یہ بات روشن ہو گئی کہ تحریک پاکستان کے وقت 'دینی ذہن' کی انگڑائی در حقیقت افاقۃ الموت کے مترادف تھی۔ ایک سنبھالا لینے کے بعد مریض اس عالم سے رخصت ہو چکا ہے۔

ہمارے دیندار طبقے کا فرض تھا کہ وہ اپنی پوری قوت و طاقت اس دینی ذہن کی بازیافت اور تقویت کے لیے صرف کرتے۔ اس طبقہ سے میری مراد علماء ومشائخ کے علاوہ عام حضرات بھی ہیں، جو دینی شعور رکھتے ہیں اور اپنی زندگی کو دین کے راستہ پر چلانے کی کسی درجہ میں کوشش کرتے ہیں۔ ذمہ داری ہر اس شخص پر عائد ہوتی ہے جو دین کا شعور اور دوسرے تک اسے پہنچانے کا کچھ سلیقہ رکھتا ہے۔ لیکن حیف صد حیف کہ اس طبقے نے اپنی ذمہ داری مطلقاً محسوس نہ کی، بلکہ اجتماعی مسائل کو خود بھی غیر دینی اور خالص دنیاوی ذہن سے سوچنے لگا۔ صوبائی، قبائلی، طبقاتی، نسلی وغیرہ جاہلی عصبیتوں کا زہر اس کے دل و دماغ میں بھی سرایت کر گیا۔

قومی ذہن کا سب سے نمایاں اور قوی اثر سیاسیات میں ظاہر ہوتا ہے۔ پاکستان کی پچیس سالہ سیاسی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈال جائیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ ہمارے سیاسی قائدین نے کسی سیاسی اقدام یا حادثہ پر دینی زاویۂ نظر سے غور نہیں کیا، بلکہ ان کی سیاست خالصۃً دنیاوی رہی۔ صرف دنیادار لیڈروں کا اگر یہ حال ہوتا تو کچھ صبر بھی آجاتا، مگر یہ افسوسناک خبر کس طرح بھلا دی جائے کہ یہی کیفیت ان سیاسی قائدین کی بھی ہے جو اپنی انفرادی زندگی میں بہت دیندار اور متقی ہیں۔ گھٹیا درجہ کے دنیاوی مقاصد ان کے پیش نظر رہے۔ دین کے تحفظ اور اس کی ترویج کی انہیں کوئی فکر نہ ہوئی نہ کبھی انہیں اس کا خیال آیا کہ ہمارے فلاں سیاسی اقدام کا عام مسلمانوں کے دین پر کیا اثر پڑے گا؟ یا فلاں سیاسی حادثے سے ہمارا دین کیا اثر لے گا؟ اس حالت کو اخلاص وللّٰہیت سے نسبتِ تضاد حاصل ہے۔ اگر ہمارے سیاسی قائدین مخلص ہوتے اور اپنی سرگرمیوں کا محور رضائے الٰہی اور دین حق کے فروغ کو بناتے تو اس ادبار کا منحوس چہرہ ہمیں نہ دیکھنا پڑتا۔

علمائے کرام امت کے دینی نگران ہیں۔ یہ منصب انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوتا ہے۔ اس سے نہ انہیں کوئی معزول کر سکتا ہے نہ وہ خود اس سے مستعفی ہو سکتے ہیں۔ ان کی نظر ہر وقت امت کے دینی مصالح و مفاسد پر رہنی چاہیے اور انہیں اس بارے میں سب سے زیادہ حساس ہونا چاہیے۔ مگر ہماری محرومی دیکھیے کہ یہ جماعت بھی اس معاملہ میں غفلت کا شکار ہو گئی اور انہوں نے بھی اجتماعی تغیرات کا مطالعہ دینی ذہن سے نہیں کیا اور نہ امت کے ذہن کو دینی بنانے کی کوشش کی۔ ان کی کیفیت یہ رہی کہ انہیں بریلویت، دیوبندیت، حنفیت اور غیر مقلدیت کی حفاظت کی تو فکر ہوئی، لیکن خود 'سنّیت' کی حفاظت کی کوئی فکر نہیں ہوئی۔ حالانکہ بریلوی و دیوبندی اختلاف کا درجہ ایسا ہی ہے جیسے دو بھائیوں میں اس بات پر اختلاف ہو کہ باپ سے کون زیادہ محبت کرتا ہے۔ دونوں مکتب فکر کے حضرات 'سنّی' ہونے کے مدعی ہیں اور زمرۂ اہلسنت سے نکلنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہے۔ لیکن باوجود اس کے خود مسلک اہلسنت والجماعت کی حفاظت کی ان میں سے کسی نے بھی کوشش نہ کی۔ حالانکہ اس کے لیے خطرات شروع ہی سے موجود تھے اور اسے ختم کرنے کی کوششیں کھلم کھلا ہو رہی تھیں۔ حنفیت وغیر مقلدیت کا اختلاف تو اس سے بھی ادنیٰ درجے کی چیز ہے، لیکن یہ بھی حدود سے تجاوز کر گیا، یہی اختلافات کیا کم تھے کہ علماء کے درمیان سیاسی اختلافات بھی پیدا ہو گئے اور انہوں نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ اخلاقی و شرعی حدود کو پار کر لیا۔ اس چیز نے رہے سہے اتحاد کو بھی ختم کر دیا۔ یہ اختلاف بھی در حقیقت 'دینی ذہن' کے فقدان اور خالص 'دنیاوی

ذہن' سے سیاسی مسائل کو سوچنے کا نتیجہ تھا۔ اگر 'دینی ذہن' موجود ہو اور ہم اپنے مسائل اسی 'اجتماعی و قومی ذہن' کے سامنے پیش کرتے تو یہ اختلافات پیدا ہی نہ ہوتے اور اگر ہوتے تو حدود سے متجاوز ہو کر مضرت رساں نہ بنتے۔

ظاہر ہے کہ جب اجتماعی مسائل کے بارے میں ہمارے علماء و صلحاء کا ذہن بھی 'دینی' نہیں تھا تو عوام کا ذہن دینی کس طرح بن سکتا تھا؟ اور ہمارے قومی ذہن کی تعمیر کیسے ہو سکتی تھی؟

ہمارے دیندار طبقے کی داستانِ غفلت اسی پر ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ دوسری شدید غلطی اس طبقہ سے یہ ہوئی کہ اس نے عوام الناس سے ربط پیدا کرنے اور ان میں دین کے اعتبار سے اپنے اثر میں لینے کی کوشش نہیں کی۔ یہ ذمہ داری نہ ہر دینی شعور رکھنے والے پر عائد ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے ربط پیدا کر کے ان میں ہی دینی شعور پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن علماء و مشائخ پر یہ ذمہ داری سب سے زائد ہے۔ مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔

پچیس سال کی مدت خاصی ہوتی ہے۔ اس میں ایک نئی نسل وجود میں آجاتی ہے۔ اس نئی نسل کی ذہنی و اخلاقی تربیت پرانی نسل کے ذمہ ہوتی ہے۔ مگر ہم نے اس کی طرف سے غفلت برتی ہے اور ان سے ربط پیدا کر کے ان کے ذہن کو دینی بنانے کی کوشش نہیں کی۔ نئی تعلیم پانے والا طبقہ ہی عوام کی قیادت کرتا ہے۔ وہی حکومت و اقتدار کے مناصب پر پہنچتا ہے۔ اگر ان سے ہمارے علماء و مشائخ ربط رکھتے تو نتائج بہت اچھے ہوتے اور ہمیں یہ روزِ سیاہ نہ دیکھنا پڑتا۔ ہمارے ہاں تعلیم کا تناسب بہت کم ہے، اور اندازاً ۹۵ فیصد عوام جاہل ہیں۔ انہیں بہکالینا بہت آسان ہے۔ دیندار طبقہ خصوصاً علماء و مشائخ کو اس حقیقت سے باخبر ہونا چاہیے تھا۔ علی ہذا ملازمینِ حکومت اور حکام و افسران میں سب کے سب فاسد العقیدہ اور گمراہ تو نہ تھے۔ اکثر ہمارے ہم مذہب صحیح العقیدہ افراد کی تھی۔ ان میں تعلیم یافتہ بھی تھے اور جاہل بھی۔ اگر ہمارے علماء مشائخ ان سے خالصۃً لوجہ اللہ کسی دنیاوی غرض کے بغیر ربط پیدا کرتے تو ضرور اثر ہوتا اور کم از کم ان کا اجتماعی ذہن دینی ہو جاتا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی تدبیر سے ایک زبردست قومی ملحدانہ نظام و اقتدار میں بغیر کسی ہنگامے کے انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ اگر علماء و مشائخ ان کے نمونہ پر شروع سے عمل کرتے تو حالات بالکل مختلف ہوتے۔ مگر ان حضرات نے ان طبقات میں سے کسی سے بھی خالص دینی ربط نہیں قائم کیا۔ نہ انہیں دوست نما دشمنوں کے نفاق اور ان علامات سے آگاہ کیا جنہیں دیکھ کر عوام ان منافقوں کو پہچان لیتے اور ان کے فریب سے محفوظ رہتے۔ اس کے بجائے بعض علماء و مشائخ تو انہیں دوست نما دشمنوں اور منافقوں سے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے۔ اور ان کی مدح سرائی کر کے عوام کو ان کے جال میں پھنسنے کی عملاً ترغیب دیتے رہے۔

دوسری طرف ہمارے دشمن ہماری تباہی اور اپنے غلبے کی تدبیریں بہت ہوشیاری کے ساتھ کرتے رہے۔ ان تدابیر کی تفصیل طویل ہے۔ اور سب کا تذکرہ یہاں مقصود نہیں ہے۔ ان میں سب سے اہم اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے ہماری قومی ذہن کی تعمیر کو بہت قوت اور ہوشیاری کے ساتھ روکنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی پوری طاقت اس مقصد کے لیے صرف کر دی کہ ہمارا ذہن دینی نہ بننے پائے۔ غیر ملکی امداد و اعانت انہیں حاصل تھی۔ پروپیگنڈے کا طریقہ وہ جانتے تھے اور ان کے ذرائع انہیں وافر مقدار میں حاصل تھے۔ اُدھر ان کی یہ کوشش اور ادھر ہماری غفلت دونوں نے مل کر انہیں کامیاب کر دیا۔ اس کے نتیجے میں انہیں یہ کامیابی بھی حاصل ہوئی کہ ہماری قوم میں صوبائی، وطنی وغیرہ جاہلی عصبیتوں کو ابھار ابھار کر ہمیں آپس میں لڑاتے رہے۔

یہ ٹیکنیک بہت پرانی ہے۔ اور ہماری پوری تاریخ میں سینکڑوں بار اس کا تجربہ ہو چکا ہے، مگر ہمارے زعماء نہ تو تاریخ کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں نہ اس سے کوئی سبق لیتے ہیں، بلکہ اس سے نسیاً منسیاً کر کے فریب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ان دوگونہ اسباب کا اثر یہ ہوا کہ ہماری قوم کا اجتماعی ذہن دینی نہ بن سکا۔ بلکہ درحقیقت اس کا قومی ذہن ہی وجود میں نہیں آیا۔ ہر شخص اجتماعی مسائل کو دنیاوی اور انفرادی ذہن سے سوچتا ہے۔ جس قوم کا کوئی اجتماعی و قومی ذہن نہ ہو، وہ اسی قسم کے حادثوں کا شکار ہوئی ہے۔

اگر ہمارے 'قومی ذہن' کا وجود ہوتا اور دین پر مبنی ہونے کی وجہ سے یہ 'دینی ذہن' ہوتا تو وہ لوگ ہماری نگاہ میں رہتے جن سے غدر کا خطرہ ہوتا۔ ہماری بیدار مغزی اور ہمارے 'دینی قومی ذہن' کی ذکی الحسی کی وجہ سے انہیں غداری کرنے کی ہمت ہی نہ ہوتی۔ اور اگر ہوتی تو احترام سے پہلے ہم اتنے خاک کو خاک میں ملا دیتے۔ قومی پیمانے پر 'دینی ذہن' کا فقدان درحقیقت ہماری اصل کمزوری اور اس المیے کے وقوع کا بنیادی سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے عوام کا حال یہ ہے کہ وہ 'دنیاوی ذہن' سے سوچتے ہیں۔ اس لیے جو ہوشیار شخص انہیں دنیاوی منافع کا سبز باغ دکھاتا ہے اس کے پیچھے چلنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس بات پر ان کی نظر ہی نہیں جاتی کہ اس شخص کا مذہب کیا ہے؟ اس کے دینی عقیدے کیا ہیں؟ اور اس کی عملی زندگی شریعت اسلامیہ کے مطابق ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے دینی اعتبار سے اس کی کیا حیثیت ہے؟

مصیبت بالائے مصیبت یہ ہے کہ ہمارے سیاسی قائدین نے پچیس سال کی مدت میں عوام الناس میں سیاسی فہم بھی پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے بجائے وہ ان کے جذبات سے کھیلتے رہے۔ اور انہیں ابھار ابھار کر اپنا کام نکالتے رہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ ہر اس شخص کے پیچھے چلنے لگے ہیں جو دل خوش کن وعدے کر سکے اور خطابت و نعرہ بازی میں ممتاز ہو۔ ان کا ذہن اس قابل ہی نہیں ہے کہ جھوٹے اور سچے وعدوں کے درمیان امتیاز کر سکے۔ اور اپنے

مصالح و مفاسد کو بھی سمجھانے پر بھی سمجھ سکے۔ انہیں فریب دینا اور غلط راستوں پر ڈال دینا آسان ہے۔ ہمارے دوست نما دشمنوں اور منافقوں کے جو گروہ موجود ہیں وہ ان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر انہیں کے ہاتھ سے انہیں تباہ کر دیتے ہیں۔ اور ان کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا کہ ہمارے تباہ کرنے والے کون ہیں؟ دوست و دشمن میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے وہ محروم ہیں۔ یہ صرف جاہلوں کا حال نہیں ہے بلکہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بھی اسی سادہ لوحی میں مبتلا ہے اور بہت آسانی کے ساتھ بد مذہب منافقوں کے فریب کا شکار ہو کر خود اپنی تباہی و بربادی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

یہ ہے ہمارے علماء و مشائخ اور سیاسی قائدین کی داستانِ غفلت جو مختصراً پیش کی گئی ہے۔ لیکن ناسپاسی ہو گی اگر ان علماء و مشائخ کی ستائش نہ کی جائے جو اس دور غفلت میں بھی 'دینی ذہن' بنانے اور قوم کی غفلت کو دور کر کے منافق گروہوں کی نقاب کشائی کرنے میں مصروف رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے اس گراں قدر عمل صالح کا اجر جزیل عطاء فرمائے۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ انہیں اپنی بات کی اشاعت اور اسے مؤثر بنانے کے ذرائع اور وسائل بھی حاصل نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ ان سے دوسرے علماء و مشائخ نے کوئی تعاون نہیں کیا بلکہ بعض نے ان کی مخالفت کی، اس لیے ان کی بات مؤثر نہ ہو سکی۔ اور پوری قوم تو کجا اس کا عشر عشیر حصہ بھی اس سے متاثر نہ ہوا۔

یہ عرض کر دوں کہ اس مضمون کا مقصد کسی پر طعن و طنز نہیں ہے، اس مصیبت کے موقع پر طعن و ملامت کسی طرح مناسب بھی نہیں ہے، جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ الدین النصیحۃ کی تعمیل اور اسی جذبہ کا اثر ہے۔ علماء و مشائخ کی جماعت امت کی بہترین جماعت ہے۔ اخلاص و خیر خواہی کی بنا پر چند سطریں اس جماعت کے متعلق بھی لکھنا چاہتا ہوں، جس نے پاکستان بننے سے کچھ دن پہلے ہی سے 'اسلامی نظام' اور 'خلافت الہیہ' کی دعوت دینا شروع کر دی تھی۔ ان حضرات سے میں عرض کروں گا کہ ۲۵ سال کی مدت میں ان کی منزل مقصود کچھ قریب ہوئی ہے یا اور دور ہو گئی؟ اگر وہ چشمِ انصاف سے دیکھیں تو نظر آئیگا کہ منزل روز بروز دور ہوتی جا رہی ہے، یہ حقیقت ان کی نگاہ سے اوجھل ہو گئی کہ اسلامی نظام کا تصور صرف 'دینی ذہن' کر سکتا ہے۔ دنیاوی ذہن یہ الفاظ تو دہرا سکتا ہے مگر اس کے صحیح مفہوم کو نہ پورے طور پر سمجھ سکتا ہے نہ اسے عملی شکل دینے کے لیے آمادہ ہو سکتا ہے۔ انہیں پہلے قوم کے ذہن کو دینی بنانا چاہیے تھا اس کے بعد اسلامی نظام کے قیام میں کوئی دشواری نہ پیش آتی۔ موٹی سی بات ہے کہ جو ذہن اجتماعی مسائل کو دینی زاویۂ نظر سے دیکھتا ہی نہ ہو وہ اسلامی نظام کو کس طرح پسند کر سکتا ہے؟ اور اس کا صحیح تصور کیسے کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نعرے کا یہ اثر تو نہ ہوا کہ قوم اجتماعی و سیاسی مسائل کو دینی زاویے سے دیکھنے لگتی البتہ اس کے برعکس کثیر تعداد اس بیماری میں مبتلا ہو گئی کہ وہ دین کو سیاسی زاویے سے دیکھنے لگی۔

نعرہ لگانے والوں کا اجتماعی دین بھی دنیاوی رہا۔ اس زاویۂ معکوس نے اس میں جگہ پا کر اور قیامت ڈھائی اور وہ شدید غلطیوں کا شکار ہو گئے۔ ان میں قابلِ ذکر وہ غلطی ہے جو اس زاویۂ معکوس کے ساتھ تاریخ کے سطحی مطالعے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جس نے ان کی دعوت میں تضاد پیدا کر کے اسے خود کشی پر مجبور کر دیا۔ میرا اشارہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر تنقید اور ان کی تنقیص کی طرف ہے جو اس جماعت کی طرف سے ہوتی رہتی ہے، جس سے اس کا یہ مزعومہ نظریۂ پیدا ہوا کہ اسلامی نظام تیرہ سو برس کی مدت میں صرف تیس سال قائم رہا۔ اس نظریہ اور اسلامی نظام کی دعوت میں کھلا ہوا تضاد ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو نظام بانیٔ نظام نبی کریم ﷺ کے صحابی بھی قائم نہ رکھ سکے، اور جو صرف تیس سال رہ کر ناپید ہو گیا، وہ نظری طور پر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، مگر اسے عملاً ممکن کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اور جب اس کا قیام عملاً ممکن نہیں ہے تو اس کے لیے جدوجہد کرنا ہر عاقل کے نزدیک فضول، اضاعتِ وقت و قوت ہے۔ صحابہ کرامؓ پر تنقید کرنے کے بعد اس اعتراض کا کوئی جواب ممکن نہیں ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ طعن و طنز مقصود نہیں ہے۔ بلکہ دعوتِ فکر و عمل پیش نظر ہے۔ ان حضرات سے میری گزارش ہے کہ اس مسئلہ پر غور کریں۔ اور اگر بات سمجھ میں آ جائے تو اپنے پچھلے طرزِ عمل پر نظر ثانی کر کے غلطیوں کی تلافی کی کوشش کریں۔

اب کیا کرنا چاہیے؟ وقت بہت گزر چکا ہے اور ہماری غفلت نے ہمیں یہ دن دکھایا ہے۔ تاہم ہمت نہ ہارنا چاہیے۔ اگر ہم اخلاص وللّٰہیت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی نیت کے ساتھ غفلت سے باز آ جائیں اور اصلاح حال کی پوری کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ امید ہے کہ وہ ہماری نصرت فرمائیں گے۔ اور ہم مزید سزا سے بچ کر اللہ تعالیٰ کے انعام سے بھی سرفراز ہوں گے۔ اس کے لیے اصولی طور پر جو لائحہ عمل سمجھ میں آتا ہے وہ درج ذیل ہے۔ اس کے مطابق عمل ہو جائے تو انشاء اللہ ہم بہت کامیاب ہوں گے اور غیبی امداد ہوا کا رخ یکسر بدل دے گی۔

1. حضرات علماء و مشائخ خصوصاً اور ان کی نگرانی میں عام دیندار مسلمان عموماً اہل سنت میں دین داری کی ترویج میں اپنی امکانی استطاعت و قوت صرف کر دیں اور اس کوشش میں مسلسل لگے رہیں۔ سب سے زیادہ توجہ نماز کی پابندی اور گناہوں خصوصاً فواحش سے باز آنے پر دیں۔
2. بریلویت، دیوبندیت، مقلدیت، وغیر مقلدیت کے اختلافات کو کم از کم کچھ مدت کے لیے بالائے طاق رکھ دیں۔ اور ہر مکتب فکر کے علماء و مشائخ اہلسنت ہر قسم کے ملکی و سیاسی اختلافات کو فراموش کر کے متحد ہو جائیں اور قوم کے ذہن کو دینی بنانے کی جدوجہد میں ایک دوسرے کے دوش بدوش کام کریں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ علماء کے درمیان ملکی و سیاسی اختلافات نے جو حدود کو پار کر لیا ہے، اس کا ایک اثر یہ ہے کہ عوام خصوصاً تعلیم یافتہ طبقہ کے ایک معتد بہ گروہ میں علماء بیزاری پیدا ہو گئی ہے۔ اس بیماری کا مہلک اور خطرناک ہونا محتاج تصریح

نہیں ہے۔ علماء کا فرض ہے کہ وہ اپنے اختلافات مٹا کر یا کم از کم انہیں حدود کے اندر لا کر اس جماعت کو اس بیماری سے نجات دلوائیں۔

3. دینی ذہن بنانے میں دو چیزوں کو سب سے زیادہ دخل ہے۔

أ. اول آخرت کا استحضار؛ آخرت ہی کا یقین وہ چیز ہے جس پر شیطان کے وار روکے جاسکتے ہیں اور یہی مومن کو ہر حالت میں دین پر قائم رکھ سکتا ہے۔ مرنے کے بعد کی زندگی کا جس قدر استحضار ہوگا، اسی قدر انسان دینی زاویے سے دیکھنے کا خوگر ہوگا۔ اس لیے مسلمانوں میں آخرت کا یقین بڑھانے اور اس کا استحضار پیدا کرنے کی بھی کوشش کرنا چاہیے۔

ب. دوم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عقیدت و محبت؛ کیونکہ وہی ہمارے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطۂ کبریٰ ہیں اور کتاب و سنت کا عملی نمونہ ہیں۔ ان کے اوپر بھی ایسے احوال گزرے جو ہم پر گزرتے ہیں مگر باوجودیکہ وہ معصوم نہ تھے، کسی حالت میں بھی انہوں نے حدودِ شرعیہ کو پار نہیں کیا۔ اور ہر مسئلے کو صرف 'دینی ذہن' سے سوچا اور دین ہی کی رہنمائی میں ہر مشکل کا حل نکالا۔ ان سے عقیدت و محبت مومن میں 'دینی ذہن' پیدا کرنے کی ضامن ہے۔ ان کے ساتھ عقلی و جذباتی تعلق ہمارے اندر 'نسبت' کی حمیت پیدا کر سکتا ہے۔ جو بعض اوقات چند لمحات میں دینی ذہن کی تعمیر کر دیتی ہے۔ اور جس کا فقدان ہماری تباہی و بربادی کا ایک بنیادی سبب ہے۔ ہمیں پوری کوشش کرنا چاہیے کہ ہمارے سنی بھائیوں کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے وہی عقیدت و محبت حاصل ہو جائے جس کے یہ نفوسِ قدسیہ مستحق ہیں۔

4. علماء و مشائخ اور ان کے مشورے سے دینی شعور رکھنے والے مسلمان خصوصاً اونچے درجے کے جدید تعلیم یافتہ دیندار حضرات عوام سے دینی ربط جلد از جلد اور بقدرِ امکان زیادہ سے زیادہ پیدا کریں۔ یہ ربط عام مسلمانوں کے ہر طبقہ کے ساتھ قائم کیا جائے۔ تعلیم یافتہ طبقہ سے بھی، اور جاہل عوام سے بھی۔ طلبہ، مزدوروں، کاشتکاروں، زمیندار، ملازمین حکومت، امراء، رؤساء، تجار وغیرہ کسی طبقہ اور گروہ کو فراموش نہ کیا جائے۔ سب سے خالصةً لوجہ اللہ ربط پیدا کر کے ان کے ذہن کو دینی بنانے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کرنے کی سعی بلیغ کی جائے۔ جب قوم کا اجتماعی ذہن دینی ہو جاتا ہے تو ایک دینی فضا بن جاتی ہے۔ جس کا اثر انفرادی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ اور افراد بھی بقدرِ صلاحیت دینی ترقی کرتے ہیں اور صالحین کی تعداد بڑھتی ہے۔ گنہگار بھی گناہ کو گناہ سمجھ کر اس کا ارتکاب کرتے ہیں، اور اس پر نادم بھی ہوتے ہیں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ ہمارے ملک کے اکثر و بیشتر باشندے علم سے محروم ہیں۔ پاکستان میں تعلیم کا تناسب غالباً ۵ فیصد بھی نہیں ہے۔ اس لیے محض مضامین لکھنا اور قلمی خدمت کرنا کسی طرح کافی نہ ہوگا بلکہ وعظ و تقریر، جلسے، چھوٹی مجلسیں، شخصی ملاقاتیں وغیرہ جملہ ذرائع استعمال کرنا لازم ہیں۔ مساجد میں تقریریں بھی کافی نہیں ہیں۔ شدید ضرورت ان لوگوں تک پہنچنے کی ہے جو مساجد کا رخ ہی نہیں کرتے۔ ان کے گھروں اور مجلسوں تک ہمیں پہنچنا چاہیے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ صرف شہروں تک کام کو محدود کر دینا مناسب نہیں ہے بلکہ دیہاتوں میں بھی پہنچنا اور وہاں کی آبادی کے ساتھ ربط پیدا کرنا بھی بہت اہم اور ضروری ہے۔

5. ان سب چیزوں کے ساتھ نہایت الحاح و زاری کے ساتھ بارگاہِ ارحم الراحمین میں پاکستان اور ملت اہلسنت والجماعۃ کی سلامتی و حفاظت اور غلبہ کے لیے دعاء کا التزام ہونا چاہیے۔ ختم آیۃ کریمہ یا ختم خواجگاں اور اس قسم کے دیگر اذکار و ادعیہ کا سلسلہ جاری رکھنا ان شاء اللہ مفید و نافع ہوگا 'یا سلام' کا ورد بھی مفید ہے۔ بہر کیف الحاح کے ساتھ دعاء لازم ہے۔

حالات دیکھتے ہوئے ایک فیصد بھی اس کی توقع کرنا مشکل ہے کہ حضرات علماء و مشائخ میری اس عرضداشت کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ عمل کرنا تو بڑی چیز ہے، مجھے تو اس کی توقع بھی بہت کم حضرات سے ہے کہ وہ اس مضمون کو غور سے پڑھیں گے۔ تاہم میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔

إن أريد إلا الإصلاح مااستطعت وما توفيقي إلا بالله عليه توكلت.

☆☆☆☆☆

بقیہ: اک نظر ادھر بھی

وسیم رضوی نے جنوری ۲۰۱۸ء میں وزیر اعظم مودی اور اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی ادتیا ناتھ کے نام ایک خط میں اپیل کی تھی کہ ملک کے تمام مدارس کو بند کر دیا جائے، کیونکہ اس کے بقول ان مدارس میں طلبہ کو دہشت گردی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس نے یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ مدارس میں طلبہ کو دہشت گردی کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔

وسیم رضوی نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ متنازع مساجد کو ہندوؤں کے حوالے کر دیں۔ اس ملعون نے بابری مسجد کو بھارت کی سرزمین پر کلنک کا ٹیکہ قرار دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

اقتدار کا لالچ: تقسیمِ پاکستان اور شیخ مجیب

ابو ہود بنگالی

وسطِ اگست ۱۹۴۷ء میں برِّصغیر ہندو اور مسلم قومیت کی بنیاد پر تقسیم ہوا۔ اسی قومی نظریے کی بنیاد پر سندھ، پنجاب، کشمیر و بنگال تقسیم ہوئے اور پاکستان و بھارت کا حصّہ بن گئے۔ بھارت سے پاکستان ہجرت کے دوران ان گنت مسلمانوں نے اپنی جانوں کی قربانیاں دیں۔ لیکن محض چوبیس سالوں میں ہی دو صدیوں کی محنت اور قربانیوں پر پانی پھیر دیا گیا اور بے شمار قربانیاں دے کر حاصل کیا گیا ملک اور وحدت اپنی سالمیت کھو بیٹھی۔

بھارتی ہندوؤں کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے بنگال کے جن مسلمانوں نے گیارہ سو میل دور دار الحکومت کا اختیار تسلیم کر کے مشرقی پاکستان تشکیل دیا تھا، وہ مشرقی پاکستان بھارت کی ایک غیر اعلانیہ باج گزار ریاست میں کیوں اور کیسے تبدیل ہو گیا؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے بے شمار تفصیلی تجزیے ہو چکے...... سٹیج پر نظر آتے کرداروں سے لے کر پس پردہ کرداروں تک......بہت سی کہانیاں، تبصرے، تجزیے اور تنقید ہوتی رہی۔

ابھی چند ماہ پیشتر بنگلہ دیش کی حکمران جماعت عوامی لیگ کی صدر شیخ حسینہ نے اپنے باپ شیخ مجیب الرحمن کی یومِ پیدائش پر جشن منایا جس میں گجرات کے قصائی ہندوستانی وزیر اعظم نریندر مودی کو بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہونا فطری امر ہے کہ شیخ مجیب کی سالگرہ کی خوشی سے وزیر اعظم بھارت کا کیا تعلق ہے جو اسے بطورِ خاص مدعو کیا گیا؟

حقیقت یہ ہے کہ عوامی لیگ اور شیخ مجیب کی بھارت سے محبت اور یارانہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کا اولین پھل مملکتِ پاکستان (مشرقی و مغربی) کی تقسیم ہے۔ یہ تاریخ اگر دل کی آنکھوں سے نہ پڑھی جائے تو اس خطے میں ہندو جارحیت کی حقیقت و نوعیت اور اس کی شدت کو محسوس کرنا اور اس کا ادراک کرنا مشکل ہے۔

اس مضمون میں ہم پاکستان کے دولخت ہونے کے پیچھے کار فرما پاکستانی و ہندوستانی حکمرانوں کے کرداروں کے بارے میں مختصر گفتگو کرتے ہوئے بنگلہ دیش کے رہنما شیخ مجیب کے کردار پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

اس بات کا انکار کرنا ناممکن ہے کہ پیدائشِ پاکستان کے وقت سے ہی پاکستان پر قابض حکمران طبقہ امریکہ کے لیے دلالی کر کے اقتدار حاصل کرنے اور اسے برقرار رکھنے کا برہنہ کھیل کھیلتا رہا ہے۔ اقتدار کے بھوکے ان حکمرانوں اور فوجی جرنیلوں نے اپنے اپنے ذاتی مفادات کے حصول کو یقینی بنانے کے لیے ایک کفری آئین کو ملک میں نافذ کرتے ہوئے پاکستان کے طول و عرض میں ظلم کا بازار گرم کیا۔ مغربی خداؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جتنی پالیسیاں بنانا اور نافذ کرنا ممکن تھا، انہوں نے کر کے دکھائیں۔ اسی غلامی کے عوض اس وقت کے امریکی صدر آئزن ہاور (Dwight D. Eisenhower) نے ۱۹۵۴ء میں پاکستان کو نہ صرف فوجی امداد فراہم کی بلکہ سیٹو (SEATO) میں بھی شامل کیا۔

مگر عوام کو عدل و مساوات سے محروم کر کے اور ان پر ظلم و جبر کر کے کب تک ان کو اپنا تابع فرمان بنا کے رکھا جا سکتا ہے؟ بالخصوص جب حکمرانوں اور عوام کے مابین گیارہ سو میل کا فاصلہ بھی حائل ہو (یہاں ہماری مراد ’حکمران‘ ہی ہیں، مغربی پاکستان کے عوام کو حکمران نہ سمجھا جائے)۔ پھر وہ ملک کہ جس کو بنانے کے لیے لوگ اسلام کے نام پر جمع ہوئے تھے، جس کی اساس لا الٰہ الا اللہ تھی، اور جس کی خاطر مسلمانانِ برِّصغیر نے بے شمار قربانیاں دی تھیں، اس ملک کے حکمرانوں نے محض اقتدار کی خاطر نہ صرف امریکی خداؤں کی غلامی کی، بلکہ ان کے ساتھ ساتھ دنیا کی دوسری سپر پاور روس اور ہمسایہ ملک چین کی خوشنودی حاصل کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی پاک سرزمین پر کمیونزم کا باطل نظریہ پھیلنے لگا۔ مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں کمیونسٹوں کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا اور وہاں سوویت پسند کمیونسٹوں کو ایک مضبوط پناہ گاہ میسر آ گئی۔

دوسری جانب تقسیمِ ہند کے کچھ ہی عرصے بعد چین سے شکست خوردہ بھارت نے شکست کے جھٹکے سے سنبھلنے کے لیے کسی بھی سپر پاور سے الحاق نہ کرنے کے اپنے فیصلے سے تائب ہو کر سوویت روس کے ساتھ ایک اتحاد قائم کیا۔ پھر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد تو امریکہ نواز پاکستان کے خلاف قوت و امداد حاصل کرنے کی خاطر بھارت روس کے اس قدر قریب آ گیا کہ خطے میں سوویت یونین کا قریب ترین حلیف گردانا جانے لگا۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۷ء تک کے اس دور کو ہند و سوویت تعلقات کا سنہرا دور سمجھا جاتا ہے۔

اپنے پیدائشی دشمن پاکستان کو ٹکڑوں میں بانٹنے کی بھارتی سازش کتنی پرانی ہے، اس کا ایک ثبوت ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ملتا ہے جب مغربی پاکستان کے ساتھ براہِ راست جنگ و تصادم شروع ہونے کے باوجود بھارت نے مشرقی پاکستان کو نشانہ نہیں بنایا۔

۱۹۷۱ء کے مارچ میں شروع ہونے والے واقعات میں مغربی پاکستان کے حکمرانوں، بھارتی سرکار اور شیخ مجیب کی عوامی لیگ، سب کے بنیادی مقاصد گو کہ جدا جدا تھے، مگر ان مقاصد کا حصول ایک ہی طریقے سے ممکن تھا اور وہ تھا مملکت ہائے متحدہ پاکستان کی مرکز سے دور، ۷ کروڑ بنگالی مسلمانوں پر مشتمل چھوٹی آبادی (مشرقی پاکستان) کو الگ کر دینا۔

مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی مشرقی پاکستان کے خلاف تفریق و امتیاز پر مبنی پالیسیوں اور رویّے کے نتیجے میں......بالخصوص جنرل ایوب خان اور جنرل یحییٰ خان کی پالیسیوں نے......مشرقی پاکستان میں بھارتی مداخلت اور شیخ مجیب کی عوامی لیگ کی سربراہی میں ایک جمہوری، سوویت نواز ملک کی بنیاد رکھی۔ تاریخ جو ثبوت فراہم کرتی ہے ان کی روشنی میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت و سوشلزم جیسے نظریات کو اساس بناتے ہوئے، بنگلہ دیش کے نام سے جس ریاست کی بنا رکھی گئی، اس ریاست کو بنانے کے خفیہ منصوبے میں پہلا قدم شیخ مجیب اور اس کے قریبی ساتھیوں نے اٹھایا۔ جبکہ اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بھارتی و پاکستانی حکومتیں 'کنٹرولر' کا کردار ادا کرتی رہیں۔

۱۹۶۱ء کے اواخر میں، مشرقی پاکستان کی آزادی کا مطالبہ کرنے والا ایک پرچہ ''مشرقی بنگال آزادی فرنٹ'' کے نام سے انگریزی و بنگالی زبانوں میں چھاپا گیا۔ شیخ مجیب الرحمان کے قریبی اور قابلِ اعتماد ساتھی شیخ معظم حسین کے مطابق، شیخ مجیب خود سائیکل پر بیٹھ کر پریس تک جاتے اور اس پرچے کی کاپیاں چھپوا کر لاتے، جنہیں پھر رات کی تاریکی میں بہت سے طلبہ رہنماؤں میں اور اہم مقامات پر تقسیم کیا جاتا۔

لگ بھگ انہی دنوں میں، شیخ مجیب نے کمیونسٹ پارٹی کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں، مگر اصولی طور پر یہ آزاد مشرقی پاکستان کے مطالبے کی حمایت کرنے کے باوجود کمیونسٹ پارٹی نے عملی طور پر کسی قسم کے تعاون سے معذرت یہ کہتے ہوئے کی کہ حالات ابھی ایسے کسی کام کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ شیخ مجیب نے وقت آنے پر ساتھ دینے کے مطالبے پر یہ مجلس ختم کی۔

اس واقعے کے دو یا تین ماہ بعد ہی ملک میں حکومت کے خلاف ایک شدید تحریک زور پکڑ گئی جس کے نتیجے میں حکومتِ پاکستان پیچھے ہٹ گئی۔ اس تحریک سے حاصل ہونے والے نتائج کو دیکھتے ہوئے اقتدار کا بھوکا اور ہندوستان کا عاشق، شیخ مجیب الرحمان مزید پر امید ہو گیا، اور اسی سال (یعنی ۱۹۶۲ء) کے دسمبر میں ڈھاکہ میں موجود اس وقت کے ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر کے پولیٹیکل آفیسر شیکھر بینر جی کو آدھی رات میں بلا کر اس سے ایک خفیہ ملاقات کی۔ اس ملاقات کا مقصد بینر جی کے ذریعے بھارتی وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو تک ایک خفیہ پیغام پہنچانا تھا، جس میں ایک منصوبے کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ منصوبہ مشرقی پاکستان کو پاکستان سے آزاد کرانے کا تھا۔ منصوبے کے مطابق مجیب بنگال میں تحریکِ آزادی کی قیادت کرنا چاہتا تھا جبکہ مانک میاں اتحاد رسالے کے ذریعے اس تحریک کو پھیلانے کا کام کریں گے۔ ۱۹۶۳ء کے مارچ میں شیخ مجیب لندن میں بنگلہ دیش کی آزادی کے اعلان کے ساتھ ملک میں ایک غیر ملکی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اپنے اس خط میں مجیب الرحمان نے نہرو سے اخلاقی، سیاسی اور سفارتی امداد کے ساتھ ساتھ اس منصوبے کو قابلِ عمل بنانے کے لیے ساز و سامان اور امداد کی درخواست کی تھی، نیز اس معاملے پر مشاورت کے لیے نہرو سے خفیہ ملاقات کی اجازت مانگی تھی۔

یہ خط ایک ایسے وقت میں بھیجا گیا جب ہندوستان حال ہی میں چین سے جنگ میں شکست کھا چکا تھا۔ اس شکست کے بعد نہرو اپنے لیے ایک اور محاذ نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ دہلی سے اس پیغام کا جواب یہ آیا کہ ابھی مجیب کچھ اور انتظار کرے۔ لیکن محض ہندوستانی امداد کی امید نے ہی مجیب کو اس قدر بے صبر ابنا دیا کہ وہ مزید انتظار کرنے کے بجائے سرحد عبور کر کے ہندوستان کی ریاست تریپورہ کے دارالحکومت اگر تلہ جا پہنچا، جہاں اس نے وزیرِ اعلیٰ تریپورہ سچندر لال سنگھ سے ملاقات کی اور اسے نہرو تک پیغام رسانی کے لیے آمادہ کیا۔

سچندر مجیب کو اگر تلہ میں چھوڑ کر دہلی پہنچا اور وہاں نہرو سے ملاقات کرنے کے بعد لوٹا۔ اگر تلہ واپسی پر سچندر نے مجیب الرحمان کو بتایا کہ اس کے ساتھ مدد و تعاون کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور ڈھاکہ میں موجود بھارتی ڈپٹی ہائی کمیشن کو اطلاع کی جا چکی ہے۔ نہرو کا مشورہ تھا کہ اس کے بعد شیخ مجیب رابطے کے لیے اگر تلہ کے بجائے ڈھاکہ میں موجود بھارتی سفارت خانے ہی کو استعمال کرے۔

بھارت سے گرین سگنل ملنے کے باوجود شیخ مجیب پاکستان سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بعض بنگالی فوجی گروپوں کی خواہش کے مطابق مسلّح جدوجہد کے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اس کی وجہ جہاں بعض بین الاقوامی قوانین تھے، وہیں سب سے بڑی اور فیصلہ کن وجہ یہ تھی کہ گو کہ بھارت مدد و تعاون کے لیے تیار تھا، مگر ایک بھرپور مسلّح جدوجہد یا پاکستان کے ساتھ ایک مکمل جنگ کا محاذ کھولنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بھارت کے بغیر شیخ مجیب کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے اپنے فوجی گروپ کے کمانڈر، پاکستان نیوی کے بنگالی افسر لیفٹیننٹ کمانڈر معظم حسین کو بتا دیا کہ وہ ''......ملک کو پاکستانی فوجی جنتا کے ہاتھوں سے نکال کر بنگالی فوجی جنتا کے سپرد نہیں کر سکتا......''۔

شیخ مجیب کی اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مطلوب و مقصود بنگالی مفادات کا تحفظ نہیں بلکہ ہندوستانی مفاد کا تحفظ تھا۔ اگر تلہ کا سفر بھی اسی الزام کو ثابت کرتا ہے اور بعد میں اسی بنیاد پر جنرل ایوب خان نے اسے گرفتار بھی کیا اور اس پر مقدمہ چلایا۔

اگر تلہ سازش کے مقدمے میں شیخ مجیب کے ساتھ ۳۴ دیگر افراد کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ مقدمے میں ان کے مقابل ریاستِ پاکستان خود تھی۔ اس مقدمے میں شیخ مجیب اور اس کے ساتھیوں کو بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کی سالمیت پر حملہ کرنے اور مشرقی پاکستان کو ایک فوجی تحریک کے ذریعے علیحدہ کرنے کی ایک سازش میں ملوث ہونے کا الزام تھا۔ مگر چونکہ مشرقی پاکستان کی عوام پہلے ہی حکومت کے رویّے سے نالاں اور بدظن تھی، اور جانتی تھی کہ شیخ مجیب کو علیحدگی پسند اور بھارت نواز ثابت کرنا حکومت کے مفاد میں ہے لہٰذا ملک بھر میں اس مقدمے کو مشرقی پاکستان کی تحریکِ خود مختاری کے خلاف ایک سازش کے طور پر دیکھا

جانے لگا اور اس کے نتیجے میں مظاہرے، احتجاج اور فسادات برپا ہو گئے، جن کی وجہ سے حکومتِ پاکستان کو مجبور ہو کر یہ مقدمہ بند کرنا پڑا اور شیخ مجیب باعزت بری ہو گیا۔

اس کے باوجود ۲۲ فروری ۲۰۱۱ء کو، اس مقدمے کو واپس لینے / ختم کرنے کی برسی کے موقع پر، ملزمین میں سے زندہ بچ جانے والے ملزم اور اس وقت کے بنگلہ دیش پارلیمنٹ کے ڈپٹی سپیکر شوکت علی نے کھلے بندوں یہ اعتراف کیا کہ 'اگر تلہ مقدمہ سازش نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ ہم پر (شیخ مجیب اور اس کے ساتھ ۳۴ دیگر ساتھیوں پر) جو الزامات مقدمے میں عائد کیے گئے تھے، وہ سب درست تھے'۔

اس کے بعد شیخ مجیب ہر کام ہندوستانی سرکار کے مشورے و رضامندی سے کرنے لگا۔ ابتدا میں حکومت سے محض مشرقی پاکستان کو خود مختار کر دینے کا مطالبہ کیا گیا، مگر اس کے ذہن میں جو منصوبہ پرورش پا رہا تھا، اسے مد نظر رکھ کر ملک میں ایک قوم پرست سوچ و فکر پھیلائی جانے لگی۔ کچھ ہی عرصے بعد شیخ مجیب نے اپنی جماعت 'عوامی مسلم لیگ' کے نام سے 'مسلم' ہٹا کر فقط 'عوامی لیگ' کر دیا، حالانکہ جماعت کی تشکیل کے موقع پر یہ نام بھی خود شیخ مجیب ہی کا تجویز کردہ تھا۔ یہ مشرقی پاکستان میں مجیب کی سیکولر سوچ و فکر کا عکاس پہلا قدم تھا۔

بھارت کے لیے مشرقی پاکستان میں اپنے مفادات کا تحفظ ایک ہی طریقے سے ممکن تھا، اور وہ تھا مشرقی پاکستان میں ایک خود مختار، بھارت نواز حکومت کا قیام۔ اس سلسلے میں شیخ مجیب بھارت کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا۔ شیخ مجیب کے چھ نقاط جن کا بنیادی مطالبہ حکومتِ پاکستان سے مشرقی پاکستان کے لیے خود مختاری کا حصول تھا، نے تقریباً ہر جماعت کو قائل کر لیا، حتیٰ کہ کمیونسٹ پارٹی بھی شیخ مجیب کا ساتھ دینے پر تیار ہو گئی۔ یہ بات اس وقت بھی یقینی تھی کہ مشرقی پاکستان کے پاکستان کا ایک خود مختار صوبہ بننے کی صورت میں وہ درحقیقت بھارت کی ایک غیر رسمی و غیر اعلانیہ ریاست میں تبدیل ہو جائے گا۔ شیخ مجیب بظاہر تو بنگالی مسلم عوام کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بنگالی قومیت کا نعرہ بلند کرتا مگر بالاصل اس نعرے کے پیچھے ایک دوسری جدوجہد بھی جاری تھی۔ اور وہ جدوجہد تھی ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملا کر بھارت کی اخلاقی، فوجی و سفارتی حمایت حاصل کر کے مشرقی پاکستان میں اقتدار کے حصول کی۔

مجیب الرحمٰن کی منزلِ مقصود تو ہمیشہ سے ہی بھارت کی مدد سے مشرقی بنگال میں ایک آزاد و خود مختار حکومت قائم کرنا اور اس حکومت کے ذریعے اپنے سیکولر افکار و نظریات کو فروغ دینا تھا۔ سمندری لہروں سے مغلوب مشرقی بنگال کے تباہ حال مسلمانوں کے لیے مغربی پاکستان کے حکمرانوں کا سلوک سوتیلی ماں سے بدتر تھا۔ ۱۹۷۰ء میں آنے والے اور بڑے پیمانے پر تباہی مچانے والے سمندری طوفان 'بھولا' کے نتیجے میں ہزاروں بنگالی متاثر ہوئے تھے، اور ان مظلوم و مسکین بنگالیوں کے ساتھ حکومت کا رویہ بے رحمی کی حد تک لاپرواہ و نظر انداز کرنے والا تھا۔ اس رویّے و سلوک کا نتیجہ جلد ہی انتخابات میں شیخ مجیب کی عوامی لیگ کی زبردست کامیابی کی صورت میں سامنے آیا۔ اس وقت اگر شیخ مجیب کو انتخابات کے نتائج کے مطابق پورے پاکستان کا اقتدار حاصل ہو جاتا تو وہ ایک خود مختار مشرقی پاکستان کا مطالبہ بھی ترک کر دیتا، یا اگر محض مشرقی پاکستان کا اقتدار ہی حاصل ہو جاتا تو وہ ایک بھارت و سوویت نواز وزیرِ اعلیٰ بننے پر قانع ہو تا۔ مگر اس وقت کا حکمران جنرل یحییٰ خان اور مغربی پاکستان میں بھاری اکثریت حاصل کرنے والی پیپلز پارٹی کا لیڈر ذوالفقار علی بھٹو اور دیگر لیڈر نہیں چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان کا کوئی لیڈر پاکستان میں حکومت و اقتدار کی مسند تک پہنچے۔ لہٰذا مارچ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں اس جنگ کا آغاز ہو گیا جس میں لاکھوں مسلمانوں کو بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ پاکستان کی فوجی حکومت کی جانب سے فوج کو اشارہ دے دیا گیا اور ایک ہی رات میں مختلف مقامات پر ہزاروں بنگالی مسلمان قتل ہوئے اور عورتوں کو بے رحمی سے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔

اس جارحیت کے جواب میں پاکستانی حکمرانوں اور جرنیلوں نے مشرقی پاکستان کی عوام کے پاس جنگ کے سوا کوئی دوسرا راستہ چھوڑا ہی نہ تھا۔ ان حکمرانوں اور جرنیلوں کی بداعمالیوں، ان کے ظلم و ستم اور ان کی دھوکہ دہی کا شیخ مجیب نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور برِّ صغیر میں موجود اسلام اور مسلمانوں کے ازلی و کٹر دشمن 'ہندو' کے لیے مغربی پاکستان کے مسلمانوں کی مدد و حمایت سے جدا، ہندوؤں کی غلامی و بالا دستی قبول کرنے والا ایک ملک وجود میں لانا ممکن ہو گیا۔ پہلے سے طے شدہ منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز ہوا۔ بھارت کی براہِ راست مداخلت اور مشرقی بنگال کے بے شمار مسلمانوں کی جانوں کی قربانیوں کے بعد آزاد بنگلہ دیش قائم ہوا۔ بھارت کا ماتحت ایک ایسا ملک جس کے پانی، فصلوں، وسائل اور مال و دولت میں سے آج بھارتی حکمران مغربی پاکستان کے حکمرانوں سے کہیں زیادہ سختی سے اپنا حصّہ وصول کرتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے مظلوم مسلمان پاکستانی حکمرانوں کے ظلم و ستم سے نکل کر بھارتی ہندوؤں کی لوٹ مار کا شکار ہونے لگے جس کا سلسلہ بدقسمتی سے آج تک جاری ہے۔

اس خطے میں دین سے محبت رکھنے والے مسلمانوں کا بنگالی قومیت کا خواب بہت جلد ختم ہو گیا۔ ریاستی اعتبار سے ہندوستانی نظر بندی کی ذلت آمیز حقیقت ان کے سامنے آ گئی، شیخ مجیب ایک بھارتی ایجنٹ کے طور پر شناخت ہوا، اور بارہا اس کے سیکولر سیاسی اقدامات کو عوام کی جانب سے احتجاج اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر ساڑھے تین سال اقتدار میں رہنے کے بعد شیخ مجیب الرحمان اپنے خاندان کے ۴۰ دیگر افراد کے ساتھ قتل ہوا اور پورے ملک میں کسی کوّے نے بھی اس کے لیے آنسو نہ بہائے۔ جس قوم نے پاکستانی ظلم و استبداد تلے زندگی گزارنا قبول نہیں کیا تھا، وہ ہندوؤں کے غلام و ماتحت کے ماتحت رہنا کیسے قبول کر لیتی؟ آج، گو بنگلہ دیش میں بھارت نواز ہند'توا سرکار کی پرچارک، شیخ مجیب کی بیٹی شیخ حسینہ کی ظالمانہ حکومت قائم ہے، مگر عنقریب دنیا اس کا زوال دیکھے گی۔ ضرورت محض چند ہوشمندانہ اقدامات کی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت سے دوچار کرتا ہے۔

بھائی 'ابو ہود بنگالی' کا تعلق 'حاجی شریعت اللہ کی سرزمین بنگال سے' ہے، جسے آج بنگلہ دیش کے نام سے جانا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

شامتِ اعمال

مولانا سید حامد میاں رحمۃ اللہ علیہ (بانی جامعہ مدنیہ جدید لاہور)

زیرِ نظر مقالہ سقوطِ ڈھاکہ کے موقع پر مولانا سید حامد میاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مجلے انوارِ مدینہ میں بطورِ اداریہ سپردِ قلم کیا تھا۔(ادارہ)

گزشتہ ایک ہی مہینہ میں ملک جس بھیانک دور سے گزرا ہے اس کے بارے میں جتنا بھی افسوس کیا جائے بجا ہو گا۔ یہ حادثۂ عظیمہ ایک درسِ عبرت ہے کہ اگر اللہ پر بھروسہ نہ ہو تو کتنی بھی بڑی طاقت کیوں نہ ہو بے کار جاتی ہے اور جو نقصان ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اس دفعہ اس جرمِ غفلت میں پوری قوم ملوث تھی۔ اس لیے پوری قوم کو اس کی سزا ملی۔ قوم نے چین پر بھروسہ کیا۔ امریکی بحری بیڑے پر نظر رکھی۔ مگر خدا کی طرف رجوع نہ ہوئی۔ لہٰذا ملک کا آدھا حصہ کٹ کر رہ گیا اور ہماری طاقت، جو پچھلی جنگ کی بنسبت کم از کم تین یا چار گنا زیادہ تھی، بے سود ثابت ہوئی۔ اللہ کا وعدہ ہے مگر نیکوکار اور اطاعت شعار مُسلمانوں سے وعدہ ہے۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

”تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے کام کیے اُن سے اللہ نے وعدہ فرمالیا ہے کہ اُن کو ملک میں ضرور حکمران بنادے گا۔ جیسے اُن سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ضرور اُن کے لیے ان کا دین جمادے گا جو اُن کے واسطے پسند کر دیا ہے اور اُن کو خوف کے بجائے امن دے گا۔ وہ میری بندگی کریں کسی کو میرا شریک نہ کریں گے، اور جو کوئی اُس کے بعد ناشکری کرے گا سو وہی نافرمان لوگ ہوتے ہیں۔“

افسوس کہ ہمارے دل سے شرکِ خفی نہیں مٹا۔ ہم نے سامان پر بھروسہ کیا، بڑی طاقتوں پر بھروسہ کیا، عملِ صالح سے غفلت برتی، حتیٰ کہ نمازوں کی طرف بھی، جو کہ نہایت ضروری فریضہ ہے، کوئی توجہ نہیں دی۔ اس دفعہ مساجد بھی اسی طرح خالی رہیں جس طرح جنگ سے پہلے تھیں۔ سول ڈیفنس کی ٹریننگ جابجا ہوتی رہی، اگرچہ یہ بھی اس پیمانہ پر نہ تھی کہ جس پیمانہ پر ہونی چاہیے تھی، کیونکہ ہم میں جذبۂ خدمتِ خلق وایثار کم ہوتا جارہا ہے، لیکن سول ڈیفنس کے رضاکار جو بھی اور جتنے بھی تھے وہ بھی یادِ خدا سے غافل رہتے تھے، انہوں نے نماز کے فریضے کی طرف قطعاً التفات نہ کیا۔

ظاہر ہے جب پوری قوم غفلت شعار ہو تو خدا کی رحمت بھی ہم سے رخ پھیر لے گی۔ اور ایسا ہی ہوا۔

ہمارے حکام اس شرکِ خفی اور فسق وفجور میں عوام سے بہت ہی زیادہ آگے تھے۔ انہوں نے ہوسکنے والی فتح کو شکست میں بدل دیا۔ فسق وفجور کا کچھ حال تو اخبارات نے ظاہر کر ہی دیا ہے اور جو نہیں ظاہر ہوا، اندازہ یہ ہے وہ زیادہ ہی ہوگا کم نہ ہوگا۔ صرف ذاتِ ستّار العیوب نے اس کی پردہ پوشی فرمائی ہوئی ہے۔ ہم بھی اس سے بحث نہیں کرتے۔ ہم شرکِ خفی کے نتائج بدہی سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے وقت سب سے زیادہ کام مسلم لیگ اور علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ جماعت علماء نے کیا تھا۔ مسلم لیگ چند عناصر سے مرکب تھی، اس میں نواب، جاگیردار، دفتری عملے، ملازم طبقے اور کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ تھے۔ ان میں سے اکثر سیاست میں یا تو ناپختہ تھے یا پھر ان کے ذہن میں انگریز کی اطاعت رچی ہوئی تھی۔ ان میں حریتِ فکر کے بجائے اطاعت شعاریٔ فرنگ موجزن تھی۔ ان کے ذہن اس تمیز سے یکسر خالی تھے کہ ان کا سب سے بدترین دشمن وہی ہے جسے یہ اپنا آقا سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ جاننا چاہیے تھا کہ یہ آقا ہم سے دشمنی رکھتا ہے۔ اگر ہم اس سے وفاداری کریں گے تو وہ اپنے مفاد کے لیے ہمیں قربانی کا بکرا بنادے گا۔ وہ صرف اپنے مفادات کو ملحوظ رکھے گا نہ کہ ہماری وفاداری کو۔

شروع میں پاکستان کے حکمران بہتر رہے، مگر وہ معدودے چند تھے۔ اس کے بعد آخر حکمران تو اسی طبقہ میں سے آنے تھے، وہ آئے اور اپنی ذہنی غلامی سمیٹ آئے۔ جس کا خاصہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی کو اپنے ذہن میں اپنا آقا تصور کیا جاتا رہے۔ زمانۂ جاہلیت میں خانہ بدوشوں کو جو خوبصورت پتھر نظر آجاتا تھا اُسے اٹھالیتے تھے اور اس کی پوجاپاٹ شروع کر دیتے تھے، گویا اس طرح اپنے شرک کی پیاس بجھاتے تھے۔

بالکل یہی حال ہمارے حکام کا رہا کہ بجائے اس کے کہ ہم اپنے لیے کسی بڑی طاقت کو نفع بخش طریقوں پر پابند کرسکیں، ہم خود ہی اپنے ذہن میں ان کے غلام ہوگئے اور آزادی جیسی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود آزاد نہ ہوئے۔ ہماری خارجہ پالیسیاں صحیح نہیں رہیں۔ بتِ افرنگ کے سامنے جھکاؤ زیادہ رہا، حالانکہ اپنے مفاد اور قوم کی ترقی کے لیے بڑی طاقتوں سے صرف نفع حاصل کرنے کی ضرورت تھی، یہی ان آقاؤں کے رویہ کا جواب ہوسکتا تھا۔

آخر یہ منحوس گھڑی بھی آگئی کہ جس میں خلافِ عقل کام ایک غدّارانہ سازش کے تحت کیے جانے لگے، مگر مارشل لاء اور سنسر کی پابندیوں کی بناء پر کوئی لب کشائی نہ کرسکتا تھا۔ مثلاً :

1. شیخ مجیب الرحمن کو چھ نکات پر انتخاب لڑنے کی اجازت کیوں دی گئی؟
2. انتخابات جیتنے کے بعد انہیں اقتدار کیوں نہیں دیا گیا؟ جبکہ وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ حالات خراب ہو جائیں گے، وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ چھ نکات حرفِ آخر نہیں، ان میں ردوبدل ہو سکتا ہے، لیکن نہ انہیں اقتدار دیا گیا نہ ان سے بات کی گئی۔
3. اسی دور میں ہندوستانی مداخلت کار مشرقی پاکستان داخل ہوئے، مگر ان مداخلت کاروں کے داخلے اور ان کی کارروائیوں کی ذمہ داری اس حکومت پر کیوں نہ آئی جو یحییٰ خاں کی نمائندہ تھی اور اسے مارشل لاء کی قوت حاصل تھی؟ اور شیخ مجیب پر کیوں ڈالی گئی جن کی اس وقت تک حکومت ہی قائم نہ ہوئی تھی اور وہ رعایا کے ایک فرد تھے اور انہیں اقتدار دیا ہی نہ گیا تھا؟ اگر دنیا میں اصول چلتے ہیں تو اصولاً مجیب حاکم تھے اور بقول یحییٰ خاں وہ ملک کے ہونے والے وزیر اعظم اور محب وطن پاکستانی تھے، مگر چند ہی روز بعد وہ غدّار کہلائے گئے اور جیل بھیج دیے گئے۔ کوئی بتلائے کہ ان دونوں میں اصولاً کون حاکم ہونا چاہیے تھا اور کون غدار تھا؟

پھر ایک طاقتور دفاع کی قوت مشرقی پاکستان منتقل کر دی گئی اور یہ اعلان کیا گیا کہ اگر مشرقی پاکستان پر حملہ ہوا تو سارے پاکستان پر حملہ سمجھا جائے گا، مگر جب انڈیا نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تو ہم مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کی سپاہ کی قوت ٹوٹنے کا محض تماشہ دیکھتے رہے۔ حتیٰ کہ جنگ کے شعلے مغربی سرحدوں پر بھی بھڑکنے لگے۔ افواجِ پاکستان نے مغربی محاذوں پر دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کے علاقے میں پیش قدمی شروع کی، لیکن صرف چند گھنٹے بعد افواج کی پیشقدمی روک دی گئی اور جہاں افواج پاکستان زیادہ آگے بڑھ گئی تھیں وہاں سے فوری حکم کے ذریعے پیچھے ہٹا دیا گیا۔ یہ ممکن تھا کہ مشرقی پاکستان کے شرقی جانب جو ہندوستان کا علاقہ تھا گھیرے میں آجاتا، اگر یہ منظوری دی جاتی کہ جنرل نیازی اپنے شمال میں پیش قدمی کریں اور چین کی سرحد تک بڑھ جائیں۔ دوسری طرف فوراً ہی مغربی محاذ پر پیش قدمی کر کے کشمیر لے لیا جاتا۔

یہ دونوں صورتیں یقیناً ممکن تھیں اور اسی طرح مشرقی پاکستان میں چین سے معاہدہ کر کے براہ راست امداد جاری رکھنی ممکن تھی اور ایسی صورت میں ہندوستان لاچار ہو جاتا اور بڑی طاقتوں کا خواب پراگندہ ہو جاتا، وہ سب اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرتے اور پاکستان کے آگے انہیں جھکنا پڑتا، لیکن اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں مدد کا بندوبست نہیں کیا گیا اور ہتھیار ڈلوا کر پاکستان کے چہرے پر قیامت تک رہنے والا داغ لگایا گیا اور ملک کے علاوہ افواج کی ساکھ کو زبردست نقصان پہنچایا گیا اور ہو سکنے والی فتح کو شکست میں بدل کر رکھ دیا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ جو جان بوجھ کر کیا گیا ہے؟ اس کی اصل علت کیا ہے؟ ہمارے خیال میں اصل علت "شرکِ خفی" ہے۔ یعنی بیرونی عالمی بڑی طاقتوں کے سامنے جھکنا اور ان کے منشاء پر چلنا ہے۔ انہوں نے مل کر ہماری اطاعت شعاری سے فائدہ اٹھایا اور خدا نے بھی ہمارے ان حکام کو ایسے ہی چھوڑ دیا جیسے انہوں نے خدا کو چھوڑا۔ ان کی خودی اور غیرت سب فنا ہو کر رہ گئی۔

﴿نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾
"انہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے ان کو اپنی جان بھلائی۔ یہی لوگ وہ ہیں جو نافرمان ہیں۔"

آخر ان ممالک کو اگر وہ بڑے بھی ہیں، ہمارے معاملے اور داخلی امور میں مداخلت کی ضرورت کیا ہے؟ اور کیوں ہم اتنے مجبور بنتے ہیں کہ ان کی مداخلت بسر و چشم قبول کرتے ہیں اور خود کو آئے دن طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کرتے ہیں؟ اگر ہم نے اب بھی اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو مغربی بازو کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔

غرض مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالوانے اور مغربی پاکستان میں افواج کی پیش قدمی کو روکنا یا تو، یحییٰ کی کمزور فطرت کے باعث جو سازش کی گئی اس کا نتیجہ تھا یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی اور بات ہے، اور ملک کو ذاتی نفع کے عوض، چاہے وہ کتنا بھی بڑا نفع کیوں نہ ہو، بیچا گیا ہے۔ اور ایسی صورت میں جو تحقیقی کارروائی ہو رہی ہے اسے خفیہ رکھنے کا مطلب یہ ہو گا کہ آئندہ بھی ایسے مجرم جری ہو جائیں اور ملک کے ساتھ غداری کی رسم بے عیب بن جائے۔

☆☆☆☆☆

رویے اور تاثرات

"صحابہؓ عجز وانکساری اور سادگی کا پیکر تھے۔ اور یہ ہمارے لیے سبق ہے۔ یہ آپ کا لباس نہیں جو یہ طے کرتا ہے کہ آپ کون ہیں، نہ ہی وہ رویے اور وہ تصور جو آپ اپنے بارے میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ آپ کے قلوب میں موجود افکار و نظریات آپ کی شخصیت کا تعین کرتے ہیں۔ جب اپنی ذات کے بارے میں لوگ جعلی اور بناوٹی تاثر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو اللہ رب العزت انہیں اس وقت تک مرنے نہیں دیتے جب تک ان کی حقیقت سب پر عیاں نہ کر دیں!"

(شہید داعی الی اللہ، شیخ انور العولقی رحمہ اللہ)

ایک دل جلے کی آہ

مولانا اطہر علی سلہٹی نوّر اللہ مرقدہٗ

سلہٹ (بنگال) کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے مولانا اطہر علی نور اللہ مرقدہ دار العلوم دیوبند کے فاضل اور حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ قیامِ پاکستان کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا، یہاں تک کہ سلہٹ کے ریفرنڈم میں آپ ہی کی کاوشوں سے قیامِ پاکستان کے حق میں نتیجہ بر آمد ہوا۔ قیامِ پاکستان کے بعد جمیت علمائے اسلام کے پلیٹ فارم سے مسلسل قرآن و سنت کے قوانین کے نفاذ کی جدوجہد کرتے رہے۔ ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے واقعے کا آپ پر کیا اثر ہوا ہو گا، ذیل کی شکستہ تحریر اس کی عکاس ہے، جس میں نتیجے کو عمل سے جوڑ کر عبرت دلائی گئی ہے۔ (ادارہ)

حکومت مقصود بالذات نہیں ہے۔ عند اللہ حکومت سے غرض اقامتِ دین ہے۔ ارشاد ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

استخلاف کا وعدہ مؤمنین متقین کے لیے ہے، ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ اور غرضِ استخلاف تمکین دین ہی ہے۔ ﴿وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ﴾ اور دوسری غرض تبدیلِ خوف بالامن ہے ﴿وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا﴾۔

زندگی کے حقیقی لطف کا مدار دو ہی چیزوں پر ہے؛ عدمِ خوف و امن، اور اطمینان و عافیت۔ چنانچہ اگر کسی بادشاہِ عظیم کو پھانسی کا حکم ہو جائے تو بڑی سے بڑی حکومت اور کل سامان تعیش و تنعم کے باوجود زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ ایسی ہزاروں مثالیں ہیں۔ اور حکومت کا زوال و ہلاکت فسق و فجور ہی سے ہوتا ہے، ﴿وَاِذَاۤ اَرَدْنَاۤ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً﴾ اور ﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا﴾ ان امتوں کے مصداق امم ماضیہ قومِ ثمود، عاد و سبا اور شداد و نمرود پر ایک نظر کرنی چاہیے۔

عادۃ اللہ ہے کہ إن الله ليملي الظالم فإذا أخذه لم يفلته. ان بطش ربك لشديد.

حلم حق باتو مو اسابا کند
چوں تو از حد بگذری رسوا کند

﴿ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ﴾

اللہ نے پاکستان پر اپنے حتمی وعدے سے زائد فضل فرمایا، جبکہ بانیٔ پاکستان اور اربابِ لیگ نے باوجود کامل مسلمان و متقی نہ ہونے کے صرف یہ وعدہ کیا کہ قرآن و سنت کے قوانینِ جامعہ ہمارے پاکستان کا قانون ہو گا۔ اس وعدے پر اللہ نے رحمت و فضل کا خزانہ کھول دیا۔ اور پاکستان بن گیا۔ نية المؤمن خير من عمله۔ مگر چوبیس سالوں تک قران و حدیث کے قوانین جامعہ کو نہیں نافذ کیا گیا، اور مغربی مہلکہ مغضوبہ قوانین تہذیب و تمدن اور معاشرت کو پسند کرتے رہے۔ اور ﴿وَلَا تَرْكَنُوْۤا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ کے بموجب اب وہ منظر ہے کہ إذ أخذه لم يفلته کا وبال بھگتنا پڑ رہا ہے۔ قریبی دوست جانی و مالی دشمن ہو گیا، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو اس کی تعریف کرنے والا اس کی ہجو کرنے لگتا ہے۔

☆☆☆☆☆

بقیہ: مع الاُستاذ فاروق

یہی بات میں نے اپنے شہید مرشد حضرتِ اسامہ ابراہیم غوری سے کہی تو وہ کہنے لگے کہ 'یہ اچھی بات ہے۔ صادق بھائی (شیخ احسن عزیز شہید) بھی اسی پر زور دیتے تھے، لیکن ساتھ میں کہتے تھے کہ بعض دفعہ تحریر کا اسلوب کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وہاں ہر بار مکمل "صلی اللہ علیہ وسلم" لکھنا ممکن نہیں ہوتا، تو میں جہاں جہاں لکھ سکوں وہاں لکھتا ہوں لیکن جہاں ممکن نہ ہو تو وہاں ' ﷺ ' کا نشان لگا دیتا ہوں'۔ مرشد سے یہ بات سننے کے بعد میں نے توجہ سے شیخ احسن عزیز کے شعر و نثر کو دیکھا تو یونہی پایا کہ اکثر وہ مکمل 'صلی اللہ علیہ وسلم' لکھتے ہیں، لیکن کہیں کہیں اسلوب میں مکمل لکھنا ممکن نہیں ہوتا خاص کر شعروں میں تو وہاں وہ نشان درج کر دیتے ہیں۔

مرشد کی نصیحت دراصل اعلامی حوالے سے تھی۔ یہ سب ہی سچے عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے (نحسبه كذلك)۔ باقی صرف تکنیکی و مزاجی بات ہے۔

اللہ پاک ہمیں بھی ان عشاقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل فرمالیں جو آپ کی شریعت کے عائد کردہ فرائض پر عامل ہوں، سنتوں پر فدا ہوتے ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جاری طریقۂ جہاد میں شہادت کے جام پیتے ہوں۔

وما توفيقي إلّا بالله. وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين.
وصلى الله على نبينا وقرة أعيننا محمد وعلى آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين.

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

مجاہد فی سبیل اللہ، لیفٹیننٹ جنرل شاہد عزیز شہید عجل اللہ

لیفٹیننٹ جنرل شاہد عزیز شہید صاحب کی کتاب ''یہ خاموشی کہاں تک!'' کا دوسرا باب، جسے انہوں نے ''دوسرا سفر'' کا نام دیا ہے، ۱۹۷۱ء کی جنگ اور سقوطِ ڈھاکہ کے میں بارے ہے، جو اس جنگ میں حکمران اور فوج کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔ ذیل میں اس باب کے منتخب اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں، البتہ ان کے ساتھ ربط کے لیے بعض تبصرے ہمارے ساتھی 'قاضی ابو احمد' نے لکھ دیے ہیں جو '**جلی**' انداز میں موجود ہیں۔ (ادارہ)

ان دنوں مشرقی پاکستان میں آگ بھڑک رہی تھی، اور ہولناک خبریں آتی رہتیں۔ ہم ابھی PMA[1] ہی میں تھے کہ ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ خود ہی ہم اپنا خون بہا رہے تھے۔ یہ کہہ دینا کہ کچھ باغیوں نے دشمن کے ساتھ مل کر سازش کی، جس کا یہ نتیجہ نکلا، جھوٹ کی چادر پر موہوم سے سچ کے پیوند سے زیادہ نہیں۔ ان کو کبھی اپنے جیسا سمجھا ہی نہیں۔ اگر ہم برابری کا سلوک کرتے تو یہاں تک نوبت ہی نہ آتی۔ ہم نے اپنے بھائیوں کو دھکیل کر اس مقام تک پہنچا دیا کہ انہوں نے دشمن کو اپنا غم گسار سمجھا۔ جو نفرتیں بوئی تھیں، کِھل گئیں۔ پھر اتنا خون بہا کہ دونوں بھائی آج تک منہ چھپاتے ہیں۔

کیا فوجی حکمران، کیا سیاستدان، طاقتوروں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ہزاروں کا خون بہایا، ملک کے دو ٹکڑے کر دیے۔ کسی کو کسی نے نہ پوچھا۔ سب پردے میں رہے۔ سب محفوظ، فوجی حکومتیں بھی آئیں اور سیاسی بھی۔ سب خاموش۔ سب سازش میں شامل۔ عوام پھر بھی اپنے بچوں کو پالتی رہی، اہلِ ہوس کی ترجیحات پر خون بہانے کو۔ ہم نے آدھا ملک کھو کر بھی کچھ نہیں سیکھا۔ آج بھی اس ہی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ آج بھی آنکھیں بند کیے، کانوں میں انگلیاں ٹھونسے، آدھے سچ پر اپنا ہی خون بہا رہے ہیں۔

ہندوستان کے عزائم ۱۹۷۰ء میں مئی کے مہینے سے ہی دیکھنے والوں کو نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ جولائی کے مہینے تک ان کے تمام منصوبے تیار تھے۔ مگر ملک کی خفیہ ایجنسیاں، بجائے دشمن پر نظر رکھنے کے، حکمران کو مزید مستحکم کرنے کی ترکیبیں کر رہی تھیں۔ دہلی میں بیٹھے غیر ملکی سفیروں نے بھی بھانپ لیا تھا، مگر ہمارے حکمران اپنی کوتاہیوں سے فارغ ہوتے تو سچ پر دھیان دیتے۔ ان کا سچ آج بھی وہی ہے جو ان کے ذاتی عزائم پورے کرتا ہو۔ باقی سب کچھ وہ قیاس آرائی کہہ کر پھینک دیتے ہیں۔ آگاہ کرنے والے کو بھی شرمندہ کر چھوڑتے ہیں۔ کہتے ہیں، 'کیا تم سازشی نظریے (conspiracy theories) جھاڑتے رہتے ہو'۔

فوج کی حکمتِ عملی ان دنوں یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان میں ہے۔ یعنی اگر وہاں حملہ ہو گا تو اُس کا جواب یہاں سے دیا جائے گا، اور ہندوستان کی افواج کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ مشرقی پاکستان سے پیچھے ہٹ جائیں۔ اس مفروضے کی بنا پر وہاں صرف ایک ڈویژن فوج ہوتی تھی اور برائے نام ہوائی جہاز۔ فوجی منصوبہ بھی باقی چیزوں کی طرح سوتیلے بھائیوں جیسا ہی تھا۔

جب ہنگامے شروع ہوئے تو مزید فوج وہاں بھجوائی گئی، اور جو مغربی پاکستان سے حملے کے منصوبے تھے اُن کے لیے سپاہ کافی نہ رہی۔ جب یہاں سے حملے کے احکامات دیے گئے، اس وقت مشرقی پاکستان کی صورتحال بھی ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ یہاں کچھ بھی کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ ویسے بھی نہ ہی اس سٹریٹیجی (strategy) میں کوئی جان تھی، نہ ہی اس کا وقت رہ گیا تھا اور نہ ہی سپاہ۔ جب حکمران ہوش میں آئے، چھت گر رہی تھی، بوکھلاہٹ میں مغربی پاکستان سے بھی بے مقصد حملہ شروع کروا دیا۔

فوج کی تاریخ اگر کسی نے سچ لکھی ہوتی تو صحیح پتہ چلتا، لیکن جو سنا اور پڑھا عقل حیران ہے۔ GHQ کی کارکردگی فوجی حکمران کی غفلت سے کافی حد تک متاثر ہو چکی تھی۔ وہ سیاست ہی میں مشغول رہتا۔ تاریخ لکھنے والے لکھتے ہیں: 'نااہل لوگ صرف دکھلائی ہوئی وفاداریوں اور مبالغہ آمیز مظاہرۂ مردانگی (machismo) پر ترقی پا رہے تھے۔ اور چہیتوں کا ٹولہ (جو ہر فرعونی حکمران کے گرد جمع ہو جاتا ہے) راج کرتا تھا۔ صدر صاحب جس کو جی کرتا احکامات دیتے، یا شاید جو سامنے ہوتا۔ جو شامیں اُن کے ساتھ گزارتے، مرضی کے احکامات حاصل کر لیتے۔ اہم مسائل پر غور و فکر کے بجائے، فیصلے یونہی متکبرانہ اور لاپروا (cavalier) انداز میں سنا دیے جاتے۔'...... بس کہہ دیا، کتابوں سے تو یہی ملا ہے۔

۱۶ دسمبر کی دوپہر مشرقی پاکستان میں لیفٹیننٹ جنرل نیازی نے سپاہ کو حکم دیا کہ ہتھیار ڈال دیں۔ اُسی شام جنرل یحییٰ نے قوم سے خطاب کیا اور کہا کہ ایک محاذ پر نقصان اٹھانے کا یہ مطلب نہیں کہ جنگ ختم ہو گئی، ہماری جنگ جاری رہے گی۔ قوم کو خوب جوش دلایا، کہ آدھا ملک کھونے کا غم نہ ہو۔ کوئی حاکم کو ہارا ہوا نہ سمجھے۔ جانتے تھے کہ ہندوستان کی فوجیں اب بنگال سے بھی ادھر آنا شروع ہو جائیں گی۔ اور جو کچھ یہاں جنوبی صحرا میں ہماری فوج کے ساتھ ہو چکا تھا، اس سے بھی واقف تھے، لیکن نجانے کیوں، جب دباؤ کے نیچے آتے ہیں تو ڈکٹیٹروں کے دماغ کسی اور ہی دنیا میں ہجرت کر جاتے ہیں۔

---

[1] پاکستان ملٹری اکیڈمی

پھر اگلے دن، ۱۷ دسمبر کو ساڑھے تین بجے ریڈیو پر مغربی پاکستان میں بھی جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا، جنگ جاری رکھنے کے اعلان کے چند گھنٹوں بعد۔ رات کو جنرل یحییٰ خان نے تقریر کی اور فرمایا کہ اب لڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ گھر بیٹھ کر سر پیٹو، ماتم کرو۔ جو تمہارے بچے میں نے آگ میں جھونک دیے وہ میرے غرور کی نذر ہوئے۔ فوجی تھے، اسی لیے انہیں پالا تھا کہ بادشاہوں کے کام آئیں۔ یہ جنگ کی خوراک ہوتے ہیں۔ بھلا بتاؤ، مردود بنگالی، دو ٹکے کا آدمی، مجھے آنکھیں دکھاتا تھا۔ حکومت کی رِٹ (writ) کو للکارتا تھا۔ کہتا تھا میں حکومت کروں گا!اُس کی یہ مجال؟!میں نے ہزاروں کو ذبح کر دیا۔ میں بادشاہ ہوں، میں نے کہا تھا۔

طاقت کی ہوس نے پاکستان کو دو ٹکڑے کر دیا۔ شیخ مجیب الرحمن کی طرح ذوالفقار علی بھٹو نے بھی سازش کا ایک جال بُنا، اور 'اُدھر تم، اِدھر ہم' کا نعرہ لگایا۔ مجیب نے دشمن کا سہارا لے کر نفرتوں کو سینچا، بھٹو نے ایک نااہل فوجی حکمران کے لالچ کو بھانپ کر، اسے اپنی انگلیوں پر نچایا۔ دونوں نے طاقتور ساتھی چنے اور لاکھوں انسانوں کو اپنی خود غرضی کے دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ملک کو دو لخت کر کے موروثی جائیداد کی طرح بانٹ لیا۔ ظالم پر اللہ کی گرفت سخت ہوتی ہے، دنیا ہی میں بدلے چکا دیتا ہے۔ یحییٰ ذلیل ہو کر قید میں ہی مر گیا، بھٹو پھانسی پر لٹکا، مجیب قتل ہوا، اور اندرا اپنے محافظ کے ہاتھوں ماری گئی۔

آج نئے رنگوں میں یہی کھیل پھر کھیلا جا رہا ہے۔ پھر اپنی رِٹ (writ) کی آڑ لے کر خون بہایا جا رہا ہے۔ اور قوم کا غم صرف پیٹ ہے، بھائی کی موت نہیں۔ نہ ہی اللہ کا خوف۔ صرف بھرے پیٹوں کی بھوک۔ اور حکمران، ہمیشہ کی طرح، اپنی طاقت برقرار رکھنے کو سب کچھ جلانے پر آمادہ!

۱۹۷۱ء میں تقریباً سب کچھ کھو چکنے کے بعد جب مشرقی پاکستان کے نام نہاد دفاع کی خاطر مغربی پاکستان سے ہندوستان پر حملہ کیا گیا تو اس حملے میں شاہد عزیز صاحب کی پلٹن بھی شامل ہوئی۔ یکم دسمبر کو اس پلٹن کو گارڈ ڈیوٹیوں سے ہٹا کر محاذِ جنگ کی جانب بھیجا گیا۔ راولپنڈی سے گجرات تک ریل کا سفر کیا، جس کی روداد اور اپنے احساسات کچھ یوں لکھتے ہیں:

''۱۹۶۵ء کی لڑائی میں بھی ایک ٹرین میں سفر کیا تھا۔ ان دنوں نور جہاں کے ترانے ہر جگہ سنائی دیتے اور لوگوں کا ابلتا ہوا جوش فضاؤں میں بلند نعروں کے ساتھ گونجتا۔ اب ہر طرف سناٹا تھا۔ راولپنڈی ریلوے سٹیشن پر بھی کوئی ہمیں الوداع کہنے نہ آیا۔ جو لوگ وہاں موجود تھے انھوں نے بھی دیکھا اور نظریں پھیر لیں۔ راستے کے ہر سٹیشن پر بھی ویسا ہی سناٹا۔ بے اعتنائی۔

جب حاکم سیاسی مفاد میں اپنے ہی بچوں کا خون بہانا شروع کر دے تو عوام کس کا ساتھ دیں؟ آج پھر یہی ہو رہا ہے۔ حکومت کا چیخ چیخ کر گلا سوکھ گیا کہ یہ ہماری جنگ ہے۔ تمام ٹی وی چینلز بھی اسی ترانے میں شامل ہیں، بہت سے کرائے کے عالم دین بھی۔ فوج بھی امریکہ کے نام پر جان دینے والوں کے سینوں پر تمغے سجاتی رہی، خون بہاتی رہی، مگر قوم میں کوئی اس بات کو ماننے پر آمادہ نہیں کہ یہ جنگ ہماری جنگ ہے۔ سچ پر کتنا ہی جھوٹ کا لبادہ اڑھاؤ، سچ سچ ہے، آخر کھل ہی جاتا ہے۔''

لکھتے ہیں کہ گجرات پہنچنے تک جوانوں کے جذبے بلند تھے، چونکہ وہ جانتے ہی نہ تھے کہ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ البتہ حکمرانوں اور قائدین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''کیا کبھی کسی حکمران نے بھی سوچا کہ یہ جنگ کیوں اپنی عوام پر ٹھونس رہا ہوں؟ یہ سوچا کہ میرے حکم پر کتنے ہی جوان جان ہتھیلیوں پر لیے، اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر، بغیر کسی مقصد کی آگ میں کود جائیں گے؟ نہیں۔ وہ تو گدھ کی طرح اِنھی کی لاشوں پر پلتے ہیں، آج بھی۔''

حملے کی تفصیلات، عسکری مجموعات کا آپس میں ارتباط نہ ہونے، اپنی ذمہ داری دوسرے پر ڈال کر جان چھڑانے اور ناقص منصوبہ بندی کے باعث حملے کے کامیاب نہ ہونے کا ذکر کرنے کے بعد چھمب کی اصلی دفاعی لائن پر دشمن کے دفاع اور ان کی جانب سے حملے کی تیاریوں کی اطلاع ملنے اور فوج کے مورال کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ہم مورچوں میں ڈٹ گئے۔ مورچے کیا تھے، بس کچھ فاصلوں پر کمر کمر تک گڑھے کھودے ہوئے تھے۔ موت کے انتظار میں سب اپنی اپنی قبروں میں کھڑے ہو گئے۔ جب حملے میں گئے تھے تو یہ کیفیت نہ تھی۔ حملے میں جوش تھا، ولولہ تھا۔ وقت ہم نے چنا تھا، اور دشمن بھی...اب... سر پر لٹکتی تلوار کے گرنے کے منتظر۔ سہمے ہوئے۔

کیا پتا تھا کہ چالیس سال اور گزرنے کے بعد پوری قوم اسی مقام پر پہنچ جائے گی۔ اپنے اپنے خوف لیے، اپنے اپنے مورچوں میں بند۔ تنہا۔ ماؤف دماغ، منجمد جسم۔ موت کے منتظر۔ صرف اپنی سوچیں گے۔ پھر کراچی میں بہتا خون راولپنڈی کو نہیں چھوئے گا۔ جب جھوٹے دلاسے دیتا، جابر حکمران بھی دشمن کا ہی ساتھی ہو گا اور ہم اس کو پہچان کر بھی چپ رہیں گے۔ جب ہمیں غلامی راس آ جائے گی اور صرف بھوک ہی ہمارا خدا ہو گی اور ہم خود کو بے بس سمجھیں گے۔ جب مسلمانوں کے قتلِ عام پر خراج ملے گا، مرنے پر شہادت کے فتوے دیے جائیں گے اور ہم چپ رہیں گے۔ پھر ہم اپنے بتوں کو پکاریں گے، ان کے آگے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں گے، اور اپنے بچے ان کے آستانوں پر بھینٹ چڑھا دیں گے۔''

لکھتے ہیں کہ توی دریا تک کا علاقہ تو پاکستانی فوج نے قبضے میں لے لیا، اب دریا کے پار حملہ کرنا تھا۔ منصوبہ تو بنایا گیا مگر اس پر عمل جس انداز سے کیا گیا، اس کی تفصیل افسرانِ بالا کی غیر ذمہ داری بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہوا یوں کہ حملے کے لیے دو مختلف بریگیڈوں سے ایک ایک انفنٹری کی یونٹوں کا تعین کیا گیا، جن میں کوئی ہم آہنگی نہیں تھی۔ نہ ہی انہوں نے اکٹھے تربیت کی تھی اور نہ ہی ایک دوسرے سے واقف تھے۔ مختلف چھاؤنیوں سے آئے تھے۔ پھر انہیں آرمڈ بریگیڈ کے زیر کمان کر دیا

گیا۔ کہا تم سنبھالو۔ آرمڈ بریگیڈ کئی میل پیچھے ایک رَکھ میں چھپا ہوا تھا۔ وہ وہیں رہا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر بھی اس ساری لڑائی کے دوران آگے نہ آیا۔ آرمڈ بریگیڈ نے، اپنی جان چھڑانے کو، ایک ایک پلٹن کو ایک ایک ٹینک یونٹ کے زیرِ کمان کر دیا۔ حکم ہوا، ''اب حملہ کرو''۔ لڑائی کا یہ انوکھا انداز تھا، جو کتابوں میں کہیں نہیں ملتا۔ ڈویژن ہیڈ کوارٹر نے دونوں انفنٹری یونٹوں کو آرمڈ بریگیڈ کے زیرِ کمان کر دیا، اور تمام کارروائی کی ذمہ داری اسے سونپ دی۔ اگر دو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر ہوتے تو ڈویژن ہیڈ کوارٹر کو کمانڈ سنبھالنی پڑتی۔ آرمڈ بریگیڈ نے دونوں یونٹیں ایک ایک ٹینک رجمنٹ میں بانٹ دیں، تاکہ اس کی ذمہ داری ختم ہو۔ سب اثاثے نچلی سطح تک تقسیم کر دیے۔ اپنی جان چھڑائی۔ سب نے اپنی اپنی ذمہ داری ماتحت کو دے دی اور چین پایا۔ سب خاموش تماشائی۔ جنگ کے بعد بھی اس موضوع پر سناٹا ہی رہا۔

اگر کامیابی ہوئی تو اعزاز لینے کے لیے بالا کمانڈر کھڑا ہو جائے گا۔ کہے گا، ''دیکھا میرے ڈویژن کو!''، ''دیکھا میرے بریگیڈ کو!''۔ اور اگر ناکامی ہوئی تو الزام لینے کے لیے ماتحت کی گردن حاضر ہے۔ حملے کا ایک تماشا بنا دیا۔ کوئی پوچھنے والا جو نہیں تھا۔ نہ ہی مشن پورا کرنے کی کوئی پرواہ تھی اور نہ ہی یہ فکر کہ کتنے سپاہی اس کوتاہی کی بھینٹ چڑھیں گے۔ کہا، ''خیر ہے، تمغے لگا دیں گے۔ ان کے لیے ترانے گائیں گے، چوک پر نام لکھ دیں گے۔ چھ ستمبر کو قبروں پر سلامی دیں گے''۔ صرف اپنی بقا لازم سمجھی۔

ایسے حملے خاصے پیچیدہ ہوتے ہیں اور بہت سے اہم پہلوؤں کو منظم و مربوط کرنا پڑتا ہے، خاصی نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے مرحلے میں نہ تو دونوں پیادہ فوج کی یونٹوں میں کوئی ربط تھا، نہ ہی حملے کی کارروائی کو کنٹرول کرنے والا کوئی ہیڈ کوارٹر دریا کے کنارے زمین پر موجود تھا۔''

جب حملہ شروع ہوا تو ناقص منصوبہ بندی اور غیر ذمہ دارانہ رویے کے نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے، اس بارے میں لکھتے ہیں:

''انہوں نے، حملے کی امداد میں ہتھیار ایسے لگائے کہ حملہ آور سپاہ پر ہی فائر کرتے رہے۔ جب حملے کے دوران بھاری ریکوئیلیس رائفل (106mm recoilless rifle) کے گولے ہمارے درمیان گرتے تو میں سوچتا کہ یہ گولے کہاں سے آرہے ہیں کہ جب زمین پر لگ کر پھٹتے ہیں تو شعلہ صرف آگے کی ہی جانب جاتا ہے۔ مجھے وہیں احساس ہو گیا تھا کہ یہ ہمارا فائری مستقر ہے۔... پھر فائر ختم کر کے کمپنی کمانڈر صاحب اپنی کمپنی سمیت وہیں بیٹھے رہے، آگے نہ آئے کہ کہیں زک نہ پہنچے۔ نہ فائری امداد دینے کے وقت اپنے ساتھیوں کی پرواہ کی اور نہ ہی اس کے بعد۔ مگر انہیں کسی نے پوچھا نہیں۔ جھوٹ اور پردہ پوشی کی فضا میں کون کسے پوچھتا۔ حملہ ختم کرنے کے فوراً بعد ہی حملہ آور کو امونیشن پہنچانا لازم ہے تاکہ دشمن کی جوابی کارروائی سے پہلے ان کو مل جائے۔ ان کا زیادہ امونیشن تو حملے میں صرف ہو چکا ہوتا ہے۔ نہ ان کے ہتھیار ہی پہنچے، نہ ہمارے اور نہ ہی ہمیں امونیشن ملا۔''

لکھتے ہیں کہ رات دو بجے دریا پار سے کامیابی کا اشارہ دے دینے کے باوجود صبح دس بجے تک نہ ہی ہماری بھاری ہتھیاروں کی کمپنی پیچھے آئی اور نہ ٹینک اور نہ ہی وائرلیس پر کوئی خبر۔ پھر کمک نہ ملنے، افسرانِ بالا کی ذمہ داریوں سے جان چھڑانے کی تفصیل اور ایک مسلمان کی حیثیت سے اس نقصان کی اصل وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو پلٹن ہمارے ساتھ حملے میں گئی تھی، وہ دریا کے دوسرے کنارے پر ہی ٹھہر گئی، اور پھر چونکہ ٹینک نہیں آئے، ہم سے پہلے ہی واپس آچکی تھی۔ جو بریگیڈ ہیڈ کوارٹر تھا، دریا سے میلوں پیچھے ہی رہا۔ دونوں ٹینک رجمنٹیں بہت دیر سے چلیں۔ پہلی رجمنٹ جب دریا پر پہنچی تو صبح پھوٹ چکی تھی۔ جب ان کا ٹینک دریا کے پار چڑھنے لگا تو اس پر فائر آیا اور وہ اس وجہ سے پیچھے نکل آئے کہ پار کا کنارہ محفوظ نہیں کیا گیا۔ نجانے انہوں نے دریا کہاں سے پار کرنے کی کوشش کی؟ دوسری رجمنٹ کو اتنی دیر ہو گئی کہ وہ دریا پر آئی ہی نہیں۔ پیچھے ہی رک گئی۔ جو بھاری ہتھیاروں کی کمپنی تھی اس کے کمانڈر نے کہا کہ پانی زیادہ تھا، میری جیپیں اسے پار نہ کر سکیں۔ حالانکہ ان سب نے مل کر دریا پار کرنے کی جگہ کا چناؤ کیا تھا۔ انجنیئر کمپنی کا افسر بھی اس میں شامل تھا۔ آپس میں ارتباط کی تفصیلات بھی یقیناً طے کی ہوں گی۔ پھر بھی سب تتر بتر ہی رہے۔

جب ڈویژن ہیڈ کوارٹر ہی حملے کا ذمہ نہ لے اور حملے کا بریگیڈ کمانڈر جگہ پر موجود ہی نہ ہو تو اتنا پیچیدہ حملہ کیسے کامیاب ہو؟ مگر کسی کو کچھ کہا نہ گیا، کسی سے سوال نہ ہوا۔ سب نے بہتری اسی میں دیکھی کہ معاملہ ڈھانپ دیا جائے۔ بتایا گیا کہ چونکہ GHQ کے احکام تھے کہ آگے آپریشن نہ کیے جائیں، اس لیے حملہ روک دیا گیا۔ دوسری پلٹن تو واپس بلا لی تھی، ہمارے ساتھ وائرلیس کا ملاپ نہیں تھا اس لیے ہمیں یہ بتا نہ سکے۔ اور ہم بھاری ہتھیاروں اور توپ خانے کی امداد کے بغیر اور گنتی کے امونیشن کے ساتھ دشمن کے گھیراؤ میں بیٹھے ان ٹینکوں کا انتظار کرتے رہے جو چلے ہی نہیں۔

اللہ ہی جانتا ہے کہ سچ کیا تھا۔ جنگ کے دن جھوٹ سے بھرے تھے۔ میدانِ جنگ میں کئی جگہ یہ بھی ہوا کہ سپاہ اپنی جگہ پر ہی رہیں اور کمانڈر وائرلیس پر اپنی کامیابیاں بتاتے رہے۔ ایک دوسرے پر الزام لگانا اور اپنی ذمہ داری سے منہ موڑنا عام تھا۔ وائرلیس تو کمزور تھے ہی، مگر ان کو بند کر کے خرابی کا بہانہ یا احکام نہ سمجھ آنے کی کئی مثالیں تھیں... تربیت کی کمی ہر طرف دیکھنے میں آئی۔ پھر سب نے اپنی اپنی کارکردگی سنہری الفاظ میں لکھی اور تاریخ جنگ کی کتاب بند کر دی۔

(باقی صفحہ نمبر 66 پر)

اقوامِ متحدہ کی حقیقت کے بارے میں امتِ مسلمہ کو نصیحت

حکیم الامت، فضیلۃ الشیخ ایمن الظواہری (دامت برکاتہم العالیۃ)

بسمِ اللهِ والحمدُ للهِ والصلاةُ والسلامُ على رسولِ اللهِ وآلِه وصحبِه ومن والاه

دنیا بھر میں بسنے میرے مسلمان بھائیو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آج میں امتِ مسلمہ کو اقوامِ متحدہ کے خطرے سے خبر دار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بحث درج ذیل حصوں کا احاطہ کرے گی:

- تعارف
- اقوامِ متحدہ کے منشور (چارٹر) کا مختصر جائزہ
- انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے کا مختصر جائزہ
- یونیسکو کی سرگرمیوں کا خلاصہ
- اقوامِ متحدہ کی مسلمانوں سے عملی دشمنی کا مختصر جائزہ
- اختتامیہ

تعارف

شروع میں ہمیں یہ واضح کرنا ہو گا کہ اقوامِ متحدہ کو دوسری جنگِ عظیم کی فاتح طاقتوں نے پوری دنیا پر ایک سیاسی اور نظریاتی نظام مسلط کرنے کے مقصد سے اور باقی ساری انسانیت پر اپنی بالادستی قائم کرنے کی غرض سے تشکیل دیا تھا۔ اگرچہ اقوامِ متحدہ، بین الاقوامی تعاون کی ایک تنظیم ہونے کے بلند ترین دعوے کرتی ہے۔

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کا مختصر جائزہ

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے سرسری جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ایسی تنظیم کا چارٹر ہے جو دنیا کو کنٹرول کرنے اور اس پر ایک بے دین اور غیر اخلاقی نظریہ مسلط کرنے کے لیے تشکیل دی گئی ہے اور جو شریعتِ اسلامیہ سے متصادم ہے۔

اور جب ہم اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر غور کرتے ہیں تو درج ذیل چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

اول: شریعت سے متصادم قانون کے ذریعے فیصلے کرنا:

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں فیصلے یا تو مطلق اکثریت یا دو تہائی اکثریت کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں۔ اور سلامتی کونسل کو جنرل اسمبلی پر فوقیت حاصل ہے اور اس میں پانچ مستقل ارکان شامل ہیں جو اس دنیا کے سب سے بڑے مجرم ہیں اور ان کی منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ لینا ناممکن ہے۔ یعنی اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں فیصلے اکثریت کی بنیاد پر کیے جاتے ہیں جبکہ سلامتی کونسل کو جنرل اسمبلی پر فوقیت حاصل ہے۔ پھر پانچ مستقل ارکان سب سے اوپر ایک مقدس حیثیت سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اور وہی اقوامِ متحدہ کے حقیقی حکمران ہیں۔ یعنی، جاہلیت پر جاہلیت اور اس پر پھر جاہلیت۔ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں واضح کیا ہے کہ اُس کی شریعت کے علاوہ کوئی بھی قانون جاہلیت کا قانون ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ○ (سورۃ المائدۃ: ۵۰)

”بھلا کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ یقین رکھتے ہوں ان کے لیے اللہ سے اچھا فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟“

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کا آرٹیکل نمبر ایک واضح کرتا ہے کہ:

”بین الاقوامی امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے اور جارحیت کی کارروائیوں یا امن کی دیگر خلاف ورزیوں کو دبانے کے لیے، اور پرامن ذرائع سے، اور انصاف کے اصولوں اور بین الاقوامی قانون کے مطابق، بین الاقوامی تنازعات کا تصفیہ یا ایسے حالات جو امن کے لیے خطرے کا باعث بن سکتے ہیں۔“

پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر ڈاکٹر حسن نافعہ، اس آرٹیکل پر تبصرہ کرتے ہیں:

”اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کسی بھی ایسے معاہدے یا تصفیے کی توثیق نہیں کر سکتی جو منطقی استدلال یا طاقت کے توازن کے مطابق تو ہو لیکن وہ تصفیہ انصاف کے اصولوں یا بین الاقوامی قوانین سے متصادم ہو۔“

دوسرے لفظوں میں، اقوامِ متحدہ کی رکنیت قبول کرنے کا مطلب شریعت سے متصادم قانون کے ذریعے فیصلے قبول کرنا ہے اور شریعت کو مکمل طور پر ترک کرنا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر دستخط کرنا بجائے خود یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تمام معاملات (جنرل اسمبلی میں) اکثریت کی مرضی یا اقوامِ متحدہ کی ڈوریں کھینچنے والے پانچ مستقل اراکین کی مرضی یا بین الاقوامی قانون یا تجریدی انصاف کے مبہم حکم کے مطابق حل کیے جائیں گے۔ یعنی، اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر دستخط کرنا، جاہلیت کے قانون کو برضا و رغبت قبول کرنا ہے۔

وَمَنۡ أَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكۡمٗا لِّقَوۡمٖ يُوقِنُونَ۝(سورۃ المائدۃ:۵۰)

”حالانکہ جو لوگ یقین رکھتے ہوں ان کے لیے اللہ سے اچھا فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟“

دوم: دیگر معاہدوں اور قوانین کے مقابلے میں اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی غالب حیثیت:

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل ۱۰۳ میں کہا گیا ہے:

”رکن ریاست کی کسی بھی بین الاقوامی ذمہ داری اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے ذریعہ طے شدہ ذمہ داریوں کے درمیان تنازعہ کی صورت میں رکن ریاست مؤخر الذکر کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کی پابند ہو گی۔“

قاہرہ یونیورسٹی کے پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر ڈاکٹر حسن نافعہ، اس سلسلے میں کہتے ہیں:

”اقوامِ متحدہ کا چارٹر محض ایک بین الاقوامی تنظیم کا بانی منشور یا اس کی پلے بک نہیں ہے؛ اس کا دائرہ کار اس سے بہت آگے جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کو بین الاقوامی معاہدوں میں اعلیٰ مقام حاصل ہے اور اسے بین الاقوامی قانون کے سب سے اہم اور باوقار اصولوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔“

اس کے بعد وہ چارٹر کے آرٹیکل ۱۰۳ پر بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”اس سے واضح ہوتا ہے کہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر میں درج اصولوں کی مخالفت کرنے والے کسی بھی معاہدے کا انعقاد غیر قانونی تصور کیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں، ریاستی سرگرمیاں یا ریاستی طرزِ عمل جو واضح طور پر اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی مخالفت یا خلاف ورزی کرتا ہے، اسے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی اور بین الاقوامی قانونی حیثیت کی مخالفت سمجھا جائے گا۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی پاسداری کرنے والی کسی ریاست کے لیے کسی دوسری ریاست کے ساتھ ایسا معاہدہ کرنا غیر قانونی ہو گا جو اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی روح کے خلاف ہو۔ مثلاً، اگر دو حکومتیں شرعی احکام کی بنیاد پر کوئی معاہدہ کرتی ہیں، جیسے شریعت کے مطابق تعلیمی نصاب پر اتفاق کرنا، تو یہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور اس کی شقوں کے خلاف ہو گا جو شریعتِ اسلامیہ سے متصادم ہیں۔ اور اس طرح ان دونوں حکومتوں کو ایسے معاہدوں کو منسوخ کرنا پڑے گا (جو اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے منافی ہیں)۔

اسی طرح اگر کوئی مسلمان ریاست اقوامِ متحدہ کی کافر رکن ریاست کے قبضے سے آزادی حاصل کرنے والی کسی دوسری مسلمان ریاست کو تسلیم کرے مثلاً امارتِ اسلامیہ کی جانب سے چیچنیا کے مجاہدین کی حکومت کا اعتراف کرنا، تو اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے مطابق اسے غیر قانونی سمجھا جائے گا۔

اسی طرح اگر کوئی اسلامی حکومت کسی کافر رکن ریاست کے خلاف مجاہدین کی مدد کرے، مثال کے طور پر اسرائیل کے خلاف فلسطینی مجاہدین، یا روس کے خلاف چیچن مجاہدین، یا اِتھیوپیا کے خلاف صومالی مسلمانوں، یا فرانس کے خلاف مالی کے مسلمانوں یا بشاری حکومت کے خلاف شامی مسلمانوں کی حمایت کرنا، تو یہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی خلاف ورزی سمجھا جائے گا۔

اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر دستخط کرنے والی ریاست، اسلامی سرزمینوں پر کافر قابضین کے خلاف جہاد میں مسلمانوں کی مدد کرنے کا فرضِ عین بھی ادا نہیں کرے گی۔ یعنی، اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر دستخط کرنے والی کسی بھی ریاست کو اسے شریعتِ اسلامیہ سے بالاتر سمجھنا ہو گا؛ وہ شریعت جو حکم دیتی ہے کہ مسلم سرزمینوں کی آزادی کے لیے جہاد ایک فرضِ عین ہے۔

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی اس غالب حیثیت کی تصدیق انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے کے آرٹیکل ۲۹ سے کی جاتی ہے جو ۱۹۴۸ء میں جاری کیا گیا تھا۔ اعلامیے میں کہا گیا ہے کہ اس میں شامل حقوق کو اس انداز سے استعمال نہیں کیا جائے گا جو اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے مقاصد سے متصادم ہو۔ یعنی یہ اعلامیہ بنی نوع انسان کے وقار، آزادی اور اِستقلال کی خاطر وضع نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اسے دوسری جنگِ عظیم کی فاتح طاقتوں کی مرضی کے تابع بنانے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا جیسا کہ ہم بعد میں اس پر تفصیل سے بات کریں گے، ان شاء اللہ۔

سوم: اقوامِ متحدہ کی رکنیت اس کے چارٹر کے التزام پر منحصر ہے:

رکنیت حاصل کرنے کے طریقہ کار کا خلاصہ یہ ہے کہ خواہش مند ریاست، اقوامِ متحدہ کے سکریٹری جنرل کو رکنیت کے مطالبے کا خط لکھے گی اور اس مطالبے کے ساتھ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی پاسداری کا اعلان بھی ہونا چاہئے۔ اقوامِ متحدہ سے بے دخلی کے لیے بھی یہی بات درست ہے۔ چارٹر کے آرٹیکل ۶ میں کہا گیا ہے کہ جنرل اسمبلی کسی رکن ریاست کو نکال سکتی ہے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس نے چارٹر میں درج اصولوں کی خلاف ورزی کی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے دیباچے میں بیان کیا گیا ہے کہ:

”اس کے مطابق، ہماری متعلقہ حکومتیں، سان فرانسسکو شہر میں جمع ہونے والے نمائندوں کے ذریعے، جنہوں نے اپنے صحیح، مناسب اور مکمل اختیارات کا مظاہرہ کیا ہے، اقوامِ متحدہ کے موجودہ چارٹر پر رضامند ہو چکی ہیں اور اس طرح اقوامِ متحدہ کے نام سے ایک بین الاقوامی تنظیم قائم کرتی ہیں۔“

یعنی، اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر دستخط کرنے والی ریاست اُن مقاصد کو پورا کرنے کے لیے کفار کے ساتھ اپنی کوششوں کو متحد کرنے پر اتفاق کرتی ہے جو شریعتِ اسلامیہ کے فیصلوں سے متصادم ہیں۔

آرٹیکل ۲ میں کہا گیا ہے:

''تنظیم اور اس کے اراکین آرٹیکل نمبر ایک میں بیان کردہ مقاصد کے حصول میں درج ذیل اصولوں کے مطابق کام کریں گے:

i. یہ تنظیم تمام رکن ممالک کی مساوی خود مختاری کے اصول پر مبنی ہے۔

ii. تمام اراکین نیک نیتی سے موجودہ چارٹر کے مطابق ان پر فرض کردہ ذمہ داریوں کو پورا کریں گے۔''

یعنی مقبوضہ فلسطین پر اسرائیلی خود مختاری کسی بھی رکن ریاست کی اپنے علاقوں پر خود مختاری سے مختلف نہیں ہے اور تمام رکن ممالک ایک دوسرے کی خود مختاری کا احترام کرنے کے پابند ہیں۔

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل ۲۵ میں اعلان کیا گیا ہے کہ تمام رکن ممالک سلامتی کونسل کی قراردادوں کی پاسداری اور ان پر عمل درآمد کا عہد کرتے ہیں۔

لہٰذا یہ واضح ہے کہ اقوامِ متحدہ میں شامل ہونے والی کوئی بھی ریاست اس کے چارٹر کو تسلیم کرتی ہے اور اسے قبول کرتی ہے اور اس میں شامل قوانین، اصولوں اور ذمہ داریوں کی پاسداری کرنے کی پابند ہے۔

چہارم: اقوامِ متحدہ کا چارٹر واضح طور پر شریعتِ اسلامیہ کی خلاف ورزی کرتا ہے جب وہ مردوں اور عورتوں کو اور مسلمانوں اور کافروں کو مساوی حقوق دیتا ہے:

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے دیباچے میں بیان کیا گیا ہے:

''ہم، اقوامِ متحدہ کے عوام، جنگ کی لعنت سے آنے والی نسلوں کو بچانے کے لیے پر عزم ہیں...... اور بنیادی انسانی حقوق، انسانی شخص کے وقار اور قدر، مردوں اور عورتوں اور چھوٹی بڑی قوموں کے مساوی حقوق پر اعتقاد کا اعادہ کرتے ہیں......''

چارٹر کے پہلے آرٹیکل کے تیسرے پیراگراف میں کہا گیا ہے کہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے مقاصد اور اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ:

''......عالمی معاشی، معاشرتی، ثقافتی اور انسانی مسائل کے حل کے لیے بین الاقوامی تعاون کا حصول اور بلا امتیاز نسل، جنس، زبان یا مذہب اور بلا تفریق مرد و عورت، سب کے لیے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام کو فروغ دینے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں تعاون کرنا......''

چارٹر کے تیرہویں آرٹیکل میں کہا گیا ہے کہ جنرل اسمبلی کو اس مسئلے کا تفصیل سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ یہ مختلف شعبوں سے متعلق تجاویز پیش کرتا ہے: ''......بلا امتیاز نسل، جنس، زبان یا مذہب اور بلا تفریق مرد و عورت، سب کے لیے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے حصول میں مدد فراہم کرنا......''۔

اور یہ شریعتِ اسلامیہ کی مخالفت ہے جیسا کہ شریعت مردوں اور عورتوں کے حقوق میں فرق کرتی ہے کیونکہ ہر جنس کے حقوق مختلف ہیں اور اس کے ذمے مختلف فرائض ہیں۔

پس ایک مرد پر لازم ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے مالی اخراجات برداشت کرے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ اپنی بیوی کا مہر ادا کرے اور اُسے اور اُس کے بچوں کو رہائش، لباس اور کھانا فراہم کرے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ ان کو آزمائشوں، انحراف اور گناہ کے کاموں سے بچائے اور ان پر کسی بھی قسم کی جارحیت کے خلاف ان کا دفاع کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: 'جو اپنے مال یا اپنے اہل و عیال یا اپنی جان یا اپنے دین کا دفاع کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے'۔

عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنے شوہر کی اطاعت کرے، اس کے مال، اس کے گھر اور اس کے بچوں کی حفاظت کرے۔ عورت ریاست کی سربراہ یا گورنر یا مسلح افواج کی سربراہ نہیں بن سکتی۔ وہ نمازوں کی امامت نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس پر کفائی جہاد فرض کیا گیا ہے۔

اور اسی طرح شریعت مرد اور عورت کے مابین ستر، گواہی اور میراث وغیرہ میں فرق کرتی ہے لیکن اقوامِ متحدہ ان تمام چیزوں کا انکار کرتی ہے۔

اور اسی طرح شریعتِ مطہرہ مسلمان اور کافر کے درمیان فرق کرتی ہے۔ ایک کافر اعلیٰ عوامی عہدوں یا عدلیہ کا حصہ بننے کا حقدار نہیں ہے۔ اس پر زکوٰۃ ادا کرنا لازم نہیں ہے۔ (نا صرف یہ) بلکہ شریعت تو مختلف قسم کے کفار میں بھی فرق کرتی ہے اور انہیں ذمی (اسلامی ریاست کے تحفظ اور ذمہ داری کے تحت)، مستأمن (پناہ گزین)، معاہد (کسی معاہدے کا فریق) اور حربی (جنگجو دشمن) میں تقسیم کرتی ہے اور اس معاملے سے متعلق فقہی تفصیلات موجود ہیں۔

تاہم اقوامِ متحدہ کا چارٹر، شریعتِ اسلامیہ سے متصادم، ایک نظریے اور قوانین کے مجموعے پر مبنی ہے جو دوسری جنگِ عظیم کے فاتحین باقی انسانوں پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔

چنانچہ اقوامِ متحدہ بین الاقوامی تعاون کی تنظیم نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی تنظیم ہے جسے بڑے مجرموں نے پوری انسانیت - خصوصاً مسلمانوں - کے اعتقادی نظام کو تبدیل کرنے کے لیے تشکیل دیا ہے۔

پنجم: چارٹر مردوں اور عورتوں کی ایسی آزادی کی توثیق کرتا ہے کہ وہ اخلاقیات اور مذہب کی پابندیوں سے خود کو آزاد کرا سکیں:

چارٹر کے آرٹیکل ۵۵ میں کہا گیا ہے:

”اقوامِ متحدہ جنس، نسل، زبان یا مذہب کے امتیاز کے بغیر سب کے لیے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام اور ان کی پاسداری کو فروغ دے گی۔“

چارٹر جس بنیادی آزادی کی پاسداری کرتا ہے وہ محض انسان کی باوقار زندگی گزارنے کی آزادی نہیں ہے؛ بلکہ یہ زنا، ہم جنس پرستی اور مرتد ہونے کی آزادی جیسی ہر قسم کی بے حیائی و بداخلاقی میں ملوث ہونے کی آزادی دیتا ہے۔ اس اصول کی تصدیق انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے سے ہوتی ہے اور اقوامِ متحدہ کی طرف سے منعقد کی گئی مختلف کانفرنسوں کے ذریعہ اس کی تائید ہوتی ہے۔ جس پر ہم انشاء اللہ بعد میں بات کریں گے۔ لہٰذا یہ شریعتِ مطہرہ سے ایک اور واضح تضاد ہے۔

ششم: چارٹر رکن ممالک کی سیاسی خود مختاری کے تحفظ اور ان کی علاقائی سرحدوں کے تقدس پر زور دیتا ہے اور کسی رکن ریاست کی جانب سے دوسرے کے خلاف طاقت کے استعمال سے منع کرتا ہے:

لہٰذا اگر کوئی ریاست چارٹر پر دستخط کرتی ہے تو وہ دیگر ریاستوں کی طرف سے مسلم سرزمینوں کو غصب کرنے کو ہر طرح سے تسلیم کرتی ہے اور ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے اُن کے حق کی تصدیق کرتی ہے۔ چارٹر کے دیباچے میں کہا گیا ہے:

”......اصولوں اور طریقوں کی قبولیت سے، اس بات کو یقینی بنانا کہ مشترکہ مفاد میں...، مسلح طاقت کا استعمال نہیں کیا جائے گا۔“

یعنی فوجی طاقت کے استعمال کی اجازت صرف اسی صورت میں دی جاتی ہے جب یہ رکن ممالک کے مشترکہ مفاد کی خاطر ہو۔ لہٰذا اگر فلسطینی مسلمان فلسطین کو اسرائیلی قبضے سے آزاد کرانے کی کوشش کریں اور دیگر مسلمان ان کو مدد کی پیشکش کریں تو اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی بنیاد پر اسے غیر قانونی سمجھا جائے گا کیونکہ اسرائیل ایک رکن ریاست ہے اور یہ اسرائیل کے مفاد میں نہیں ہے کہ مجاہدین اُس کے خلاف فلسطینیوں کی مدد کریں۔

چیچنیا، قوقاز اور وسطی ایشیا کے مسلم خطوں پر روسی قبضے، کشمیر پر ہندوستان کے قبضے، سبتہ اور ملیلا پر ہسپانوی قبضے، مشرقی ترکستان پر چینی قبضے، زیلع اور ہرر پر اِتھیوپیا کے قبضے، زنجبار پر تنزانیہ کے قبضے، صومالیہ پر کینیا کے قبضے اور مالی پر فرانسیسی قبضے پر بھی یہی تشبیہ لاگو ہوتی ہے۔ دوسری طرف شریعت ان سرزمینوں اور اس میں موجود لوگوں کو کفار کی بالادستی سے آزاد کرانے کے لیے جہاد کو فرضِ عین قرار دیتی ہے۔

مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر، جو احناف (رحمہم اللہ) کی معتبر کتب میں سے ہے، میں بیان کیا گیا ہے:

”اگر جہاد کے لیے نفیر کا اعلان کر دیا جائے تو یہ دشمن کے قریب رہنے والوں پر فرض عین ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ جہاد کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، جہاں تک دشمن سے دور رہنے والوں کا تعلق ہے تو اگر دشمن کے قریب رہنے والے لوگ مزاحمت کرنے سے قاصر ہوں یا مزاحمت کی صلاحیت ہونے کے باوجود سستی یا غفلت کا مظاہرہ کریں تب اُن سے آگے کے قریب والوں پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے اور پھر ان کے بعد والوں پر، یہاں تک کہ فرضیت کا دائرہ مشرق اور مغرب کے تمام لوگوں تک پھیل جاتا ہے۔“

شیخ عبد اللہ عزام (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں:

”اور یہی وجہ ہے کہ آج تمام امتِ مسلمہ پر جہاد فرضِ عین ہے۔ اور یہ آج فرضِ عین نہیں ہوا بلکہ جہاد اندلس کے سقوط کے دن سے فرضِ عین ہے، یعنی ۱۴۹۲ء سے۔ یہ پانچ صدیوں پہلے فرضِ عین ہوا تھا۔ اور امت پانچ صدیوں سے گناہ گار ہے کیونکہ وہ اندلس واپس لینے میں ناکام ہو گئی۔ جہاد آج ہر مسلمان پر فرضِ عین ہے۔ یہ افغانستان کی آزادی یا فلسطین کی آزادی سے ساقط نہیں ہو گا۔ یہ فرضِ عین اس وقت مکمل ہو گا جب ہم ہر اُس سرزمین کے ٹکڑے کو واپس لے لیں گے جو کبھی 'لا الہ الا اللہ' کے جھنڈے کے نیچے تھی۔ جہاد موت تک آپ پر فرضِ عین ہے جیسے پانچ نمازیں فرض ہیں اور موت تک وہ ساقط نہیں ہو سکتیں۔ اپنی تلواریں اٹھایئے اور زمینوں کو آزاد کروانے نکلیے۔ یہ فرضِ عین اس وقت تک ساقط نہیں ہو گا جب تک آپ اپنے رب سے نہیں ملتے۔ ایسے ہی جیسے آپ یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ میں نے پچھلے سال روزے رکھے تھے اس لیے اس سال نہیں رکھوں گا، یا میں نے پچھلے جمعے کی نماز ادا کی تھی اس لیے اس جمعے نہیں پڑھوں گا۔ اسی طرح آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں نے پچھلے سال جہاد کیا تھا اس لیے میں اس سال آرام کرنا چاہتا ہوں۔“

چارٹر کے دوسرے آرٹیکل کے چوتھے پیراگراف میں مذکورہ بالا اصول بیان کیا گیا ہے:

”تمام اراکین اپنے بین الاقوامی تعلقات میں کسی بھی ریاست کی علاقائی سالمیت یا سیاسی آزادی کے خلاف خطرے یا طاقت کے استعمال یا اقوامِ متحدہ کے مقاصد سے مطابقت نہ رکھنے والے کسی اور طریقے کے استعمال سے گریز کریں گے۔“

دسویں آرٹیکل میں ہر ریاست کی سیاسی آزادی اور علاقائی سالمیت کے احترام کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دستخط کرنے والی پارٹی کو رکن ممالک بشمول اسرائیل، ہندوستان، روس، چین، ہسپانیہ، اِتھیوپیا، کینیا اور مسلم سرزمینوں پر قبضہ کرنے والی دیگر ریاستوں کی علاقائی سالمیت اور سیاسی آزادی کا احترام کرنا ہو گا۔ لہٰذا اس قبضے کا احترام کرنا ہو گا اور اسے قانونی اور جائز تسلیم کرنا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بار بار اس موقف کا اعادہ کیا ہے کہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر دستخط کرنے والی ہر ریاست اِن ریاستوں کے مسلم سرزمینوں پر قبضے کو عملی طور پر تسلیم کرتی ہے جن کی آزادی شریعت کی رُو سے ہم پر فرض ہے۔

میں اپنے مسلمان بھائیوں، مجاہدین اور علمائے حق کے لیے یاد دہانی کے طور پر یہ وضاحت پیش کرنا چاہوں گا کہ مسلم دنیا کے تمام رکن ممالک نے اقوامِ متحدہ کے چارٹر پر دستخط کر کے اسرائیلی ریاست کو تسلیم کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چارٹر تمام رکن ممالک- بشمول اسرائیل -کی سالمیت اور تحفظ کو مقدس مانتا ہے۔

چارٹر پر دستخط کر کے انہوں نے اپنے تنازعات کے فیصلے شریعت کے مطابق نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے اور اس کے بجائے سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی سے فیصلے کروانے کو قبول کر لیا ہے۔ اس میں ۱۹۴۷ء میں فلسطین کو تقسیم کرنے کا فیصلہ، قرارداد ۲۴۲ اور دیگر قراردادیں شامل ہیں جن میں مسلمانوں کی رسوائی ہے اور انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

السحاب:

اس عذر کے بارے میں جو اقوامِ متحدہ سیاسی آزادی اور علاقائی خود مختاری کے احترام کے بہانے استعمال کرتی ہے، شہید صدر زلیم خان یندربی نے اپنی قیمتی کتاب ’چیچنیا، سیاست اور حقیقت کے درمیان‘ میں لکھا ہے۔

عیسائیت کے پیروکاروں کے حوالے سے یہ بات واضح ہے کہ اقوامِ متحدہ انہیں استعمار کے چنگل سے مکمل طور پر آزاد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ تاہم دیگر مذہبی گروہوں– خصوصاً اسلام کے پیروکاروں – کے معاملے میں اقوامِ متحدہ، نو استعمار کی مختلف شکلوں کی تخلیق اور قیام کے لیے ضروری حالات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

آسان الفاظ میں، غیر عیسائی قوموں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے اور انہیں ان کے حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے جو حکمران عیسائی ٹولہ ایسے ذرائع سے کرتا ہے جسے وہ مناسب سمجھتا ہے۔ ان کو اپنی تقدیر کا تعین کرنے کے حق سے انکار کرنے کے لیے اکثر استعمال کیے جانے والے ذرائع میں ریاست کی طرف سے ذاتی آزادیوں کا انکار یا ریاست کی سالمیت کے تحفظ اور اس کے انتشار کو روکنے کے بہانے کا استعمال ہے۔

ریاست کی سالمیت کا اصول تقریباً تیس سال پہلے بین الاقوامی قانون میں متعارف کرایا گیا تھا۔ اس کا مقصد ان ریاستوں کو امداد کی فراہمی کا جواز پیش کرنا ہے جو استعمار سے نجات کی کوششوں کو اپنے اہم مفادات کے لیے خطرہ سمجھتی ہیں۔ اور اس کے بعد سے یہ اصول ان مسلم اقوام کے خلاف استعمال کیا جا رہا ہے جو خود کو استعماری حکومت سے آزاد کرنا چاہتی ہیں۔

ہفتم: اقوامِ متحدہ کے رکن ممالک بتدریج اپنی آزادی کھو دیتے ہیں، محکوم ہو جاتے ہیں اور جنگوں میں تنظیم کو کنٹرول کرنے والے پانچ بڑے مجرموں کے مفادات کو محفوظ بنانے کے لیے بطور آلہ استعمال کیے جاتے ہیں:

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے آرٹیکل ۲ کے پیرا ۵ میں کہا گیا ہے:

”تمام اراکین اقوامِ متحدہ کو، موجودہ چارٹر کے مطابق ہونے والی کسی بھی کارروائی میں، ہر طرح کی مدد دیں گے اور کسی بھی ریاست کو امداد دینے سے گریز کریں گے جس کے خلاف اقوامِ متحدہ روک تھام یا نفاذ کی کارروائی کر رہی ہو۔“

۴۳ویں آرٹیکل میں کہا گیا ہے:

”اقوامِ متحدہ کے تمام اراکین بین الاقوامی امن اور سلامتی کی بحالی میں حصہ ڈالنے کے لیے سلامتی کونسل کو...... مسلح افواج، امداد اور سہولیات بشمول بین الاقوامی امن و سلامتی کو برقرار رکھنے کے مقصد سے راہداری کے حقوق فراہم کرنے کا عہد کرتے ہیں۔“

چارٹر کے ۴۵ویں آرٹیکل میں کہا گیا ہے:

”اراکین مشترکہ بین الاقوامی نفاذ کی کارروائیوں کے لیے قومی فضائیہ کے فوری طور پر دستیاب دستے رکھیں گے۔ ان دستوں کی قوت اور تیاری اور ان کے اقدامات کے منصوبوں کا تعین سلامتی کونسل کرے گی......“

آسان الفاظ میں، مسلمان اپنے ان مسلمان بھائیوں کے خلاف اقوامِ متحدہ کی حمایت کرنے کے پابند ہیں جن کے خلاف اقوامِ متحدہ جنگ لڑتی ہے۔ البتہ مسلمان اپنے ان دوسرے مسلمان بھائیوں کی حمایت کا حق نہیں رکھتے جن پر اقوامِ متحدہ یا اس کے رکن ممالک کی طرف سے جارحیت کی جاتی ہے، جیسے فلسطین، چیچنیا، عراق، افغانستان، بوسنیا اور صومالیہ۔

پس مسلمان ان طاقتوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے شروع کی گئی جنگوں میں بڑی مجرم طاقتوں کے غلام اور توپوں کے چارے بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاء بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللّهَ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ○

(سورۃ المائدۃ:۵۱)

”اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہیں میں شمار ہو گا۔ بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاء مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَتُرِيدُونَ أَن تَجْعَلُواْ لِلّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَاناً مُّبِيناً○ (سورۃ النساء:۱۴۴)

”اے اہلِ ایمان! مومنوں کے سوا کافروں کو دوست نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کا صریح الزام لو“

انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے (۱۹۴۸ء) کا جائزہ

اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے اس مختصر جائزہ کے بعد ہم ۱۹۴۸ء میں جاری کردہ انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے کا جائزہ لیں گے۔

اپنی کتاب 'فرسان تحت راية النبي صلى الله عليه وسلم' کے دوسرے ایڈیشن میں، میں نے اِس اعلامیے کو وضع کرنے میں دھوکہ دہی پر تبادلہ خیال کیا تھا، اِس اعلامیے کو تیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بڑی مجرم طاقتوں کے مفادات کی تکمیل کی جاسکے، باقی انسانیت پر اپنے اعتقادی نظام کو مسلط کیا جاسکے اور مسلم عوام کو اپنے آبائی علاقوں میں واپس جانے، اپنے حقوق کی بازیابی کرنے اور ان کو شریعت نافذ کرنے سے روکا جاسکے۔ تاہم، میں یہاں صرف چند واضح مثالیں بیان کروں گا کہ یہ اعلامیہ شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی اصولوں سے کس طرح متصادم ہے۔ مزید تفصیل میں جانے سے پہلے میں دو اہم امور کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:

اول: اقوامِ متحدہ دوسری جنگِ عظیم کے فاتحین کی اجتماعی مرضی کی نمائندگی کرتی ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے جاری کردہ انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ ان ریاستوں کے وژن اور مفادات کی نمائندگی کرتا ہے، بلکہ ان کے بے دین اعتقادی نظام کو باقی انسانیت – خصوصاً مسلمانوں – پر مسلط کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔

دوم: دوسری جنگِ عظیم کے اہم ترین نتائج میں سے ایک، اسرائیلی ریاست کا قیام تھا جسے ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو فاتح طاقتوں نے کھڑا کیا اور تسلیم کیا؛ یعنی اس ڈیکلریشن کے اعلان سے آٹھ ماہ پہلے۔ بلکہ حقیقت میں، ۱۹۴۷ء میں فلسطین کو تقسیم کرنے کی قرارداد کی منظوری دے کر، انہوں نے پہلے ہی صہیونی ریاست کے جواز کو تسلیم کر لیا تھا۔

مذکورہ اعلامیہ اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کی جانب سے جاری کیا گیا تھا جس کی سربراہی امریکی مندوب 'الیانور روزولٹ' نے کی تھی، جو سابق امریکی صدر 'فرنکلن روزولٹ' کی بیوہ تھی۔

سابق امریکی صدر 'فرینکلن روزولٹ' کی بیوہ 'الیانور روزولٹ':

”انسانی حقوق کا یہ عالمی اعلامیہ ہر جگہ کے تمام انسانوں کے لیے ایک بین الاقوامی 'میگنا کارٹا' بن جائے گا۔“

روزولٹ اسرائیل کے قیام میں حمایت کے ساتھ ساتھ یہودی کمیونٹی کے ساتھ اپنے گہرے تعلقات کے لیے جانا جاتا تھا۔ اس نے فروری ۱۹۴۵ء میں منعقدہ 'یالٹا کانفرنس' میں سٹالن اور چرچل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا جس میں روسیوں کو مشرقی یورپ میں اثر و رسوخ زون قائم کرنے کی اجازت دینے کے بدلے فلسطین میں یہود کے لیے ایک قومی وطن کے قیام اور یہودی ہجرت میں حائل تمام رکاوٹوں کو فوری طور پر دور کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔

جہاں تک اعلامیے کے مرکزی مصنف 'رینے کاسین' کا تعلق ہے، وہ ایک فرانسیسی سیاستدان اور اعلان کے وقت اقوامِ متحدہ میں فرانسیسی نمائندہ تھا۔ اعلان کے وقت الجزائر فرانسیسی قبضے میں تھا اور فرانس جبری طاقت، پھانسیوں، قید، تشدد اور ہر قسم کے جبر کے استعمال سے الجزائر کے عرب مسلم عوام کی زبان اور شناخت پر شدت سے مسلط تھا۔ مصنف ایک صہیونی یہودی تھا، جو اس مہم کا سرگرم رکن تھا جسے وہ لوگ 'یہودیوں کے حقوق' کہتے ہیں اور 'فرانس میں یہودی اتحاد' کا سربراہ تھا، جو شمالی افریقہ میں فرانسیسی استعمار کے آلات میں سے ایک تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ کی فلسطینی کمیٹی نے وسیع پیمانے پر یہودی امیگریشن اور یہودی وطن

کے قیام کے لیے فلسطینی اراضی کے استحصال کی اجازت کا مطالبہ کیا۔ اس شخص کی قیادت میں (فرانسیسی یہودی) اتحاد نے صیہونی تحریک کے سیاسی مقاصد کو محفوظ بنانے میں مدد کی۔ جس میں فلسطین میں زمین خرید کر عربوں کی ایک چھوٹی اراضی کو یہودی جائیدادوں میں تبدیل کرنا اور مشرقی یورپ سے آنے والے یہودی تارکین وطن کو نئی قائم شدہ زرعی کالونیوں میں آباد کرنا شامل ہے۔

یہ اس اعلامیے کے نظریاتی اور سیاسی پس منظر کا مختصر جائزہ تھا۔ (آیئے دیکھتے ہیں) اگر ہم نفسِ اعلامیہ کا جائزہ لیں تو ہمیں اس میں کیا ملے گا؟

اس اعلامیے کے دوسرے آرٹیکل میں کہا گیا ہے:

''ہر انسان اس اعلامیہ میں بیان کردہ تمام حقوق اور آزادیوں کا حقدار ہے، بغیر کسی امتیاز کے، جیسے نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب، یا سیاسی رائے یا دیگر رائے......''

اور یہ شریعتِ اسلامیہ کی مخالفت ہے جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا، کیونکہ کفار مسلمانوں کے برابر نہیں ہیں۔

میں آپ کی توجہ ایک بار پھر اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ دوسری جنگِ عظیم کے بے دین اور بد اخلاق فاتحین نے اِس اعتقادی نظام کو لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ اعتقادی نظام مسلمانوں کے عقیدے سے متصادم ہے جو اللہ کے اس قول پر یقین رکھتے ہیں کہ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں'' اور جن کے معاشرے -بدترین حالات میں بھی- توحید، شریعت کی تعظیم، معاشرتی برائیوں جیسے شراب، جوئے، زنا اور دیگر فواحش کی حرمت پر اپنے عقیدے سے ممتاز ہیں۔ اور یہ بے دین لوگ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ مسلمانوں کی طاقت کا راز ان کے عقیدے اور ان کی شریعت میں ہے۔ اور مسلمانوں کو ان کی طاقت سے دور کرنے کے لیے آزادی اور انسانی وقار کے لبادے میں بے حیائی و بد اخلاقی کا بازار لگانے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔

وہ اس منطق کا استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں کو پھنساتے ہیں کہ: اگر آپ باقی دنیا کے ساتھ عداوت اور مخالفت کی حالت میں نہیں رہنا چاہتے ہیں، اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا آپ کو تسلیم کرے اور قبول کرے تاکہ آپ دوسروں کے ساتھ برابری کی سطح پر ہوں تو آپ کو اقوامِ متحدہ میں شامل ہونا ہوگا۔ اور اقوامِ متحدہ میں شامل ہونے کے لیے آپ کو اس کے منشور پر دستخط کرنا ہوں گے، اس کی قرار دادوں کو قبول کرنا ہوگا اور اس طرح کفر سے لے کر بد اخلاقی تک ہر چیز میں اپنی رضامندی دینا ہوگی۔ اور ایک بار یہ کام ہونے کے بعد وہ مسلمانوں پر دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ اس طرح کے پروگراموں کو نافذ کریں اور ان کے نتیجے میں ہونے والی برائی کے تابع ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ سچ فرماتا ہے:

''(وہ) چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہوئے تو پھر تم سب برابر ہو جاؤ'' (سورۃ النساء: ۸۹)

اس اعلامیے کے تیسرے آرٹیکل میں کہا گیا ہے: ''ہر فرد کو زندگی، آزادی اور شخصی سلامتی کا حق حاصل ہے''۔

اس آزادی میں بے حیائی و بد اخلاقی اور مرتد ہونے کی آزادی بھی یکساں طور پر شامل ہے۔

سولہویں آرٹیکل میں کہا گیا ہے:

''نسل، قومیت، یا مذہب کی پابندی کے بغیر، پوری عمر کے مردوں اور عورتوں کو شادی کرنے اور خاندان بنانے کا حق ہے۔ وہ شادی کے لیے، شادی کے بعد اور اس کے تحلیل ہونے پر مساوی حقوق کے حقدار ہیں۔''

شریعتِ اسلامیہ اس اصول کو اس بنیاد پر مسترد کرتی ہے کہ یہ کسی غیر مسلم مرد کو مسلمان عورت سے شادی کرنے کی اجازت دیتا ہے اور یہ کہ یہ اصول مرد اور عورت کے مابین فرق نہیں کرتا۔

پانچویں آرٹیکل میں کہا گیا ہے:

''کسی بھی شخص کو تشدد، یا ظالمانہ، غیر انسانی، ہتک آمیز سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔''

سخت سزائیں حدودِ شرعیہ میں داخل ہیں جیسے قصاص، چور کا ہاتھ کاٹنا، کوڑوں کی سزا اور رجم۔

اٹھارہویں آرٹیکل میں کہا گیا ہے:

''ہر شخص کو فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں اس کے مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے کا حق بھی شامل ہے۔''

انیسویں آرٹیکل میں کہا گیا ہے:

''ہر ایک کو رائے اور اظہار کی آزادی کا حق حاصل ہے؛ اس حق میں، کسی مداخلت کے بغیر، رائے قائم کرنے اور کسی بھی میڈیا اور سرحدوں سے قطع نظر معلومات حاصل کرنے، وصول کرنے اور فراہم کرنے کی آزادی شامل ہے۔''

یعنی اس میں مرتد ہونے، لوگوں کو بے حیائی و بد اخلاقی کی دعوت دینے اور شریعت کو مسترد کرنے اور ان خیالات کی تشہیر کی آزادی شامل ہے۔

۲۱ویں آرٹیکل میں کہا گیا ہے:

"عوام کی مرضی حکومت کے اختیار کی بنیاد۔"

یعنی، اختیار لوگوں کی مرضی سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ سے۔ لہٰذا اگر عوام شریعت کے تحت حکومت کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو ان کے ذریعہ منتخب ہونے والوں کو شریعت کے تحت حکمرانی کرنا ہوگی۔ تاہم، اگر وہ شریعت کے علاوہ دیگر قوانین کے تحت حکومت کرنے کا انتخاب کرتے ہیں، تو حکومت کو شریعت کے علاوہ دیگر قوانین کے ذریعہ حکمرانی کرنا ہوگی۔

یونیسکو کی سرگرمیاں

یونیسکو اقوام متحدہ کی ایجنسیوں میں سے ایک ہے جو تعلیم، سائنس اور ثقافت کے شعبوں کی نگرانی کرتی ہے۔ اسے باضابطہ طور پر نومبر ۱۹۴۶ء میں اقوامِ متحدہ کی ایجنسی قرار دیا گیا تھا۔

یونیسکو کی سرگرمیوں کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ اس کی ایک اشاعت کا عنوان ہے 'انسانی نسل اور اس کی ثقافتی اور سائنسی ترقی کا انسائیکلوپیڈیا'۔ جس کی تیسری جلد کے باب دہم میں 'اسلام' کے بارے میں درج ذیل باتیں پائی جاتی ہیں (نعوذ باللہ):

i. اسلام یہودیت، عیسائیت اور عرب بت پرستوں کی رسومات سے اخذ شدہ ایک مرکب ہے۔

ii. قرآن ایک غیر فصیح کتاب ہے۔

iii. احادیثِ نبوی (ﷺ) لوگوں نے نبی (ﷺ) کے انتقال کے بعد ایجاد کی تھیں اور بعد میں آپ (ﷺ) سے منسوب کر دی گئیں۔

iv. مسلم فقہاء نے رومی اور فارسی قوانین، تورات اور کلیسا کے قوانین سے اسلامی نظامِ قانون اخذ کیا۔

v. عورت اسلامی معاشروں میں بیکار شے ہے۔

vi. اسلام نے اقلیتوں پر جزیہ اور خراج ٹیکس عائد کر کے انہیں زیر کیا۔

اس تنظیم کی مالی معاونت اقوامِ متحدہ کے رکن ممالک کرتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی ریاست اقوامِ متحدہ میں شامل ہو جاتی ہے تو وہ مسلمانوں کی دولت سے ادائیگی کرے گی تا کہ اقوامِ متحدہ ملحدوں اور اسلام کے دشمنوں کی مالی معاونت کر سکے۔

جب امارتِ اسلامیہ نے امیر المومنین ملا محمد عمر (رحمہ اللہ) کے دور میں بدھا کے بتوں کو مسمار کرنے کا فیصلہ کیا تو یونیسکو نے امارتِ اسلامیہ کے خلاف ایک ناپاک شیطانی مہم کی قیادت کی۔

اس وقت یونیسکو کے جاپانی بدھسٹ ڈائریکٹر، شیرو موتورا، نے بتوں کی تباہی روکنے کے لیے مختلف ریاستوں سے مداخلت کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کا وفد دس دن سے زیادہ افغانستان میں رہا تا کہ طالبان حکومت کو بدھا کے دنیا میں موجود سب سے بڑے دو بتوں کو تباہ کرنے سے روکا جا سکے۔ یونیسکو نے طالبان پر دباؤ ڈالنے کے لیے اور ان بتوں کو تباہی سے بچانے کی کوشش میں ان کی 'حالت زار' کو اجاگر کرنے کے لیے مختلف ممالک کے ۴۵ وزرائے ثقافت کو اکٹھا کیا۔

اقوام متحدہ اور مسلمانوں کے ساتھ اس کی عملی دشمنی:

اقوام متحدہ کی مذہب اور اخلاقیات سے دشمنی کے پہلوؤں میں خواتین اور آبادی کے بارے میں اس کی متعدد کانفرنسیں ہیں مثلاً ۱۹۹۴ء میں آبادی کانفرنس قاہرہ، ۱۹۹۵ء میں عورت کانفرنس بیجنگ، ۲۰۰۰ء میں عورت کانفرنس نیویارک اور اسی طرح کی دیگر کانفرنسیں۔

ان تمام کانفرنسوں میں اقوام متحدہ نے بے حیائی و بد اخلاقی کے پھیلاؤ کو فروغ دیا، جیسا کہ بدکاری اور ہم جنس پرستی، دیر سے شادی، طوائفوں کا احترام، شادی سے پہلے نوجوانوں کو بے حیائی و بد اخلاقی میں ملوث ہونے کی ترغیب اور مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق وغیرہ۔

فلسطین:

اقوام متحدہ نے ۱۹۴۷ء میں فلسطین کو تقسیم کرنے والی قرار داد منظور کر کے امتِ مسلمہ کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا۔ بعد میں، اسرائیل کو ۱۹۶۷ء میں منظور کی گئی قرار داد ۲۴۲ کے ذریعے فلسطینی سرزمین سے بہت بڑا حصہ دیا گیا۔

بوسنیا میں اقوامِ متحدہ کے جرائم، مسلمانوں کو اسلحہ برآمد کرنے پر پابندی اور سربوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے قتلِ عام میں اس کی عدم مداخلت سے بے نقاب ہوئے۔ اقوامِ متحدہ خاموشی سے صورتحال کا مشاہدہ کرتی رہی جیسا کہ سربرانیکا کے قتل عام کا معاملہ تھا جس میں صرف ایک ہی واقعے میں ۷۰۰۰ مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔

چیچنیا کے معاملے میں اقوام متحدہ نے اسے مجرم صلیبی روسی ریاست کا حصہ قرار دیا۔

یہ اقوام متحدہ ہی تھی جس نے عراق پر پابندیاں عائد کیں، جس کی وجہ سے پانچ لاکھ عراقی بچے موت کا شکار ہو گئے۔

یہ اقوام متحدہ ہی ہے جو کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کے فیصلے پر عمل درآمد سے انکار کرتی ہے جو تقریباً ساٹھ سال قبل منظور کیا گیا تھا۔

افغانستان کے معاملے میں، اقوامِ متحدہ نے بون کانفرنس میں امریکہ کے آلہ کاروں کو اکٹھا کیا اور دھاندلی زدہ انتخابات کی نگرانی کی۔ جنگ سے پہلے اور اس کے دوران اقوامِ متحدہ نے افغانستان پر پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ یہ افغانستان میں قتل عام کے باوجود خاموش تماشائی بنی رہی۔ مثلاً قلعہ جنگی کے قتل عام، شبر غان منتقلی کے دوران قیدیوں کا دم گھٹنے اور بگرام، قندھار، شبر غان اور گوانتاناموکی جیلوں میں ہزاروں افراد پر تشدد کے دوران۔

صومالیہ پر اقوامِ متحدہ کے جھنڈے تلے حملہ کیا گیا۔ جبکہ اِتھیوپیا، برونڈی، یوگینڈا اور کینیا کی فوجوں نے صومالیہ پر قبضے میں حصہ لیا۔

اقوامِ متحدہ نے جنوبی سوڈان کی علیحدگی اور اس کو ایک آزاد ریاست کے طور پر تسلیم کرنے میں فعال کردار ادا کیا۔

اقوامِ متحدہ اب لبنان کی سرحدوں کے ساتھ اپنی افواج تعینات کر رہی ہے تاکہ فلسطین سے باہر کے مجاہدین کا فلسطین کے اندر موجود مجاہدین سے رابطہ ختم کر دیا جائے، اور اس طرح فلسطین کا محاصرہ مکمل کر لیا جائے۔

یہ اقوام متحدہ ہی تھی جس نے مشرقی تیمور کی انڈونیشیا سے علیحدگی کو تسلیم کیا، جبکہ وہ چیچنیا، پورے مسلم قفقاز، کشمیر، سبتہ، ملیلا اور بوسنیا کے لیے علیحدگی کو مسترد کرتا ہے۔

اختتامیہ

حاصلِ کلام یہ کہ اقوامِ متحدہ ایک بین الاقوامی تعاون کی تنظیم نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک ایسی تنظیم ہے جسے دوسری جنگِ عظیم کے بے دین فاتحین نے باقی دنیا پر اپنی بالادستی اور اپنا اعتقادی نظام مسلط کرنے کے لیے تشکیل دیا تھا۔ مختصر یہ کہ یہ ایک ایسی تنظیم ہے جو اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتی، لوگوں کو بے حیائی، بداخلاقی اور ارتداد کی دعوت دیتی ہے، اسلام اور پیغمبرِ اسلام (ﷺ) کی توہین کرتی ہے اور مسلمانوں کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرتی ہے۔

تو ایک مسلمان جو اپنی شریعت کی تعظیم کرتا ہے...... بے حیائی، بداخلاقی اور ارتداد سے روکتا ہے...... اپنے دین اور اپنے نبی ﷺ کے بارے میں غیرت مند ہے اور اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرتا ہے...... وہ ایسی تنظیم کا حصہ بننے کو کیسے قبول کر سکتا ہے؟

کیا میں نے پیغام پہنچا دیا؟ اے اللہ! تو گواہ رہنا۔

وآخرُ دعوانا أن الحمدُ للهِ ربِ العالمين،

وصلى اللهُ على سيدِنا محمدٍ وآلِه وصحبِه وسلم.

والسلامُ عليكم ورحمةُ اللهِ وبركاتُه۔

بقیہ: انٹرویو زلمے خلیل زاد

انتخابات بہت ہی مسائل سے پُر ہوئے کہ صرف ایک اعشاریہ دو ملین لوگوں نے ووٹ ڈالا[1] اور آپ صورتِ حال ذرا دیکھیں کہ یہ جنگ ہار رہے ہیں اور عبد اللہ عبد اللہ اور اشرف غنی (آپس میں لڑ رہے ہیں)...... دو دو تقریباتِ حلف برداری ہو رہی ہیں کابل میں، ذرا تصور کریں...... لہٰذا ہمیں اشرف غنی کو پہلے سے ہی کہہ دینا چاہیے تھا کہ اگر تم مذاکرات سنجیدگی سے نہیں کرو گے تو تمہاری سپاہ کو ہم کسی قسم کی ملٹری سپورٹ نہیں دیں گے۔ بس اصل بات یہ ہے کہ وہ اپنے عہدے پر رہنا چاہتا تھا۔ پھر طالبان کابل میں داخل ہو گئے اور پھر انہوں (طالبان) نے (کابل سے) انخلا بھی کر دیا (اور وہ کابل انتظامیہ کے ساتھ مذاکرات کے لیے تیار تھے)، ایسے میں اشرف غنی بھاگ گیا اور اسی سبب سے وہ سب کچھ ہوا جو ہوا۔

☆☆☆☆☆

بڑی مصیبت!

''ہمارا مسئلہ صرف یہی نہیں کہ ہمارے حکمران غیروں کے ایجنٹ ہیں بلکہ اس سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہماری دینی تحریکیں ان طاغوتوں کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتیں۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ امیر المومنین ہیں لہٰذا ان کا احترام کیا جائے۔ بعض ان کو کشتیٔ نوح قرار دیتے ہیں حالاں کہ اس کشتی میں بیٹھنے والے کا انجام غرق ہونے کے سوا کچھ نہیں۔ دین کے نام پر اس سے بڑا جھوٹ اور دھوکہ ممکن نہیں۔ میں ان جماعتوں میں موجود مخلص لوگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی تحریکوں کو ایسے افراد اور ایسے افکار سے پاک رکھیں۔''

(محسنِ امت شیخ اسامہ بن لادن شہید رحمۃ اللہ علیہ)

(بحوالہ: 'اے اللہ! صرف تیرے لیے')

[1] افغانستان کی کل آبادی قریباً چار کروڑ ہے یعنی چالیس ملین اور اس میں صرف ایک اعشاریہ دو ملین یعنی محض بارہ لاکھ افراد نے ان کے دعوے کے مطابق ووٹ ڈالا (ورنہ ہماری اطلاع کے مطابق ووٹروں کی اصلی تعداد صرف پانچ سے چھ لاکھ تھی)، یعنی کل آبادی کے چالیسویں حصے نے۔ مزید لطیف بات یہ ہے کہ صرف کابل شہر تقریباً آٹھ ملین یعنی اسّی لاکھ آبادی کا شہر ہے اور کابل ہی دراصل امریکہ اور اشرف غنی کی حکومت کا اصل علاقہ تھا اور اگر آج افغانوں میں کسی کو طالبان کی حکومت سے شکوہ ہے تو وہ چند ہزار لوگ کابل ہی کے ہیں اور اس الیکشن میں خلیل زاد ہی کے مطابق اندازاً کابل کی بھی اسّی فیصد آبادی نے حصہ نہیں لیا۔ کیا جمہوریت اسی کو کہتے ہیں؟ (س خ)

شریعت اور عوام کی خواہشات

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی (دامت برکاتہ)-انتخاب و اضافہ: قاری ابو محمد عزام (زید مجدہٗ)

زیرِ نظر مضمون مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہ کا تحریر کردہ ہے جو 'مکتبہ دارالعلوم کراچی' کے نشر کردہ حضرت مفتی صاحب کے مجموعۂ مضامین 'نفاذ شریعت اور اس کے مسائل' سے لیا گیا ہے۔ یہ مضمون آپ نے تب تحریر فرمایا تھا جب جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت کے آخری ماہ و سال تھے۔ مضمون میں حضرت مفتی صاحب نے جمہوریت اور اسلام میں فرق واضح کیا ہے، حکمران طبقہ کی ذہنیت پر تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ پاکستان میں اسلام مخالف مقتدر طبقہ نفاذ اسلام سے بچنے کے لیے کیسے حیلے بہانے تراشتا ہے۔

آج حالات کیا ہیں اور ہمارا دین ہم سے کیا تقاضہ کرتا ہے، اس لحاظ سے کچھ ضروری اضافے ہم نے کیے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب کا مضمون من و عن نقل کیا جارہا ہے، جبکہ ہماری طرف سے کیے گئے اضافوں کو کھڑے قوسین '[]' میں درج کیا گیا ہے۔ (ابو محمد عزام)

۱۳ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ بمطابق ۵ دسمبر ۱۹۸۷ء کے روزنامہ "جنگ" میں صفحۂ اول پر جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی ہے:

> "مدینہ منورہ (نمائندہ خصوصی) وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے مدینہ منورہ میں پاکستانیوں کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملک میں وہی شریعت نافذ ہوگی جو سب کے لیے قابل قبول ہو۔"

کاش کہ ہمارے ملک کے انتظامی سربراہ اس کے بجائے یہ فرماتے کہ "ملک میں وہ شریعت نافذ ہوگی جو اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے قابل قبول ہو"۔ لیکن درحقیقت یہ فقرہ اس بات کی غمازی کررہا ہے کہ ذہن میں "نفاذِ شریعت" کا نہ صرف یہ کہ تصور واضح نہیں ہے، بلکہ وہ "شریعت" اور اس کے نفاذ کے بارے میں شدید غلط فہمیوں میں الجھا ہوا ہے۔ یہ غلط فہمیاں ایک ایسی ذہنیت کی پیداوار ہیں جس نے اس ملک میں چالیس سال سے نفاذِ شریعت جیسے اہم مسئلے کو معرضِ التواء میں ڈالا ہوا ہے۔

اس ذہنیت کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک "شریعت" کا نفاذ عوام کی مرضی کے تابع ہے، اگر عوام چاہیں گے تو وہ نافذ ہوگی ورنہ نافذ نہیں ہوگی۔ اس طرز فکر کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ایک عرصے سے "جمہوریت"، "جمہوری اقدار"، "جمہوری افکار" اور "جمہوری آزادیوں" کا وظیفہ سمجھے بوجھے بغیر اتنی کثرت سے پڑھا ہے کہ "جمہوریت" بذات خود "خیرِ مطلق" بن کر رہ گئی ہے، وہی ہمارے فکر و عمل کا آخری ہدف بنی ہوئی ہے، اسی کے قیام اور بحالی کے لیے ہم نے تن من کی بازی لگا رکھی ہے، اسی کو ہم نے ایسا "مرکز نجات" قرار دے رکھا ہے کہ گویا ہماری اجتماعی فلاح و بہبود کا ہر کام اسی "جمہوریت" سے حاصل ہوگا، اور جو بھلائی "جمہوریت" کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے حاصل ہو، وہ بھلائی کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہے۔

اسی ذہنیت کا ایک شاخسانہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک "اسلام" بھی وہی معتبر ہے جو جمہوری طریقوں سے یا جمہوری روایات کے تحت آئے۔ اس کے بغیر (معاذ اللہ) اسلام کی کوئی بات بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب تک یہ الٹا طرزِ فکر باقی رہے گا، ملک میں حقیقی اسلام کا نفاذ ہرگز نہیں ہوسکے گا، اس لیے کہ یہ طرزِ فکر "اسلام" اور "شریعت" کے بنیادی مفہوم ہی سے متضاد ہے۔ "اسلام" اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جانے کا نام ہے، اور اس کی "شریعت" کے واجب العمل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کا حکم ہے اور ایک بندے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ اسے مان کر اس پر عمل کریں۔ خواہ عوام اس سے خوش ہوں یا ناراض ہوں۔ اتباعِ شریعت کا مقصد مخلوق کو نہیں، خالق کو راضی کرنا ہے، لہٰذا اس کے نفاذ کے پیچھے قوتِ حاکمہ عوام کی مرضی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے۔ "اسلام" عوام کے پیچھے پیچھے چلنے اور ان کی خواہشات کی پیروی کے لیے نہیں، بلکہ ان کی قیادت و رہنمائی کرنے اور انہیں نفسانی خواہشات کی غلامی سے نکالنے کے لیے آیا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

> ﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ﴾ (سورة المومنون: ۷۱)
>
> "اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کے تابع ہوجائے تو آسمان و زمین میں فساد پھیل جائے۔"

"اسلام" تو ایسے ماحول میں آیا تھا کہ اس کے اردگرد عوام کی اکثریت شروع میں اسے ناپسند کرتی تھی، اگر "عوام کی مرضی" ہی فیصلہ کن ہوتی تو اسلام کو کبھی بھی نافذ ہونا نہیں چاہیے تھا۔ وہ تو ہمیشہ مخالفین کے نرغے میں پروان چڑھا ہے، اس نے لوگوں کے طعنے سہہ کر اور ملامتیں سن کر اپنی راہ بنائی ہے اور عوام کی خواہشات کے پیچھے چلنے کے بجائے ان کی اصلاح کو اپنی منزل مقصود قرار دیا ہے، لہٰذا "اسلام" کو "عوام کی مرضی" اور "جمہوریت" کے تابع قرار دینا درحقیقت اسلام کے بنیادی تصور ہی سے متضاد ہے۔

[[دینی تحریکات جب غلبۂ اسلام کے لیے ''جمہوری جدوجہد'' میں قدم رکھتی ہیں تو وہ اس مقصد کے لیے اُس راستے کو چنتی ہیں جو بنیادی طور پر اسلام کے عطا کردہ تصور سے الٹ، ایسا راستہ ہے کہ جس پر چل کر نہ پہلے کبھی اسلام غالب ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو گا۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہ نے نفسِ جمہوریت پر رد کیا ہے اور واضح فرمایا ہے کہ نفاذِ اسلام کے عمل کو عوام کی مرضی کے تابع کرنا کیسے اسلام کے منافی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دینی تحریکات اسلامی نکتۂ نظر سے بھی جب جمہوری سیاست میں شامل ہوتی ہیں تو ایسا کر کے وہ جمہوری تصور سے آزاد نہیں ہو جاتیں، بلکہ وہ اسی ہی کی اقدار کا پاس رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ عوامی حمایت کا حصول اپنا مقصد بنا لیتی ہیں۔ عوام کی اصلاح اور ان کی رہنمائی کا فرض پیچھے رہ جاتا ہے اور عوام کی حمایت اور ان کے پیچھے چلنا اصل مقصد بن جاتا ہے۔ اس جدوجہد نے جو نتائج اب تک برآمد کیے ہیں ان کا مشاہدہ ہم پچھلے ستر سالوں سے کرتے آرہے ہیں۔ اسلام لانا نہ لانا، شریعت نافذ کرنا اور نہ کرنا تو دور کی بات خود دینی جماعتیں اپنے دعوت و عمل میں اتباعِ شریعت پر ہی سمجھوتہ کرتی ہیں اور یوں تقاضۂ شریعت پورا کرنے سے محروم رہ جاتی ہیں۔ عوام کی اکثریت کو حامی بنانا ایسی مجبوری بن جاتا ہے کہ قدم قدم پر پھر اللہ کو راضی کرنے کی بجائے عوام کو راضی کرنا مقصود بن جاتا ہے اور یوں جوں جوں سفر بڑھتا ہے توں توں منزل سے دوری واقع ہوتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کو خیر باد کہا جاتا ہے اور اکثر کو تو منکرات تک کی بھی خاموش یا علانیہ تائید کرنا پڑتی ہے۔ حق و باطل کی تمیز کے لیے اہلِ حق اور اہلِ باطل کے درمیان وجہِ نزاع نظر آنا ضروری ہے مگر یہاں پھر کوئی ایسی بات اور موقف ظاہر نہیں کیا جاتا ہے کہ جو باطل پر شرعی نقطۂ نگاہ سے رد کرتا ہو، اس لیے کہ اسلامی نقطۂ نظر پیش کرنا عام لوگوں کے اندر مقبول نہیں ہوتا اور اہم یہ کہ جو طبقات عوام پر ناجائز کنٹرول رکھتے ہیں، یعنی میڈیا اور مقتدر طبقات، اسلامی نقطۂ نگاہ ان طبقات کے مفادات کا چونکہ مخالف ہوتا ہے اور ان کے ساتھ ٹکراؤ عوامی تائید سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہوتا ہے، اس لیے پھر ایک ایسا طرزِ بیان اور طرزِ تحریک اپنایا جاتا ہے جو شیطانی طاقتوں کو بھی مکمل طور پر مقبول ہو۔]]

پھر یہ بھی عجب ستم ظریفی ہے کہ عموماً ''سب کے لیے قابلِ قبول'' ہونے کے اس ''نظریے'' کی ساری زد بے چاری ''شریعت'' ہی پر پڑتی ہے، یہ خیال ہمارے ''جمہوریت پسند'' حکام اور دانش وروں کو بہت کم آتا ہے کہ جو قوانین ہم پر چالیس سال سے مسلط چلے آرہے ہیں وہ کتنے افراد کے لیے ''قابلِ قبول'' ہیں؟ وہ کون سے عوام ہیں جنھوں نے ان قوانین کو سندِ منظوری عطا کی ہے؟ اور ''سب کے لیے قابلِ قبول'' کی یہ شرط ان قوانین پر کیوں لاگو نہیں ہوتی......؟ وہاں تو حال یہ ہے کہ بدیسی اور غیر مسلم حاکم ہمارے سینوں پر بندوق رکھ کر یہ قوانین ہمارے سروں پر مسلط کر گیا، اور ہم ہیں کہ انہیں چالیس سال سے اپنے اوپر نہ صرف لادے چلے آرہے ہیں، بلکہ مسلمان عوام کی فریاد و فغاں کے باوجود اس بات پر مُصر ہیں کہ یہ قوانین غیر محدود مدت تک عوام پر مسلط رہیں گے، تا آنکہ ایسی ''شریعت'' وجود میں نہ آجائے جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اگر اسلام کو ٹھیک ٹھیک نافذ کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے ذاتی مفادات کو نقصان پہنچے گا، کسی کی آمدنی کم ہو جائے گی، کسی کے خرچ میں اضافہ ہو گا، کسی کی لیڈری جاتی رہے گی، کسی کے منصب پر حرف آئے گا، کسی کی بے مہار آزادی میں فرق پڑے گا، کسی کے عیش و تنعم میں کمی ہو گی، اور ایسے افراد جو ملکی مسائل کو اسی قسم کے مفادات کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہیں وہ یقیناً ایسے احکام کے نفاذ کی مخالفت کریں گے، یا کم از کم انہیں ناگوار سمجھیں گے جو ان کے ذاتی مفادات کے خلاف ہیں۔ اس کے علاوہ اسی ملک میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی تعداد کم ہے لیکن اثر و رسوخ خاصا ہے اور وہ نظریاتی طور پر اسلامی قانون کے بجائے لادینی طرزِ زندگی کو پسند کرتے ہیں، اور نفاذِ اسلام کے ہر اقدام کی کسی نہ کسی حیلے بہانے سے مخالفت کرتے رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ اسلام کے ٹھیک ٹھیک نافذ ہونے سے کیسے خوش ہو سکتے ہیں؟ لہٰذا ''سب خوش رہیں'' کی پالیسی کے ساتھ ''شریعت'' کا نفاذ عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر شریعت پر عمل کرنا ہے، اور اللہ کے لیے کرنا ہے تو اس کے لیے کچھ حلقوں کی مخالفت مول لینی ہی پڑے گی، اگر ہم اس مخالفت کے لیے تیار نہیں ہیں تو نفاذ شریعت کے کام سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔

[[حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہ نے جس اقلیتی طبقے کا ذکر کیا ہے یہ آج پہلے سے زیادہ قوی بھی ہے اور انتہائی مؤثر بھی۔ اس نے روزگار اور ترقی، بلکہ رزق تک کے راستوں پر بھی قبضہ جمایا ہوا ہے اور عوام کی فکر و اخلاق بنانے کے ادارے اور ہتھیار بھی ان ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کی یہ کوشش کوئی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ عوام شبہات و شہوات کے سمندر میں ہی ہمیشہ ڈوبے رہیں، ظاہر ہے یہ ہو گا تبھی تو اس طبقہ کے مفادات محفوظ رہ سکیں گے۔ ایسی صورتِ حال میں دینِ اسلام کے نفاذ کو اکثریت کی رائے کے تابع کرنا خدمتِ دین نہیں ہے، بلکہ دین و انسانیت کی خدمت یہ ہے کہ دعوتی، سیاسی اور عسکری میدان میں ایسی قوت تشکیل دی جائے کہ جو اکثریت کو غلام بنانے والی اس اقلیت کے ہاتھ روکے، اس کا مقابلہ کرے اور اس سے اس مظلوم اکثریت کو آزادی دلائے۔ یہی عقلی اور شرعی راستہ ہے اور اس کے سوا اگر کوئی راستہ ہم اپناتے ہیں اور صرف اسی پر دینی تحریکات کو پابند کرتے ہیں تو یہ نفاذ شریعت کے کام سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھونا ہے۔]]

تیسرے یہ ''سب کے لیے قابلِ قبول'' ہونے کی شرط تو ایسی ہے کہ اگر اس پر ٹھیٹھ معنی میں عمل کیا جائے تو کسی جمہوری ملک میں کوئی سیکولر قانون بھی نافذ نہیں ہو سکتا، کوئی بڑے سے بڑا جمہوری ملک بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے تمام قوانین سے اس کے تمام باشندے مکمل طور پر مطمئن اور خوش ہیں، کیونکہ سب کو پوری طرح خوش رکھنے کا کوئی طلسماتی نسخہ اس ٹھیٹھ جمہوری حکومت کے پاس بھی نہیں ہے جسے ''عوام کی حکومت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ

وہاں بھی زیادہ سے زیادہ یہی کیا جاسکتا ہے کہ اکثریت کی منظوری حاصل کرلی جائے، اور وہ اکثریت بھی قانونی اکثریت ہوتی ہے جس کا حقیقی اکثریت ہونا ضروری نہیں ہے۔

اب یہ منطق کسی قدر عجیب ہوگی کہ دنیا کی ہر بات کو نافذ کرنے کے لیے تو اکثریت کا اتفاق کافی ہو، لیکن ''شریعت'' کے نفاذ کے لیے سب کا اتفاق ضروری قرار دیا جائے، جس کا حصول کم از کم اسباب وظواہر کی اس دنیا میں عملاً ناممکن ہے۔

محترم وزیر اعظم صاحب نے جو بات کہی ہے کہ ''ایسی شریعت نافذ ہوگی جو سب کے لیے قابل قبول ہو'' تو شاید اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ ہمارے ملک میں مختلف فرقے یا مکاتب فکر پائے جاتے ہیں، اور نفاذ شریعت کے لیے ان سب کا اتفاق ضروری ہے۔

لیکن اس سلسلے میں بھی ہماری گزارش یہی ہے کہ اگر اس اتفاق کا مطلب یہ ہے کہ ہر ہر جزوی قانون پر تمام مکاتب فکر کا اتفاق ضروری ہے، تو ایسا اتفاق بھی بحالات موجودہ ناممکن ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلاف کا جو شور مچا ہوا ہے، کم از کم قانونی مسائل میں یہ اختلافات اتنے زیادہ اور اتنے سنگین نہیں ہیں، تاہم بہت سے جزوی قوانین ایسے ہیں جن میں مختلف مکاتب فکر کے نظریات آپس میں متضاد ہیں، اور ان جزوی قوانین کی حد تک سب کا اتفاق حاصل نہیں ہوسکتا۔

کیا اس عدم اتفاق کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ شریعت کبھی نافذ نہ ہو، اور انگریزی قانون بدستور مسلط رہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور اس مسئلے کا حل معقولیت کے ساتھ تلاش کیا جائے تو اس کے دو ہی راستے عقلاً ممکن ہیں، ایک یہ کہ کوئی بالاتر اتھارٹی ایسی ہو جو ان مکاتب فکر کے نظریات میں حق وباطل کا فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، اور اس فیصلے کے مطابق جو نظریہ حق ہو، اسے قانون بنا دیا جائے، لیکن اگر ایسی کوئی اتھارٹی موجود نہیں ہے تو پھر رفعِ نزاع کا کوئی راستہ اس کے سوا ممکن نہیں ہے کہ بنیادی طور پر شریعت کی اس تعبیر کو اختیار کیا جائے جو ملک کے اکثریتی مکتبِ فکر کی تعبیر ہو۔ البتہ جو معاملات عبادات اور نکاح و طلاق اور وراثت سے متعلق ہیں، ان میں ہر مسلم مکتب فکر کے لیے الگ قانون سازی کی جائے۔

چنانچہ ۱۹۵۱ء میں ملک کے تمام مکاتب فکر کے سربر آوردہ علماء نے جمع ہو کر جو ۲۲ دستوری نکات مرتب کیے تھے، اس میں سب نے اس اصول پر اتفاق کیا تھا کہ ملک کا عام قانون ایک ہوگا، لیکن ہر مکتبِ فکر کے شخصی قوانین میں اسی مکتب فکر کی تشریح و تعبیر معتبر ہوگی، اور یہی بات ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی طے کر دی گئی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا اس مسئلے کا کوئی حقیقت پسندانہ، منصفانہ اور قابلِ عمل حل کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

یہ حل ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء میں علماء کے مشترکہ اجتماع میں بھی تجویز کیا گیا تھا، اس کے بعد ۱۹۷۳ء کے دستور میں اسے باقاعدہ آئینی حیثیت بھی دے دی گئی۔ جس کے بعد فرقہ وارانہ اختلافات کا مسئلہ بھی ہمیشہ کے لیے طے ہو جانا چاہیے اور اب از سرِ نو اس مسئلے کو اٹھانا ایک طے شدہ بات کو بلاوجہ پیچیدہ بنانے کے مترادف ہے۔

آخر میں ہم محترم وزیر اعظم کی خدمت میں یہ دردمندانہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں شریعت کا نفاذ اس ملک کی حیات و بقاء کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی جسم کے زندہ رہنے کے لیے اس میں روح کا وجود ضروری ہوتا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں اور ہم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فرض عائد ہے کہ ہم اس کے احکام کو اس کی زمین میں نافذ کریں، اس لیے بھی ضروری ہے کہ پاکستان کا مقصد وجود ہی یہ تھا کہ اس خطے میں مسلمان اپنے دین کو عملاً برپا کریں۔ اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ حکومت کی وجہِ جواز اسلام کے نفاذ کے سوا کچھ اور نہیں، اور وہ انہی وعدوں کے ساتھ برسر اقتدار آئی ہے کہ وہ اپنے اقتدار کے زمانے میں نفاذِ اسلام کا فریضہ انجام دے گی۔

لہٰذا موجودہ حکومت پر پچھلی تمام حکومتوں سے زیادہ یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا یہ فریضہ اخلاص اور تن دہی کے ساتھ انجام دے۔ اقتدار نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا، یہ سایہ کسی بھی وقت ڈھل سکتا ہے۔ لیکن اقتدار کے سائے میں انجام دیے ہوئے اچھے برے کام صرف تاریخ ہی میں محفوظ نہیں ہوتے، بلکہ اس جہان میں بھی ریکارڈ ہو جاتے ہیں جہاں ہر انسان کو اپنے ہر عمل کا حساب دینا ہے۔

[[جنرل ضیاء کی حکومت ختم ہوئی، جو پاکستان میں 'اسلامائزیشن' کی کوشش کی معراج سمجھی جاتی ہے؛ نفاذ شریعت کا کہہ کر جنرل ضیاء نے ریفرنڈم کرایا اور پھر کئی قوانین بھی جنرل ضیاء نے آرڈیننس کے ذریعے نافذ کیے؛ اس کے باوجود بھی حقیقت یہ ہے کہ شریعت نافذ نہیں ہوسکی (حضرت مفتی صاحب مدظلہ کا یہ مضمون اس کا ثبوت ہے، کہ مذکورہ مضمون کے قریباً ایک سال یا کچھ کم عرصہ بعد ہی جنرل ضیاء الحق حادثے میں جاں بحق ہو گئے)۔ نیت اور ارادہ اللہ جانتا ہے اور اس کا فیصلہ اللہ کریں گے مگر اُس وقت کی مجموعی صورت حال دیکھ کر یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں اسلام اور اسلامی جذبات کا بھرپور استحصال ہوا۔ سیکولر جماعتوں کے مقابل دینی جماعتوں کی ہمدردیاں اور تائید تو خوب حاصل کی گئی مگر جنرل ضیاء الحق کی زندگی میں بھی اسلام عملاً ویسے کا ویسا (نعوذ باللہ) 'یتیم' ہی رہا، اور اس کے جانے کے بعد تو اسلامائزیشن کی ظاہری نمود و نمائش کی بساط بھی فوراً لپیٹ دی گئی اور صرف چند یادگار باقیات ہی رہ گئیں۔ ہاں اہلِ دین کے لحاظ سے دیکھا جائے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ماضی اور حال میں یہ فرق ضرور ہے کہ ماضی میں اہلِ دین نفاذِ دین کا مطالبہ کرتے تھے اور اس مطالبے کو عوامی اور قومی سطح پر موضوع بحث بھی رکھتے تھے مگر پچھلے بیس پچیس سالوں سے اس طرح کی کوئی سرگرمی نظر نہیں آتی، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ پاکستان میں رائج نظام میں

چونکہ ایسا کوئی مطالبہ پورا ہونا ناممکن ہے اور کوئی دوسرا آپشن دستیاب نہیں ہے، غالباً یہ اس وجہ سے کہ اہل دین مایوس ہو کر اب زیادہ 'حقیقت پسند' ہو گئے ہیں۔ اوپر سے 'اصل' مقتدر طبقات نے بھی ایسے کسی مطالبے پر سیاست کرنے سے یہ کہہ کر منع کر رکھا ہے کہ اس سے انتہا پسندی کو ہوا ملتی ہے (اس حوالے سے مفتی منیب الرحمٰن صاحب کی گواہی یاد رہے)، پس مین اسٹریم کے اہل دین دفاعی پوزیشن پر کھڑے ہیں اور دین کے غلبے کی جگہ اہل دین کے 'حقوق' بچانے کی فکر زیادہ نظر آرہی ہے۔ پھر مزید افسوس یہ کہ دوسری طرف اہلِ دین ہی میں ایک طبقہ یہاں قائم اس نظام باطل کے باوجود بھی ریاستِ پاکستان کو 'اسلامی ریاست' ثابت کرنے پر تلا ہوا ہے اور یہاں کے نظام اور اس کے حکمرانوں کو وہ سارے حقوق دے رہا ہے جو نظامِ خلافت اور شرعی اولوالامر حکمرانوں کے لیے ہی شریعتِ اسلامی کے لحاظ سے خاص ہوتے ہیں۔ اس سب کا نتیجہ ہے کہ عملی تحریک تو دور کی بات نفاذِ شریعت کی دعوت اور پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی بنانے کی پکار بھی قومی سطح پر ختم ہو گئی ہے۔]]

خدا کرے کہ اس حقیقتِ عظمٰی کے استحضار کے ساتھ ہم سب کے دل میں مخلوق کے بجائے اپنے خالق کو راضی کرنے اور اسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر پیدا ہو جائے، تو ہمارے تمام مسائل حل ہو جائیں۔

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه، آمين.

محمد تقی عثمانی

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ

چند اہم نقاط

[[ہم یہاں چند اہم نقاط عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ نفاذِ شریعت اور غلبۂ دین کا کام ایسا ہلکا نہیں کہ محض قانون سازی سے ممکن ہو جائے، ضروری ہے کہ شرعی نظام کو غالب کرنے کے لیے ایک ایسا مومن، صالح، قوی اور مجاہد گروہ بھی موجود ہو جو سب سے پہلے اللہ کے احکامات کو اپنے اوپر نافذ کرے اور پھر اس نظام کو نافذ کرنے کے لیے کھڑا ہو اور اس کے راستے میں جو نفس و شیطان کے بندے رکاوٹ بنتے ہیں، ان کا علاج بھی کر سکے۔ پاکستان میں نفاذ شریعت کا خواب ابھی تک شرمندہ تعبیر نہ ہونے کا ایک بڑا سبب ایسی جماعت کا مفقود ہونا ہے۔ دینی جماعتوں نے مطالبات کے ذریعے بعض قوانین اگر بنوا لیے تو چونکہ قوانین بنانے اور انہیں نافذ کرنے والے خود یہ اہل دین نہیں تھے، بلکہ اس سارے عمل میں یہ اُن طبقات اور قوتوں کی طرف دیکھ رہے تھے جو اسلام بے زار تھیں اور اسلام کا نام محض مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کرتی تھیں، لہٰذا ایک طرف تو انہوں نے اہم شرعی قوانین کو سرے سے شاملِ قانون ہی نہیں کیا اور دوسری طرف جو چند ایک اسلامی قوانین شامل کیے بھی تو قانون سازی اور پھر ان کی تنفیذ میں ایسے بڑے چور دروازے چھوڑے کہ جس کے سبب مثبت کی جگہ منفی اثر ہوا اور حدود و شریعت جیسے مقدس نام بھی کھلا مذاق بن گئے۔ تصور کریں کہ کبھی بھی کسی قاتل کو یہ کہہ کر سزا نہیں دی گئی کہ یہ قصاص ہے، شرعی حکم قاتل پر نافذ ہوا اور نہ ہی کسی زانی اور بدکار کو آج تک شرعی سزا دی گئی ہے۔ قانونِ توہینِ رسالت کا شور بہت رہا ہے مگر آج تک کسی ایک گستاخ کو بھی اس کے تحت سزا نہیں دی گئی ہے، بلکہ الٹا ایسے گستاخوں کو ریاستی تحفظ میں امریکہ و کینیڈا بھیجا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے مگر دوسری طرف اللہ کے دین کے ساتھ ظلم دیکھیے کہ ریمنڈ ڈیوس جیسے متکبر امریکی قاتل کو جب 'باعزت' امریکہ بھیجنا اور اپنے آقاؤں کی ناراضگی سے بچنا مقصد بن گیا تو اس کارِ قبیح کے لیے حدود قوانین کا سہارا لیا گیا اور اعلان ہوا کہ شرعی قانون کے تحت دیت ادا ہوئی اور معاملہ اسلامی قانون کے تحت ہی حل کیا گیا۔ یہ شریعت کے ساتھ ایسا مذاق ہے کہ آسمان نہ پھٹ پڑے اور زمین شق ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ محض قوانین کچھ نہیں ہیں، ایمان، قوانین اور اخلاق تینوں ایک ضابطہ حیات بناتے ہیں، جب تک قانون نافذ کرنے والی قوت خود اس ضابطۂ حیات کو دل و جان سے چاہنے والی نہ ہو تو کبھی بھی وہ ضابطۂ حیات میدانِ عمل میں رائج نہیں ہوتا اور کبھی بھی وہ قوانین نافذ نہیں ہو پاتے۔ لہٰذا اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر وجہ سمجھ آسکتی ہے کہ پاکستان میں جو بعض شرعی قوانین موجود ہیں وہ کیوں کر اسلام کی بجائے نظامِ باطل ہی کی خدمت میں استعمال ہوتے ہیں۔

آخری اور اہم بات!!

نفاذِ شریعت اور غلبۂ اسلام کی منزل کا راستہ فوجی انقلاب نہیں ہے۔ پاکستان میں ضیاء الحق، مصر میں جمال عبد الناصر اور سوڈان میں عمر البشیر جیسی مثالیں یہ حقیقت سمجھانے کے لیے کافی ہیں، دینی جماعتوں نے ان سب فوجی آمروں کی اقتدار سنبھالنے میں مدد کی، مگر تمام تر تعاون کا نتیجہ محض ان آمروں کے اقتدار کے استحکام کے طور پر ہی نکلا اور اسلام اُسی طرح اجنبی ہی رہا۔ یاد رہے کہ مصر میں اخوان المسلمین کو جمال عبد الناصر نے کچل دیا جبکہ اسے حکومت میں لانے کے لیے اخوان نے ہی کندھا دیا تھا۔ حکومت میں آنے سے پہلے ناصر نے اخوان کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اسے اقتدار میں لانے کے لیے اخوان ساتھ دے تو وہ حکومت میں آکر شریعت نافذ کرے گا۔ اخوان نے شرط قبول کی اور اس کی مدد کی مگر اقتدار میں آکر وہ وعدے سے مکر گیا اور اخوان کے خلاف خونی کریک ڈاؤن کر دیا۔

نفاذ دین کا راستہ جمہوری جدوجہد بھی نہیں ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نفاذ شریعت کے لیے سنجیدہ طبقات جمہوری کھیل تماشوں کا حصہ نہ بنیں۔ اسی طرح حکمران طبقات سے مطالبات اور ان کے سامنے احتجاجات کا شغل بھی مکمل طور پر لاحاصل ہے، نفاذِ شریعت کا عمل شریعت سے بے زار اور مغربی طرزِ حیات کے دلدادہ حکمران طبقے سے شروع نہیں ہوتا، یہ عمل نیچے سے شروع ہوتا ہے، اس کی جائے پیدائش معاشرہ ہے۔ اس کی تحریک عوام میں اٹھتی ہے، ''اتباع

شریعت اور نفاذ شریعت" کے محور کے گرد یہ تحریک لوگوں کو جمع ہونے کی دعوت دیتی ہے، ان کی تربیت اور صف بندی کرتی ہے۔ جمہوری سیاست کی آلائشوں سے یہ دامن بچاتی ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض شرعی مصالح و مفاسد کا خیال رکھ کر نبھاتی ہے۔ اس جدوجہد و سفر میں ایک وقت آتا ہے جب دعوت و اعداد کے ذریعہ یہ تحریک قوت پکڑتی ہے اور باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہونے کے پھر یہ قابل ہو جاتی ہے۔ ایسے میں پھر اگر کوئی داخلی یا خارجی طاقت اس انقلاب کا راستہ روکتی ہے، ہتھیار کے زور پر اسے دباتی ہے تو یہ بھی "وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا" پر عمل کرتی ہے اور بالآخر وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ!کو اپنا طریق و منزل رکھ کر میدانِ عشق میں اتر جاتی ہے، شہادتوں اور سعادتوں کی تاریخ رقم ہو جاتی ہے اور انعام میں اللہ کا دین اللہ کی زمین پر غالب ہو جاتا ہے۔

ضروری نہیں کہ اس تحریک سے خون کے دریا بہہ پڑیں اور پاکستان ایک نہ ختم ہونے والی خانہ جنگی کی طرف چلا جائے، پاکستان میں اہلِ دین کا طبقہ کم نہیں، یہ طبقہ عوام میں بھی ہے اور خواص میں بھی۔ پھر اللہ سے امید ہے کہ پاکستانی فوج میں بھی بہت جلد غلبۂ دین کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی کمی نہیں ہو گی۔ لہٰذا جس طرح افغانستان میں اللہ نے دعوت و جہاد کے ذریعہ وہاں 'امارت اسلامی' کی حکومت قائم کی، یہاں بھی بعید نہیں کہ کچھ عرصہ قربانیوں کے بعد 'امارت اسلامی پاکستان' قائم ہو جائے، پھر پاکستان کو چونکہ اللہ نے بڑی نعمتوں سے نوازا ہے، اس لیے ایسا ہونا پورے برصغیر بلکہ دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں کے لیے ایک انتہائی اچھا شگون ہو گا۔[[

☆☆☆☆☆

بقیہ: خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد از جنرل شاہد عزیز

سترہ دسمبر کی شام جنرل یحییٰ نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کیا اور ہمیں بتایا کہ مشرقی پاکستان میں اس پاک فوج نے ناپاک دشمن کے آگے اپنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ جان بچالی ہے۔ مسلمانوں کی فوج، جو اللہ اکبر کہتی تھی، کفر کے آگے جھک گئی۔ سر کا کام ہے جھکنا۔ جو اللہ کے آگے نہ جھکا، وہ کفر کے آگے ہی جھکے گا۔ جو سر اللہ کے آگے جھکتے ہیں وہ کٹ جاتے ہیں، کہیں اور نہیں جھکتے۔ جو غرور سے اٹھے رہتے ہیں، جن کی گردنوں میں اللہ نے طوق ڈال رکھے ہیں، وہ بادشاہ کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں یا کسی بھی ایسی دنیاوی طاقت کے سامنے جو ان کو ڈرا سکے یا فائدہ پہنچا سکے۔ جنھوں نے بادشاہ کے حکم پر اپنے مسلمان بھائیوں کا قتل کیا، اور سمجھا کہ بادشاہ کا حکم اللہ کے حکم پر حاوی ہے، جو چپ رہے، جنھوں نے اللہ کی راہ چھوڑ کر اپنے آقا کا ساتھ دینا اپنے مفاد میں سمجھا، جنھوں نے اپنے گروہ کو اپنا کارساز مانا، وہ ذلیل کیے گئے۔ ہم نے ملک کا آدھا جسم آقا کی بقا کے لیے بیچ دیا تھا۔ پھر اپنی شرمندگی چھپانے اور نئے آقاؤں کا بھرم رکھنے کی خاطر سب پر پردہ ڈال دیا۔ ہمارا ملک ٹوٹ چکا تھا۔ ہماری عزتِ نفس بھی، غیرت بھی اور ہماری شرم بھی مٹی میں مل چکی تھی۔ ہم سب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔"

پھر اتنا سب کچھ کھو کر بھی کسی کو کچھ افسوس نہ تھا۔ پھر بھی خیانتوں سے باز نہ آئے حالانکہ اسی غیر ذمہ دارانہ رویے کا بھیانک نتیجہ بھگت چکے تھے۔ چنانچہ جنگ کے بعد جب آڈٹ (حساب کتاب) شروع ہوا تو:

"جنگ میں جو کچھ سامان اور ہتھیار وغیرہ کھو گئے تھے، ان کا حساب کتاب چل رہا تھا... کسی کا کوئی حساب نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی خاصا سامان جنگ کی نظر ہو گیا تھا۔ پھر ایک ترکیب کی۔ ایک گاڑی دشمن کے ہوائی جہاز کا نشانہ بنی تھی۔ بس جس جس چیز کا کوئی حساب نہ بنا، گاڑی میں ڈال دی۔ آسان تھا۔ کہہ دیا کہ گاڑی کے ساتھ جل گئی۔ لسٹ اتنی لمبی ہو گئی کہ کسی نے کہا کہ یہ تو ایک کانوائے کا سامان ہے، ایک گاڑی میں کیسے آیا؟ مگر سب ہی کاغذی کارروائی پر آمادہ تھے۔ لکھ دیا گیا اور حساب ختم کیا۔"

تعارفِ مصنف

لیفٹیننٹ جنرل (ر) شاہد عزیز پاکستان کی ملٹری ایلیٹ میں ایک نمایاں نام ہیں۔ چیف آف جنرل سٹاف اور کور کمانڈر لاہور جیسے عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ ڈائریکٹر جنرل نیب (قومی احتساب بیورو) رہے۔ فوج کو آپ نے قریب سے دیکھا اور اس کو باطل جانا۔ بعد از ریٹائرمنٹ آپ نے اپنے ضمیر کی آواز پر اپنی خود نوشت 'یہ خاموشی کہاں تک' لکھی اور اس کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ کو القاعدہ برِّ صغیر کے سرکردہ ذمہ دار اور مجلّہ 'نوائے افغان جہاد' ('نوائے غزوۂ ہند' کا سابقہ نام) کے بانی مدیر حافظ طیب نوازؒ صاحب کے ذریعے براہ راست حق کی دعوت ملی۔ آپ نے حق کی دعوت کو سمجھا اور اس پر لبیک کہتے ہوئے جہاد سے وابستہ ہو گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ آپ میدانِ جہاد میں پہنچتے پاکستان کے خفیہ اداروں نے آپ کو گرفتار کر کے پسِ زنداں ڈالا اور یوں امریکی 'وار آن ٹیرر' میں فرنٹ لائن اتحادی اور امریکی وفاداری میں دین تو دین، اپنے 'ادارے کی وفاداری' (Military Comradeship) کو بھی پامال کیا۔ سال ۲۰۱۸ء کے وسط میں آپ کی شہادت کی خبریں منظرِ عام پر آئیں۔ بعض ذرائع نے شہادت کی اطلاعات کی تردید کی، لیکن مجاہدینِ القاعدہ برِّ صغیر کو اپنے ذرائع سے جو خبریں ملیں، ان کے مطابق مجاہد فی سبیل اللہ شاہد عزیز صاحب، شہید ہو چکے ہیں، اللہ پاک آپ سے راضی ہو جائیں اور آپ کو انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کی معیتِ حسنہ عطا فرمائیں، آمین۔ لیکن (گو کہ اس بات کا امکان بہت کم ہے) اگر آپ بحالتِ گرفتاری حیات بھی ہیں تو ہم دعا گو ہیں کہ اللہ پاک آپ کو ایمان پر استقامت کے ساتھ رہائی عطا فرمائیں۔ (ادارہ)

☆☆☆☆☆

جہاد اور مسئلہ قومیت

مولانا محمد مثنیٰ حسّان حفظہ اللہ

الحمد لله والصلوة والسلام على رسول الله وعلى آله وصحبه ومن والاه، وبعد

پچھلے کچھ عرصہ سے مجاہدین کی صفوں میں قومیت یا وطنیت کے دائرے میں اپنی جدوجہد کو منظم کرنے کا رجحان بڑھا ہے، اور خود جہادی حلقوں میں یہ موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ بالخصوص افغانستان میں امارتِ اسلامیہ کی فتح کے بعد اس موضوع نے مزید زور پکڑا ہے، اور امارتِ اسلامیہ کی مثال دیتے ہوئے بہت سے حضرات کی طرف سے مجاہدین کو اس رائے کی طرف دعوت دی جا رہی ہے کہ وہ اپنی جدوجہد کو وطنی یا قومی دھارے میں منظم کریں۔ اس جدید زیرِ بحث موضوع کے حوالے سے دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ شرعی اور واقعاتی پہلوؤں سے اس کا جائزہ لیا جائے، اس کی افادیت یا عدم افادیت کے حوالے سے اہلِ علم اور اہلِ فکر و دانش کے سامنے کچھ عرض کیا جائے اور اس کے عواقب کے حوالے سے بات کی جائے۔

دینِ اسلام میں قوم و وطن کی حیثیت

اسلام یقیناً ایک ایسا دین ہے کہ جس نے انفرادیت اور اجتماعیت، ہر دو کے مصالح کی پوری پوری رعایت کی ہے۔ یہ وہ واحد دین ہے جس میں دنیوی پیمانوں کے لحاظ سے بھی حقیقی فوائد و ثمرات کو سمیٹا گیا ہے، اور حقیقی نقصانات اور مفاسد کی روک تھام بھی کی گئی ہے، اگرچہ ظاہر بینوں کے یہاں بعض پیمانوں سے فوائد ہوں۔ قوم اور وطن چونکہ انسانی زندگی میں زندہ حقیقتیں ہیں، اس لیے اسلام نے اس حقیقت سے انکار نہیں کیا، بلکہ اس سے کسی بھی مسلمان کی وابستگی کو تسلیم کیا ہے۔ البتہ ان دونوں کو اتنی ہی حیثیت اور اتنا ہی مقام دیا ہے جو ان کی حقیقت ہے۔ یہی دینِ اسلام کا حسن ہے۔ اس نے دنیوی اشیاء کی حیثیتیں ان کی اصل حقیقتوں کے موافق متعین کر دی ہیں، اور جو بے اعتدالی اس حوالے سے انسانوں میں پائی جاتی تھی، اسے اعتدال عطا کیا ہے۔

قوم کی حیثیت متعین کرتے ہوئے قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا﴾[سورۃ الحجرات:۱۳]

”اور ہم نے تمہیں قوم اور قبیلوں میں بانٹ دیا، تاکہ تمہاری آپس میں پہچان اور شناخت ہو۔“

اسلام نے قوم یا قبیلے انسانوں کی الگ الگ شناخت اور علیحدہ علیحدہ پہچان کے لیے بنائے۔ پھر اپنی قوم اور قبیلے کو باہم جوڑے رکھنے کا بھی طریقہ سکھلایا اور وہ ہے صلہ رحمی۔ شارع علیہ السلام نے صلہ رحمی پر بے انتہا زور دیا۔ امام ترمذی اور امام احمد کی روایت میں ہے:

تعلموا من أنسابكم ما تصلون به أرحامكم، فإن صلة الرحم محبة في الأهل.

”اپنے نسب یاد رکھو، تاکہ تم صلہ رحمی کر سکو، بے شک صلہ رحمی خاندانوں میں محبت کا ذریعہ ہے۔“

قطع رحمی کو اس قدر سخت گناہ قرار دیا کہ سخت ترین وعیدیں اس کے بارے میں نازل ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو رحم کے رشتوں کو قطع کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے توڑ کر رکھ دیں گے۔ دنیا میں جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ سزا دے دیتے ہیں، ان میں سے ایک قطع رحمی ہے [كما رواهما أبو داود]۔

تاہم چونکہ انسانی جبلت میں خاندان اور قوم و قبیلے کی محبت و عصبیت کا مادہ از خود موجود تھا، اور جاہلیت میں یہی نہ صرف معیارِ حق، بلکہ معیارِ افضلیت تھا، تو اسلام نے اس بے اعتدالی کی روک تھام کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾[سورۃ الحجرات:۱۳]

”بے شک اللہ کے یہاں تم سب میں سے معزز وہی ہے جو تم سب میں تقویٰ میں آگے ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے ’قومیت‘ کو اسلام کے تابع کر دیا۔ قوم اس وقت لائقِ ستائش قرار دی گئی جب اسلام سے چمٹ جائے۔ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ انسانوں میں سے بہترین کون ہے؟ فرمایا: اللہ کے یہاں بہترین ان میں سب سے متقی ہے۔ دریافت کرنے والے کہنے لگے: اس کے بارے میں ہم نے سوال نہیں کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تو بہترین انسان اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام ہیں جو اللہ کے نبی کے بیٹے، اللہ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں۔ کہنے لگے: ہم نے اس کے بارے میں بھی سوال نہیں کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمانے لگے: تو کیا تم عرب کے قبیلوں کے بارے میں پوچھتے ہو؟ کہنے لگے: جی ہاں! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فخياركم في الجاهلية خياركم في الإسلام إذا فَقِهُوا.

”جو جاہلیت کے دور میں بہترین تھے، وہی اسلام کے دور میں بہترین ہیں جبکہ اسلام کی سوجھ بوجھ حاصل کر لیں۔“

یعنی اسلام سے قبل کے قومی یا قبائلی اوصاف بھی اسی وقت قابلِ اعتبار ٹھہرتے ہیں جب اسلام کی سوجھ بوجھ حاصل ہو جائے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے مختلف قوموں اور قبیلوں کو طبعی اور جبلی اعتبار

سے مختلف خوبیوں سے نوازا ہے، مگر ان خوبیوں کی وجہ سے وہ دوسروں کے مقابلے میں فائز اسی وقت ہوسکتے ہیں جب اسلام ان میں رچ بس جائے، اسلامی معیارات ان کے یہاں رائج العمل ہو جائیں اور ان اوصافِ حمیدہ کے سبب وہ خدمتِ اسلام میں آگے بڑھ جائیں۔

مسئلۂ قومیت میں 'مذموم' کیا ہے؟

جب اسلام نے قوم کی حیثیت کو تسلیم کیا ہے، اور اسلام کے تابع اس کے مفاخر بھی مانے ہیں، تو اب مسئلۂ قومیت میں مذموم کیا ہے؟ قومیت کے ذیل میں کئی پہلو قابلِ توجہ ہوسکتے ہیں، مگر بنیادی قبائح جن کی روک تھام اسلام نے کی ہے، ان میں تین قابلِ قدر ہیں، اور شاید یہی مذموم 'قوم پرستی' کی علامتیں ہیں:

اول: حق و باطل میں قوم معیارِ حق بن جائے اور ہر حال میں اس کا ساتھ دیا جائے

جب قومیت اسلام کے تابع کر دی گئی تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ حق میں قوم کا ساتھ دیا جائے، جبکہ باطل میں قوم کا ساتھ نہ دیا جائے۔ قومیت اس وقت مذموم قوم پرستی میں تبدیل ہوتی ہے جب ہر حال میں قوم سے محبت کا اظہار کیا جائے، قوم کی تائید و حمایت کی جائے اور قوم کا نعرہ بلند کیا جائے، بغیر یہ دیکھے کہ کہاں قوم یا قبیلہ حق پر کھڑا ہے اور کہاں ظلم واثم میں کھڑا ہے، ناحق کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اب چاہے اپنی قوم ظلم کرے، ناانصافی کی مرتکب ہو، ناحق کر رہی ہو، اپنی قوم کا ساتھ دیا جائے اور اس کے مظالم پر پردے ڈالے جائیں۔ اسلام مسلمانوں میں اس شعور کو خاص طور پر پیدا کرتا ہے کہ صلہ رحمی اپنی جگہ، قوم سے محبت بھی اپنی جگہ، مگر ناحق اور ظلم میں قوم کا ساتھ نہیں دیا جاسکتا۔ یہ اسلام کی روح کے منافی ہے۔ رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی ارشادات میں اس کی طرف تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ اور اسی کو اندھی 'عصبیت' کا نام دیا گیا ہے۔

سنن ابو داود میں سراقہ بن مالک کی روایت میں ہے کہ رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں ارشاد فرمایا:

> خيركم المدافع عن عشيرته ما لم يأثم.
>
> ''تم میں سے وہ بہترین ہے جو اپنے خاندان کا دفاع کرے، بشرطیکہ وہ (خاندان کا ناحق میں ساتھ دے کر) گناہ و ظلم کا مرتکب نہ ہو۔''

سنن ابو داود اور سنن ابن ماجہ میں سیدنا واثلہ بن اسقع سے مروی حدیث میں رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ عصبیت کیا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> أن تعين قومك على الظلم.
>
> ''یہ کہ تم ظلم میں اپنی قوم کی مدد کرو۔''

سنن ابو داود اور مسند احمد میں سیدنا عبد اللہ بن مسعود سے مروی حدیث میں ظلم و ناحق میں اپنی قوم کا ساتھ دینے والے کی شناعت بیان کرنے کے لیے رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال بیان فرمائی:

> من نصر قومه على غير الحق فهو كالبعير الذي ردي، فهو ينزع بذنبه.
>
> ''جو کوئی ناحق میں اپنی قوم کا ساتھ دے تو اس کی مثال اس اونٹ کی سی ہے جو کھائی میں جا گرے، اور اسے دم سے پکڑ کر نکالنے کوشش کی جائے [گویا خود بھی گناہ اور ہلاکت میں شریک ہوا]۔''

خود اس کی علت کی طرف بھی رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرما دیا۔ سنن ابو داود میں سیدنا ابو الدرداء کی روایت میں ہے کہ رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> حبك الشيء يعمي ويصم.
>
> ''کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے۔''

یہ خاندان، قوم یا قبیلے کی محبت ہوتی ہے جس کے سبب انسان حق و ناحق ہر حال میں اس کا ساتھ دیتا ہے، اور صحیح فیصلہ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ خود محض محبت تو محمود ہے، مگر اس کا یہ داعیہ کہ حق و ناحق دیکھے بغیر قوم کا ساتھ دیا جائے، یہ جرم ہے۔ مسند احمد اور سنن ابن ماجہ کی ایک حدیث میں ہے کہ رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا یہ عصبیت ہے کہ کوئی شخص اپنی قوم سے محبت کرے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> لا، ولكن من العصبية أن ينصر الرجل قومه على الظلم.
>
> ''نہیں، بلکہ عصبیت یہ ہے کہ کوئی شخص ظلم میں اپنی قوم کا ساتھ دے۔''

یہ وہ بنیادی پہلو ہے جو قوم پرستی کی بنیاد ہے کہ حق و باطل میں قوم خود معیار بن جائے۔ اور ہر حال میں قوم کا ساتھ دیا جائے، اس کی ابتداء قوم سے محبت سے ہوتی ہے، اور بعد میں یہ سیاسی شعار بن جاتا ہے۔ قوم پرستی کے جتنے نعرے بھی ماضی بعید و قریب میں لگائے گئے، وہ اسی کی مختلف تصاویر تھیں۔ ایسے کسی بھی سیاسی نعرے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اس سے اسلامی سیاست کی بنیادیں ہی ہل جاتی ہیں۔ ہمیں الحمد للہ مجاہدین اور ہر اس طبقے سے اس حوالے سے اطمینان ہے جو غلبۂ دین کی سیاست کر رہا ہے کہ وہ ایسی کسی قوم پرستی کی دعوت نہ اپنے منشور میں شامل کر سکتا ہے اور نہ اس کی طرف دوسروں کو بلا سکتا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہوا ہے کہ بعض جگہوں پر، بعض معاملات میں طبعی و سیاسی رجحانات کے زیرِ اثر جماعتی، گروہی یا قومی عصبیت کا مظاہرہ ہو جائے، تو ایسا دنیا کے کسی بھی نیک و صالح گروہ اور معاشرے میں ہو سکتا ہے۔ تاہم صالح گروہ یا معاشرہ خود فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے اس کی سرکوبی کر دیتا ہے۔

دوم: کوئی مسلمان قوم کسی دوسری مسلمان قوم پر فوقیت اور برتری کا رویہ اپنالے

قومیت کا دوسرا مذمتی پہلو جو پہلے پہلو کی نسبت اگرچہ خفی ہے، مگر زیادہ خطرناک ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام کے دائرے میں آنے کے بعد اب اسلام کسی بھی قوم یا قبیلے کو دوسری قوم یا قبیلے پر فوقیت یا برتری نہیں دیتا اور نہ ایسے کسی دعوے کو قبول کرتا ہے۔ بلکہ اسے مذموم اور گناہ و جاہلیت و عصبیت قرار دیتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اصل شرف و عزت کا معیار اسلام ہے، قوم یا قبیلہ نہیں ہے۔ لہٰذا سبھی مسلمان دنیوی اعتبار سے برابر ہیں۔ ٹھیک ہے کہ معاشرتی اعتبار سے کسی قوم کو دوسرے پر شرف حاصل ہو، جیسا کہ اہل بیت کو تمام دوسرے طبقات پر، لیکن اس کی بنیاد پر کوئی بھی دنیوی معاملہ اسلام نے روا نہیں رکھا ہے، کہ انھیں دنیا کے امور میں دوسرے طبقات پر فوقیت دی جائے اور حقوق کی تقسیم میں تفریق کی جائے۔ معاشرتی حقوق و فرائض میں اسلام سے وابستہ سبھی قومیں، قبیلے یا طبقات برابر ہیں[1]۔

مسند احمد میں سیدنا عقبہ بن عامر کی حدیث میں ہے کہ رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> أنسابكم هذه ليست بمسبة على أحد، ليس لأحد على أحد فضل إلا بدين وتقوى.
>
> ”تمہارے یہ نسب کسی مسلمان کے لیے عار یا کمتری کا باعث نہیں ہیں۔ کسی مسلمان کو دوسرے مسلمان پر برتری حاصل نہیں، ہاں کوئی برتری ہے تو وہ دین اور تقویٰ کی بنیاد پر۔“

امام طبرانی کی روایت میں ہے کہ رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> المسلمون إخوة، لا فضل لأحد على أحد إلا بالتقوى.
>
> ”تمام مسلمان بھائی ہیں، کسی بھی مسلمان کو دوسرے مسلمان پر برتری حاصل نہیں، مگر تقویٰ کی بنیاد پر۔“

یہاں یہ بات ضرور یاد رکھنے کی ہے کہ تقویٰ یا دینداری کو تفوق اور برتری کا معیار اسلام نے ٹھہرایا ہے، لیکن یہ سب اللہ کے دربار میں ہے۔ دنیا میں اسلام نے مسلمانوں کو کوئی پیمانہ یا کسوٹی نہیں عطا کی ہے کہ جس کی بنیاد پر تقویٰ کا وزن یا سکیل معلوم کیا جاسکے۔ اس لیے دنیوی پیمانوں میں تمام مسلمان برابر ہیں۔ مسلمانوں کو دنیا میں ایک دوسرے پر تفوق ثابت کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، بلکہ تواضع کا حکم ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> إن الله أوحى إلي أن تواضعوا حتى لا يفخر أحد على أحد، ولا يبغي أحد على أحد.
>
> ”بے شک اللہ نے میری طرف وحی فرمائی کہ (اے مسلمانو!) تم تواضع اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی مسلمان دوسرے کے مقابلے میں فخر نہ کرے، اور کوئی مسلمان دوسرے پر ظلم نہ کرے۔“

سوم: مسلمانوں کے اجتماعی مصالح کے مقابلے میں قومی مصالح کو ترجیح دی جائے

قومیت کے ذیل میں تیسرا مذموم پہلو جو دوسرے پہلو پر مترتب ہوتا ہے، اور جس نے ہمارے دور میں وبائے عام کی صورت اختیار کرلی ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی بھی قوم اپنے مصالح کو دوسری مسلمان قوم کے مصالح پر ترجیح دے، یا اس سے بڑھ کر مسلمانوں کے اجتماعی مصالح پر ترجیح دے، یا دوسرے لفظوں میں امت کے مقابلے میں قومی مصالح کو ترجیح دی جائے۔ اسلام نے تمام مسلمانوں کو اخوت کے رشتے میں جوڑا ہے۔ اسلام معاشرتی حقوق و فرائض کے باب میں تمام مسلمانوں کو برابر سمجھتا ہے، اسی لیے تمام مسلمانوں کے مصالح کی رعایت کو لازم کرتا ہے۔ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی قوم اپنی مصلحت کی رعایت کرے، چاہے اس سے دوسری مسلمان قوم کی مصلحت پر زد پڑ رہی ہو۔ اسی کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان قوم قومیت کے لبادے میں ایسی لپٹ جائے کہ اس کا مطمحِ نظر اور منشور محض اپنے قومی مفادات کا تحفظ رہ جائے، اور وہ دیگر مسلم اقوام یا امت کے تحفظ سے صرفِ نظر کرلے۔ یہ نظریہ یا فکر بھی اسلام کی روح کے منافی ہے۔ رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جسے کتنے ہی محدثین نے روایت کیا ہے اور صحیح بخاری کے الفاظ ہیں:

> ترى المؤمنين في تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم كمثل الجسد، إذا اشتكى عضوا تداعى له سائر جسده بالسهر والحمى.
>
> ”تم مومنین کو باہم رحمدلی، محبت اور ہمدردی میں ایک جسم کی مانند دیکھو گے، اگر کسی ایک عضو میں تکلیف ہو تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“

صحیحین کی دوسری حدیث میں ہے:

> إن المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا.
>
> ”ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایک عمارت کی مانند ہے کہ جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو تقویت دیتا ہے۔“

اس باب میں احادیث بے شمار ہیں، جنھیں یہاں بیان کیا جانا ممکن نہیں۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں وارد ہے:

> المسلم أخو المسلم، لا يظلمه ولا يخذله، ولا يحقره.

---

[1] صرف ایک استثناء ہمیں ملتی ہے، اور وہ ہے کہ حکومت کے معاملے میں قریش کو مقدم کرنا۔ یہ خالص تعبدی معاملہ ہے، قیاسی معاملہ نہیں ہے، کہ اس پر قیاس کرکے ہر زمانے کے لحاظ سے کچھ گروہوں یا قبیلوں کو معاشرتی اعتبار سے مقدم کیا جانے لگے۔ حکومت کے معاملے میں قریش کی مخصوصیت ایک الگ موضوع ہے اور اس پر علمائے اسلام نے کئی پہلوؤں سے بات کی ہے، یہاں ہم تفصیل میں نہیں جا رہے۔

”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ ظلم کی حالت میں اسے بے آسرا چھوڑتا ہے، اور نہ اس کی تحقیر کرتا ہے۔“

یعنی 'خذلان المسلم' اسلام کی نگاہ میں خود ایک جرم ہے۔ اگر قومیت اس سطح پر آجائے کہ اپنی قوم کا دفاع اور تحفظ تو ناگزیر، لیکن دوسری مسلم اقوام پر ظلم کو خود اپنے پر ظلم تصور نہ کیا جائے اور اس کے دفاع کو اپنے دفاع کے برابر خیال نہ کیا جائے، تو یہ خذلان ہے۔ اسلام اسے مسلمانی شان ہی قرار نہیں دے رہا۔ امام حاکم اور امام طبرانی کی روایت کردہ حدیث میں وارد ہے:

من لم يهتم بأمر المسلمين فليس منهم.

”جو کوئی مسلمان دوسرے مسلمانوں کی پریشانیوں میں فکر مند نہیں ہوتا تو وہ ان میں سے نہیں۔“

یہاں فکر مندی سے مراد محض دکھ اور غم کا اظہار نہیں ہے، جیسا کہ آج کے زمانے میں عام رسم بن گئی ہے، بلکہ وہ فکر مندی ہے جو عمل پر ابھارتی ہو، جب کہ استطاعت ہو۔

ہم مجاہدین کو بالعموم اور ان کے اہلِ علم و فکر کو بالخصوص ان آخری دو پہلوؤں کے متعلق خبر دار کرنا چاہتے ہیں، کہ قومی یا وطنی دھارے میں تحریکِ جہاد کو منظم کرنے میں ان آخری دو پہلوؤں کا حل کیا نکالا جائے گا۔ موضوع زیرِ بحث سے متعلق موجودہ دور کی صورتِ واقعہ میں عالمِ کفر کی سازشوں اور جاری جہاد پر بات کرنے سے قبل مسئلہ وطنیت پر بھی چند جملے پابندِ تحریر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مسئلہ وطنیت

وطنیت کا معاملہ بھی قومیت کے معاملے سے کچھ مختلف نہیں ہے، اور اسلام نے اس کی بھی حیثیت واقعاتی حقیقت کے مطابق متعین رکھی ہے۔ البتہ وطن کا معاملہ تو خود قوم سے بھی ہلکا ہے۔ وطن تو اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان آباؤ اجداد کی نسبت سے توطّن اختیار کرے، یا جسے بعد میں خود جا کر رہائش کے لیے اختیار کر لے۔ وطن سے بھی انسانی محبت مسلم حقیقت ہے۔ کوئی بھی سلیم الفطرت، سلیم الطبع انسان اپنے وطن سے محبت کرتا ہے۔ خود رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے وطن مکہ سے ہجرت پر مجبور ہوئے تو انتہائی جذباتی انداز میں یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے:

ما أطيبك من بلد، وأحبك إلي، ولولا أن قومي أخرجوني منك ما سكنت غيرك.

”(اے مکہ!) تو سب سے بڑھ کر پاکیزہ اور سب سے بڑھ کر مجھے محبوب ہے۔ اور اگر میری قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں کبھی تیرے علاوہ میں رہائش اختیار نہیں کرتا۔“[رواہ الترمذي]

وطن سے محبت یقیناً انسانی فطرت کا حصہ ہے، جس طرح اپنی قوم سے محبت ہے۔ البتہ میں نے عرض کیا ہے کہ وطن کا معاملہ قوم سے ہلکا ہے، کیونکہ خود رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو جس قدر اپنے وطن سے محبت تھی، مگر جب اسلام نے انھیں دوسرے وطن سے جوڑ دیا تو وہ اسی وطن کے ہو رہے، اور وہ تمام مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ چھوڑ گئے تو دوبارہ مکہ میں نہ لوٹے۔ اسلام نے تو رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے پیغمبروں کو بھی اسلام کی خاطر ہجرت کروائی ہے، اور وطن کو چھڑوایا ہے۔ 'ہجرت' یعنی ترکِ وطن پیغمبرانہ سنت ہے، اور اسلام نے اسے ہمیشہ جاری رکھا ہے۔ لہٰذا اگر وطن اسلام کے لیے سازگار نہ ہو، تو اب اس وطن سے چمٹے رہنے کی دعوت اسلام نہیں دیتا، بلکہ اسلام ایسی جگہ کو وطن بنانے کی دعوت دیتا ہے جہاں اسلام ہو۔ لہٰذا وطن کی حیثیت تو قوم سے بھی کمتر ہے۔ ہاں! اپنے وطن سے محبت کے سبب مسلمان کے دل میں یہ داعیہ ضرور ہونا چاہیے کہ اس کا وطن اسلام کا گہوارہ بن جائے اور وہ اس کی کوشش کرے۔ یہی اس کی وطن سے محبت کا حق ہے۔ پھر جبکہ اس کا وطن وہ ہو جہاں صدیوں سے اسلام غالب رہا ہو، اور اب مغلوب ہو، تو اب از روئے اسلام اس وطن پر دوبارہ اسلام کو غالب کرنے کے لیے جہاد اس پر واجب ہے۔ معلوم ہوا کہ وطن خود کوئی معاشرتی حقوق رکھنے والی چیز نہیں ہے، جیسا کہ قوم ہے۔

رہ گئے موجودہ دور میں کھینچی گئی لکیروں کے ممالک، تو انھیں وطن کہا جائے، تو ظاہر ہے کہ اس معنی میں درست ہے کہ کسی مسلمان کا کسی خاص ملک میں پیدا ہونا یا رہائش رکھنے سے وہ ملک اس کا وطن کہلانے لگے، لیکن اس کی حدود کی بنیاد پر معاشرتی حقوق متعین ہونے لگیں تو یہ اسلام کی رو سے جائز نہیں ہے۔ موجودہ دور کی حقیقت اس کے برخلاف ہے کہ یہ لکیریں مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے کی غرض سے کفارِ عالم نے کھینچی ہیں، کہیں ریڈ کلف اور ڈیورنڈ نے، کہیں چرچل نے اور کہیں سائیکس اور پیکو نے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان ممالک کو ہی برا بھلا کہا جانے لگے اور اپنے پاسپورٹ وغیرہ جلا کر اسلام سے اپنی ولاء و وفاداری کو ثابت کیا جائے۔ یہ ممالک ایک واقعاتی حقیقت ہیں، اور اپنے وطن سے انسان کو محبت ہونی بھی چاہیے، دیکھنا یہ ہے کہ یہ ممالک اسلام کی تعلیمات اور مسلمانوں کے حقوق کے معاملے میں رکاوٹ نہ بنیں اور ان ممالک میں غلبۂ اسلام کی صورت بنتی جائے۔ کوئی مسلمان کسی بھی ملک اور وطن سے تعلق رکھتا ہو، اس وطنیت کی بنیاد پر دوسرے مسلمانوں کے حقوق کی ادائیگی میں تفریق نہ کرے، اور اسلام کو ان ممالک کے اندر بند نہ کرے، کہ ہر ملک کا الگ اسلام ہو۔ اس معنی میں جدید ریاستوں نے یقیناً مسلمانوں میں تفریق پیدا کر دی ہے اور ہر ریاست کے مسلمان کی وفاداری اور بیزاری کا معیار اس کا ملک بن گیا ہے۔ اسی معنی میں اقبال مرحوم نے وطن کو تازہ خداؤں میں سے سب سے بڑا قرار دیا تھا اور اس کے پیرہن کو اسلام کا کفن قرار دیا تھا۔

موجودہ دور میں عالمِ کفر کی کوشش اور مجاہدین کے لیے چیلنجز

مذکورہ بالا بحث اپنی جگہ، اب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اور جس ماحول میں جی رہے ہیں، اس میں مسلمانوں کی سیاسی و معاشرتی حالت کیا ہے، اور ان کے مقابلے میں کفار کی سیاسی حالت کیا ہے؟ اور اس حالت تک پہنچنے کے کیا مراحل ہوئے ہیں؟ تفصیل میں نہیں جاتے، اپنے موضوع سے متعلقہ امور پر بات کرتے ہیں۔

مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات کے مطابق اپنی معاشرتی و سیاسی ہیئت کو ایک اکائی پر مرکوز رکھا، یعنی خلافت۔ اسلام نے چونکہ مسلمانوں کو ایک جان قرار دیا، یہ صرف نظریہ کی حد تک نہیں تھا، بلکہ اس کا عملی ظہور لازمی تھا۔ لہٰذا مسلمان سیاسی طور پر جہاں جہاں غالب ہوتے گئے، ایک مرکز سے جڑتے رہے اور جوڑتے گئے۔ اس خلافت میں بھی اسلام کی روح اتفاق و وحدت تھی، یہاں تک کہ حکمران کے 'انتخاب' کو بھی اسلام نے اسی اصول سے منسلک کیا۔ تاہم بدقسمتی سے اور بمشیتِ ایزدی یہ روش حکمران کے انتخاب کے معاملے میں زیادہ نہ چلی، اور بزور حکومت حاصل کرنے کی رسم چل نکلی، جسے 'ملوکیت' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ بات پھر بھی مسلمہ رہی کہ ایک مرکزِ خلافت ضرور مسلمانوں نے ہر حال میں برقرار رکھا۔ تاکہ مسلمانوں کی اجتماعی وحدت ٹوٹنے نہ پائے۔ یہ سلسلہ انتہائی زوال کے حالات میں بھی بدستور رہا اور یہ سلسلہ خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور تک چلتا رہا۔ اسی لیے اگر ایک حکمران خاندان ضعیف ہو جاتا تو دوسرا خاندان اس مرکزیت کو قائم رکھنے کے لیے آگے بڑھ جاتا۔ حتیٰ کہ اس تمام دور میں خلافت کی چھتری تلے بعض خاندانوں نے اپنی اپنی سلطنتیں بھی قائم کرلیں، تو وہ بھی اسلام کی سیاسی خدمت کو اپنی ترجیح میں رکھتیں، اور مرکزِ خلافت سے جڑنے کی رسم کو نہ چھوڑتیں، الا معدودے چند کے۔ یہی وجہ ہے کہ القدس کی بازیابی سے مرکزِ خلافت معذور ہوا تو مصر سے کُردی جوان ایوبی نے یہ خدمت اسلام کے لیے انجام دے دی، تاتاریوں کے فتنے کی سرکوبی مرکز کے بس سے باہر ہوئی، تو مملوکوں نے بڑھ کر یہ کام مرکز کو کر دیا، یورپ میں سپین کے مسلمان عیسائی کفار کے سامنے بے بس ہوئے تو افریقہ سے یوسف بن تاشفین نے وہاں کا رخ کیا۔ اور جب مسلمانوں کی اکثر سلطنتیں مسلمانوں کی وحدت اور غلبے کو برقرار رکھنے سے عاجز ہوئیں تو ترک عثمانیوں نے جا علم اٹھایا؛ ایک طرف مختلف خطوں کے مسلمانوں کو متحد کیا اور دوسری طرف کفار کی شورشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے سرحداتِ اسلام کو آگے بڑھایا۔ اموی ہوں، عباسی ہوں یا عثمانی ہوں، اسی وقت مسلمانوں کی نگاہ میں محترم ہوئے جب انھوں نے کسی قوم کی شناخت نہیں اپنائی، بلکہ نعرہ اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کا اپنایا اور مسلمانوں کے مقدسات کے تحفظ کو اپنا منشور بنایا۔ اسی طرح سلجوقی، زنگی، ایوبی، مملوک، مرابطین، مغل بھی اسی وقت مسلمانوں میں مقبول ہوئے جب ان کا شعار اسلام اور بلا تفریق قوم وملت مسلمانوں کا دفاع بنا۔

یہ مرکزیت کا سلسلہ اس وقت زوال پذیر ہوا جب مسلمانوں میں قومیت کے نعرے بلند ہوئے۔ خلافتِ عثمانیہ کے باہر سے عرب قومیت کا نعرہ بلند ہوا جس کی بنیاد پر خلافت کے خلاف شریف حسین اور فیصل نے بغاوت کی اور داخل سے طورانی قومیت کا نعرہ بلند ہوا جس کی بنیاد پر خلافتِ عثمانیہ کو توڑ کر ترکی کی قومی ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ سب حقائق ہیں، اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ ان قومیتوں کے نعروں کے پیچھے مغربی طاقتوں کا ہاتھ تھا، اور انھوں نے مسلمانوں کی مرکزیت کو توڑنے کے لیے اولاً خفیہ اور آخراً اعلانیہ پشت پناہی کی۔ فارسی قومیت کے حامل صفویوں نے تو کچھ عرصہ پہلے سے ہی مسلمانوں کے مرکز سے ناطقہ توڑ رکھا تھا، اور بعد میں وہ بھی مغربی طاقتوں کے ساتھ اس گھناؤنے کھیل میں شریک ہوگئے، گو انھوں نے اہلِ سنت کے مقابلے میں شیعیت کا بھی سہارا لیا۔

پھر خلافت کے سقوط کے بعد مغرب نے عرب قومیت کے جن علمبرداروں کو اپنے مقصد میں استعمال کیا اور پورے عرب خطے کی بادشاہت کا خواب دکھلایا، ان کا خواب بھی پورا نہیں ہونے دیا اور عرب قومیت کے علاقوں کو کتنے ہی ممالک میں تقسیم کرکے الگ الگ کر دیا۔ یہ وہ تاریخ ہے جو موجودہ مسلم نقشے کے وجود میں آنے کا پتہ دیتی ہے۔ آج بھی عالمِ غرب کا مفاد اسی میں ہے کہ مسلمان مختلف قومیتوں میں بٹے رہیں اور مختلف علاقوں میں بند رہیں، کیونکہ انھوں نے جس محنتِ شاقہ سے موجودہ عالمی نظام کا تسلط قائم کیا ہے اور اپنی طاقتیں بنائی ہیں، وہ اس وقت تک ہی برقرار رہ سکتی ہیں جب تک مسلمانوں میں بہ حیثیت امت بیداری اور بہ حیثیت امت غلبے کی سوچ پیدا نہ ہو۔ موجودہ سیکولر نظام کی بقا اسی میں ہے کہ مسلمان اپنی جدوجہد کو اپنے اپنے علاقوں تک محدود رکھیں، افغانستان کے دفاع کے لیے حجاز سے کوئی مجاہد نہ آئے، کشمیر کے دفاع کی آواز افغانستان سے بلند نہ ہو، فلسطین کی بازیابی کے لیے کسی بھی مسلم ملک کا نوجوان نہ نکلے۔ انھوں نے دیکھا کہ روس کے حملے کے دوران جب تمام مسلم ملکوں کے مسلمان افغانستان کے جہاد میں شریک ہوئے تو اس کے نتیجے میں ساری دنیا میں جہاد کے محاذ کھل گئے اور مسلمانوں کو امریکہ و مغرب کے خلاف جہاد کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ یہ غلطی دوبارہ نہیں کرسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب ہر اس خطے میں جہاں جہاد کھڑا ہو گیا ہے، جہاد کو 'لوکلائیز' [مقامی] یا 'نیشنلائیز' [قومی] کرنا چاہتے ہیں، تاکہ باہر سے کوئی مسلمان اس کی مدد نہ کرسکے، اور وہاں کے مقامی یا قومی جہاد کے اثرات دوسرے خطوں میں نہ پہنچ سکیں۔ یوں عالمی طاقتوں کی عالمی اجارہ داری کو کوئی خطرہ نہ ہوسکے، اور وہ جب جس جگہ چاہیں وہاں کے مسلمانوں کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنائیں۔ پھر جہاد کو لوکلائیز یا نیشنلائیز کرنے کے بعد ان کے پاس یہ سہولت ہے کہ وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق جیسے چاہیں، رخ دے لیں۔ اگر کوئی مجاہد امارتِ اسلامیہ کی مثال کو سامنے رکھتا ہے تو اسے دوسری طرف شام کی مثال کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ جب تک شام تمام مسلمانوں کا قضیہ تھا اور ہر مسلم ملک کے نوجوان وہاں شریکِ جہاد ہو رہے تھے، شام میں مجاہدین دمشق کی فصیلوں تک پہنچ چکے تھے، لیکن جیسے ہی وہاں عالمی طاقتوں کی سازشوں

اور ترکی اور سعودیہ کی حکومتوں کی دخل اندازی سے وہاں کے جہاد کا رشتہ دیگر خطوں کے جہاد سے کاٹ دیا گیا[1] تو آج ایک 'ادلب' کے علاقے میں مجاہدین اور ان کے حامی عوام محصور ہیں، اور وہ بھی ترکی کی حکومت کی سیاست کے تابع بن چکے ہیں[2]۔ وہاں کی سب سے بڑی جہادی جماعت ہیئۃ تحریر الشام نے اپنے منشور کو کھلے لفظوں میں 'مقامی' کر لیا ہے، اور وہاں موجود کسی بھی مجاہد کو وہاں بیٹھ کر دیگر کسی مسلم خطے پر کفار کی جارحیت کے خلاف بولنے تک پر 'قریباً' پابندی ہے۔ کتنے ہی مخلص مجاہدین کو پابندِ سلاسل کر دیا گیا ہے، بالخصوص مہاجر مجاہدین زیرِ عتاب ہیں۔

ہم مجاہدین کو یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں جہاد لوکلائیز نہیں ہو سکتا۔ یہ تو آج تک کے تمام فقہائے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ پوری دنیائے اسلام ایک ہی دار کی مانند ہے، اور اگر کسی ایک چھوٹے سے علاقے پر کفار قابض ہو جائیں تو ان کے قبضے سے وہ علاقہ بازیاب کرانا...... جبکہ مقامی مسلمان عاجز ہو جائیں...... پوری دنیا کے مسلمانوں پر واجب ہو جاتا ہے۔ اس میں ملک اور قوم کی کوئی تفریق نہیں۔

جہاد...... عالمی یا مقامی و قومی

مسئلہ یہ درپیش ہے کہ اکثر خطوں کے مجاہدین کو اس وقت اس مشکل کا سامنا ہے کہ اگر وہ اپنے خطے سے باہر کے جہاد کی بات کریں، یا اپنے خطے سے باہر جہادی مہمات کی کوشش کریں تو مغربی طاقتیں انھیں جلد کچل دیں گی اور وہ اپنے جہاد کو ثمر آور نہیں بنا سکیں گے۔ ہمیں کھلے دل سے اعتراف ہے کہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے۔ وجہ وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ اس وقت عالمی طاقتوں کو اپنی موت اسی میں نظر آ رہی ہے کہ امت بحیثیتِ امت جہاد شروع کر دے، ایک خطے کا جہاد دوسرے خطے کے جہاد کو تقویت دینے لگے اور یہ نظریہ اور فکر عام ہو جائے کہ جہاد اس وقت تک ہو گا جب تک عالمی طاقتوں...... امریکہ، یورپ، روس وچین...... کی شوکت نہ ٹوٹ جائے۔ اس لیے وہ مغرب جو پہلے سرے سے اسلامی حاکمیت کے نظریے کا مخالف تھا، اور کسی خطے میں بھی سیکولر نظام کی جگہ اسلامی حاکمیت کے قیام کو گنجائش دینے کو تیار نہیں تھا، آج بحمد اللہ جہاد و مجاہدین کی کامیابیوں سے اس معاملے میں تنازل پر مجبور ہو گیا ہے۔ تاہم اب وہ جہاد کے اگلے ہدف کی روک تھام چاہتا ہے، اور وہ یہ کہ اسلامی حاکمیت اور غلبے کا تصور عالمگیر نہ ہونے پائے، اور ایک خطے کا جہاد دوسرے خطوں کے جہاد کی تقویت کا باعث نہ بن جائے۔ کیونکہ مغرب اب بھی اپنے آپ کو اتنا تجربہ کار سمجھتا ہے کہ وہ کسی بھی خطے میں محصور جہاد کو یا تو منافق حکومتوں کے ذریعے کامیابی سے دوچار ہونے سے ہی روکے رکھے...... جیسا کہ شامی جہاد میں ہوا...... یا وہ اس خطے میں جہاد کی کامیابی کے بعد قائم ہونے والی اسلامی حاکمیت کی حامل ریاست کو اتنا مجبور رکھے کہ وہ بالآخر اسلامی حاکمیت سے تنازل کر بیٹھیں اور عالمی دھارے کے مطابق چلنے پر مجبور ہو جائیں۔ ہماری دانست میں مغربی طاقتیں اپنے اندر یہ اعتماد رکھتی ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے رب پر بھروسہ ہے اور اس سے بہت اچھی امید ہے، بشرطیکہ ہم بتوفیقِ الٰہی درست فیصلے کر سکیں۔

اللهم أحسن عاقبتنا في الأمور كلها وأجرنا من خزي الدنيا وعذاب الآخرة، آمين۔

جہاد بقدرِ استطاعت

مجاہدین کے سامنے وہی عملی مشکل ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اور مجاہدین اس کا حل چاہتے ہیں۔ اور اس مشکل سے نکلنے کے لیے مغرب کے یہاں جو حل مقبول ہے، وہ یہی ہے کہ جہاد اگر کسی خطے میں کھڑا ہو بھی جائے تو وہ وہاں قومی یا وطنی دھارے میں بند ہو۔ ایسے میں شاید کوئی تیسری طاقت بظاہر مدد کرنے کو بھی تیار ہو [تاکہ بباطن اس تحریکِ جہاد کو مغربی طاقتوں کی مرضی کے مطابق ڈھال دے]۔ مجاہدین کو کیا چیز مجبور کر رہی ہے کہ وہ بھی اسی حل کی طرف جاتے ہیں، وہ ان کی دانست میں 'استطاعت' کا مسئلہ ہے۔ یہی وہ 'عذر' ہے جس سے وہ اپنے لیے قومی جہاد کی گنجائش...... شریعت کے قواعد میں...... نکال سکتے ہیں۔

اگر کسی نے توجہ سے دیکھا ہو تو ہم نے اوپر حدیثِ رسول ﷺ: ''جو کوئی مسلمان دوسرے مسلمانوں کی پریشانیوں میں فکر مند نہیں ہوتا تو وہ ان میں سے نہیں'' کے درج کرنے کے بعد لکھا تھا:

---

[1] جبہۃ النصرۃ کے القاعدۃ سے علیحدہ ہونے کے اعلان کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اعلان ایسے وقت میں ہوا کہ امریکہ اور روس نے مشترکہ بڑے آپریشن کا اعلان کر رکھا تھا اور یہ جھانسہ دیا گیا کہ اگر جبہۃ، القاعدہ سے علیحدگی کا اعلان کر دے تو یہ آپریشن روک دیا جائے گا۔ اب شامی مسلمانوں کی مصلحت کو مقدم رکھتے ہوئے جبہۃ نے یہ اعلان کر دیا۔ یقیناً کسی بھی تنظیم سے تعلق کوئی اتنی بڑی مصلحت نہیں تھی کہ اسے شامی مسلمانوں کی مصلحت پر مقدم رکھا جائے۔ لیکن مسئلہ کسی تنظیم سے علیحدگی کا نہیں ہے، امریکہ یا کوئی بڑی طاقت اتنی بے وقوف نہیں ہے۔ مسئلہ اپنے ملک سے باہر کسی کفری جارحیت کے خلاف جہاد کرنے یا اس کی عملی حمایت کرنے کا ہے، جس کی روک تھام امریکہ اور دوسری بڑی طاقتیں چاہتی ہیں۔ اور جبہۃ نے بھی محض القاعدہ سے علیحدگی اختیار نہیں کی، بلکہ اسی شرعی حکم سے تنازل اختیار کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس تنازل کے بعد شامی مسلمانوں کی مصلحت حاصل ہو سکی؟ کیا شام پر روسی و امریکی جارحیت میں کمی آ سکی؟ کیا شام میں مجاہدین کی قوت میں اضافہ ہو سکا؟ کیا بشار کی قوت میں کمی ہو سکی؟

[2] ہم نے یہاں ایک بڑی وجہ ذکر کر دی ہے جو ہمارے نزدیک اہم وجہ ہے۔ اگرچہ شامی جہاد کی ناکامی میں بہت بڑا کردار داعش نے ادا کیا ہے [خذلهم الله]۔ تاہم داعش کے فتنے کی سرکوبی ہو چکی تھی کہ مجاہدین وہاں پھر بھی مضبوط تھے، جو بعد میں داخلی جنگوں، پڑوسی منافق حکومتوں کی دخل اندازی اور مواقف کی تبدیلی سے ناکامی سے دوچار ہوئے۔ اور اسی مقامی جہاد کے موقف کے سبب مزید کمزور ہو رہے ہیں، لا قدر اللہ۔ ہم اللہ کے حضور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ شام کے مجاہدین کی مدد و نصرت فرمائیں جس طرح انھوں نے افغانستان کے مجاہدین کی مدد فرمائی، اور وہاں مجاہدین کی قیادت کو درست فہم اور درست فیصلوں کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔ اللهم أعنهم وانصرهم فإنهم عبادك، آمين۔

’یہاں فکر مندی سے مراد محض دکھ اور غم کا اظہار نہیں ہے، جیسا کہ آج کے زمانے میں عام رسم بن گئی ہے، بلکہ وہ فکر مندی ہے جو عمل پر ابھارتی ہو، جب کہ استطاعت ہو‘۔

شریعت کے احکامات سے واقف ہر فرد جانتا ہے کہ اسلام کے احکامات پر عمل، عملی ’استطاعت‘ پر موقوف ہے۔ اس سے کسی کو بحث نہیں۔ حتیٰ کہ شریعت کسی مسلمان کو اسی وقت کسی بھی عمل کا پابند[مکلف] بناتی ہے جب وہ اس عمل کی استطاعت رکھتا ہو۔ پھر استطاعت حقیقی بھی ہوتی ہے اور حکمی بھی، اور استطاعت ایک سے دوسرے فرد اور ایک عمل سے دوسرے عمل میں مختلف بھی ہو جاتی ہے، اور پھر کتنے ہی کاموں میں استطاعت کا حکم متعلقہ فرد کے اپنے فہم پر ہوتا ہے اور اس کے اور اس کے رب کے درمیان ہوتا ہے، کوئی دوسرا اس پر حکم عائد نہیں کر سکتا۔ ہمیں یہاں فقہاء کے بیان کردہ تفصیلی احکام سے کلام نہیں۔ ہم یہاں ایک فکری اور نظری موضوع کو مکمل کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے اپنے دائرے کے اندر اس پر بات کرتے ہیں۔

بلاشبہ جہاد ایک ایسا عمل ہے جو استطاعت مانگتا ہے، اور استطاعت بھی اجتماعی۔ اس کے بغیر جہاد ہو نہیں سکتا۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاد کی استطاعت پہلے سے موجود نہیں ہوتی، بلکہ تیاری اور تدبیر کر کے پیدا کی جاتی ہے۔ جہاد کی جو منزل طے کر لی جائے، اسی کے مطابق استطاعت کی فراہمی کی تدبیر کی جاتی ہے اور پھر اللہ پر توکل کر کے جہاد کیا جاتا ہے۔ نہ تدبیر میں کمی کی گنجائش ہوتی ہے اور نہ توکل میں کمی کی۔ اگر آپ کا ہدف محض اپنے وطن کی آزادی ہے تو آپ اسی ہدف کو سامنے رکھ کر تیاری کریں گے اور پھر استطاعت فراہم کر کے جہاد کریں گے، اور اگر آپ کا ہدف اپنے وطن کے علاوہ کسی دوسرے مقام...... مسلمانوں کے کسی مقدس مقام...... کی آزادی ہے تو آپ اسی کے مطابق تیاری کر کے اس کی استطاعت فراہم کریں گے اور پھر جہاد کریں گے۔ یہ استطاعت کی سیدھی سادی سی ترتیب ہے۔ دشمنانِ اسلام نہ تو آپ کو پہلے جہاد کی تیاری کی اجازت دیں گے اور نہ دوسرے جہاد کی تیاری کی، یہ تو آپ نے اپنے فہم اور نظریے کے مطابق کرنا ہے، اور دشمنانِ اسلام کے ساتھ ’الحرب خدعہ‘ کے مطابق عمل کرنا ہے۔

جہاد کی عملی ترتیب کیا ہو؟

یہ بات درست ہے کہ اپنے خطے میں قدم جمائے بغیر کسی دوسرے خطے یا عالم کے مسلمانوں کے لیے جہاد کے راستے نہیں کھل سکتے ہیں۔ لیکن اپنے خطے میں قدم جمانے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اس سے باہر کے مسلمانوں کے دفاع کے نظریے سے تنازل اختیار کریں اور ان پر ظلم کرنے والے کو آپ دشمن تصور نہ کریں، اس ڈر سے کہ کہیں آپ کو بھی عالمی دہشت گردوں کی فہرست میں شامل نہ کر دیا جائے۔ یہ فکر اور نظر یقیناً قومیت یا وطنیت کی جائز صورت نہیں ہے جسے کوئی بھی جہادی گروہ یا جماعت اپنے لیے روا سمجھے۔ یہی تو مسلمانوں کے اجتماعی مصالح اور امت کے مفادات کے مقابلے میں قومی مصالح ومفادات کو ترجیح دینا ہے، جس کے بارے میں شرعی اعتبار سے ابتداء میں بات کر آئے ہیں۔

تو پھر وہ مجاہدین کیا کریں کہ جو اپنے خطے میں جہاد کو مستحکم کرنے کے لیے امریکہ وعالمی طاقتوں کے دباؤ میں کمی لانا چاہتے ہیں اور اپنے جہاد کو اپنے خطے میں تمکین دلوانا چاہتے ہیں، ہمیں یہی حل سمجھ آتا ہے کہ وہ عالمی طاقتوں کے ساتھ دھوکہ دہی کا رویہ رکھیں، کہ دشمن کو دھوکہ ہی دیا جاتا ہے، مطمئن نہیں کیا جاتا۔ وہ یہ کہ محض سیاسی حکمتِ عملی یا سیاسی موقف کی حد تک اپنے جہاد کو قومی دھارے میں ظاہر کریں، لیکن اپنی فکر اور اپنے نظریات میں اسلام کے انھی مبادی کو زندہ رکھیں جو تمام مسلمانوں کے دفاع کو واجب ٹھہراتے ہیں، مسلمانوں پر جارحیت کرنے والے ہر کافر کو اپنا دشمن تصور کراتے ہیں، مسلمانوں کے مقدسات کے تحفظ کو اپنا فرض بتلاتے ہیں اور امت کی بالا دستی اور مرکزی خلافت کے قیام کی دعوت دیتے ہیں۔ یہی نظریات قیادت میں بھی عام ہوں اور انھیں اپنے جنود میں بھی عام کیا جائے۔ تا کہ کل کلاں سیاسی مواقف یا حکمتِ عملی مبادی کی جگہ نہ لے لیں اور آج کے سیاسی مواقف کا رنگ داخلی رویوں میں نہ نظر آنے لگے، جیسا کہ بعض جہادی محاذوں پر مشاہدہ ہوا ہے۔

باقی مجاہدین کے وہ گروہ جو اپنے خطے میں بھی جہاد کو مستحکم کر رہے ہیں اور ساتھ عالمی طاقتوں کو ہدف بنانا ترجیح اول ٹھہراتے ہیں تو یقیناً یہ لوگ عزیمت پر عمل پیرا ہیں۔ چاہیے کہ دنیا کے ہر خطے میں جاری تحریکِ جہاد سے وابستہ مجاہدین دوسرے خطے کے مجاہدین کے ساتھ نہ صرف تعلقات استوار کریں، بلکہ اپنی عملی جدوجہد میں ایک دوسرے کے پشتیبان بنیں۔ یہ اسلامی تعلیمات کا بھی تقاضا ہے اور اسلامی اخوت کی بھی عملی تدبیر ہے۔

امارتِ اسلامیہ کے حوالے سے ہمیں یہ اطمینان ہے کہ وہ سیاست کے میدان میں موجودہ دنیا کے اکثر جہادی گروہوں سے تجربے میں آگے ہیں بحمد اللہ۔ لیکن وہ خود ایک نازک مرحلے سے گزر رہے ہیں جس میں انھیں سیاسی میدان میں عالمی طاقتوں کا بھی سامنا ہے، اور خود مظلوم امت بھی ان کے معاملات کو دیکھ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں امت اور جملہ مسلمانوں کے حقوق کے حوالے سے ہر کوتاہی سے محفوظ رکھیں، انھیں منافق حکومتوں کی سازشوں سے بچائیں، دنیا میں بھی مسلمانوں کی نظروں میں سرخرو فرمائیں اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں فائز وفائق فرمائیں، آمین۔

اللهم وفقهم لما يحب ويرضى من القول والعمل والنية والهدي، إنك على كل شيء قدير. وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين
وصلى الله تعالى على نبينا الأمين، آمين.

☆☆☆☆☆

’ہندُتوا‘ کیا ہے؟

نعمان حجازی

کسی زمانے میں جنگیں صرف میادینِ جنگ میں اور اسلحے کے ساتھ لڑی جاتی تھیں۔ لیکن بُرا ہو اس جدید عالمی نظام کا کہ اس کے آنے کے بعد اب جنگوں کے میدان اور محاذ بہت وسیع ہو چکے ہیں۔ اب جنگیں عسکری میدانوں کے ساتھ ساتھ سیاسی، سفارتی، معاشی، ابلاغی اور فکری سمیت کتنے ہی محاذوں پر لڑی جاتی ہیں۔ ان میں شاید آج دشمن کے لیے سب سے مؤثر فکری و ابلاغی محاذ ہے۔ جس کی جنگ تعلیم اور ذرائع ابلاغ کے میدانوں میں لڑی جاتی ہے۔ اور اس کے ہتھیاروں میں سے ایک مؤثر ترین ہتھیار اصطلاحات ہیں۔ جب اپنے مخالف کی خوبیوں کو خامیاں بنا کر دکھانا ہو تو اس کے لیے منفی اصطلاحات گھڑ لی جاتی ہیں۔ جیسے دہشت گردی، شدت پسندی، انتہا پسندی، بنیاد پرستی وغیرہ۔ اور جب اپنی خامیوں کو خوبیاں بنا کر پیش کرنا ہو تو اس کے لیے مثبت اصطلاحات اپنالی جاتی ہیں جیسے جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری، تنوّع وغیرہ۔ اور یہ ایک ایسا کارگر ہتھیار ہے کہ کوئی کتنا ہی کیوں نہ سمجھتا ہو کہ یہ دشمن کا حربہ ہے، جو سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر کے دکھا رہا ہے، اچھے کو برا اور برے کو اچھا کر کے دکھا رہا ہے، فائدے کو نقصان اور نقصان کو فائدہ بنا کر دکھا رہا ہے، لیکن اس کے باوجود بھی وہ اس کے اثرات سے پوری طرح سے بچ نہیں پاتا، اور شعور کے کہیں خفیہ گوشوں میں ان اصطلاحات کے مثبت اور منفی اثرات اپنی کچھ نہ کچھ جگہ بنا ہی لیتے ہیں۔

آج غزوۂ ہند میں بھی یہی اصطلاحات مؤثر ترین ہتھیار ہیں۔ ان اصطلاحات میں سے ایک ہندُتوا بھی ہے۔ اگرچہ اس اصطلاح کا کوئی مثبت تاثر مسلمانوں پر تو نہیں پڑا لیکن شاید مسلمانوں پر اس کا مثبت تاثر ڈالنا دشمن کا ہدف بھی نہیں تھا۔ مثبت تاثر تو ہندو قوم کے لیے ہے کہ اس اصطلاح کو بنیاد بنا کر ذات پات اور ان گنت طبقات میں بٹی ہندو قوم کو مسلمانوں کے خلاف متحد کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ کچھ میٹھی تشریحات دنیا کے لیے بھی گھڑ رکھی ہیں کہ جب کوئی اس اصطلاح پر اعتراض کرے تو اس کے سامنے یہ میٹھی تشریحات رکھ دی جائیں کہ اصل میں تو یہ بہت نرم و ملائم، ہمدردی، رحم دلی والا نظریہ ہے۔

ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کا اس اصطلاح کے ساتھ براہ راست واسطہ پڑتا ہے لیکن یہ پورے برّصغیر کے مسلمانوں کے لیے بالعموم اور غزوۂ ہند سے جڑے مجاہدین کے لیے بالخصوص ضروری ہے کہ اس اصطلاح کو، اس کی فکری اساس کو، اور اس سے جڑی دیگر اصطلاحات کو، ان کے نظریہ سازوں کے افکار کو، اور ان کو اپنانے والی تنظیموں کے افکار و کردار کو اچھی طرح سمجھیں تاکہ دشمن کے اہداف و مقاصد کا واضح ادراک حاصل ہو سکے۔ کیونکہ عسکری میدان میں دشمن کو شکست دینے لیے ضروری ہے کہ فکری میدان میں بھی اس کے ہتھیاروں کا توڑ کر لیا جائے۔

اسی مقصد کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یہ تحریر لکھی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری تمام کاوشوں کو اپنی ذات کے لیے خالص کر دے اور اپنی بارگاہ میں قبول فرمالے، آمین۔

تعارف

’ہندتوا‘ ہندو قوم پرستی کا نظریہ ہے۔ اس نظریے کو ۱۹۲۳ء میں ’ونائک دامودر ساورکر‘ نے ایک سیاسی نظریے کے طور پر متعارف کروایا۔ اس کے بعد ’سَنگھ پریوار‘[1] سے منسلک تنظیموں نے اس کا عَلم بلند کیا۔

ہندتوا کی اصطلاح سب سے پہلے بنگالی ادیب و مصنف ’چَندر ناتھ باسو‘ نے انیسویں صدی میں استعمال کی تھی اور بعد میں اسے ’بال گنگادھر تِلک‘ نے استعمال کیا۔ لیکن اس اصطلاح کا یہ استعمال صرف روایتی ہندو ثقافت کے لیے کیا گیا تھا، اس کے برعکس ’ساورکر‘ نے اس اصطلاح کو ایک سیاسی نظریے کے طور پر پیش کیا۔

لغوی اعتبار سے اس کا معنی ہے ’ہندوپن‘، یعنی کون کتنا ’ہندو‘ ہے۔ اور اگر جس انداز میں اس نظریے میں لفظ ’ہندو‘ کو استعمال کیا جاتا ہے اس کو سامنے رکھا جائے تو اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ کون کتنا ’ہندوستانی‘ ہے۔

ساورکر ہندُتوا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ”ہندُتوا ایک لفظ نہیں بلکہ ایک تاریخ ہے۔ نہ صرف ہمارے لوگوں کی روحانی اور مذہبی تاریخ جیسا کہ بعض اوقات غلط طور پر اسے سمجھا جاتا ہے اور اسے اور ہندومت کو ایک ہی چیز کے دو نام تصور کیا جاتا ہے، بلکہ یہ ایک مکمل تاریخ ہے۔ ہندومت اصل میں ہندُتوا سے ماخوذ ہے، اس کا ایک ٹکڑا ہے اس کا ایک حصہ ہے۔ ہندُتوا کا تعلق ہندو نسل کی سوچ و عمل کے تمام شعبوں سے ہے“۔

[1] وہ تمام جماعتیں جو ہندو قوم پرست تنظیم ’آر ایس ایس‘ کی ذیلی جماعتیں ہیں یا اس کی حمایتی جماعتیں ہیں انہیں مجموعی طور پر سَنگھ پریوار کہا جاتا ہے۔ بی جے پی بھی سَنگھ پریوار کا حصہ ہے۔ ہندو مہاسبھا، شِو سِنا، اکالی دَل اور اس طرح کی چند اور جماعتیں اگرچہ باقاعدہ طور پر سَنگھ پریوار میں شامل نہیں ہیں لیکن چونکہ ہندُتوا ہی ان کا بنیادی نظریہ ہے اور سَنگھ پریوار ہندُتوا نظریہ کا نمائندہ گروہ ہے اس لیے یہ جماعتیں بھی اس کے ساتھ منسلک ہی تصور کی جاتی ہیں۔

ساور کر کے نزدیک ہندُتوا کی تین بنیادیں ہیں۔

1. راشٹر (مشترک قوم)
2. جاتی (مشترک نسل)
3. سَنسکِرتی (مشترک تہذیب و ثقافت)

ان تین بنیادوں کو سامنے رکھتے ہوئے ساور کر نے لفظ ہندو کی بھی ایک نئی تعریف کی جو کہ ہندُتوا نظریے کی اساس بنی۔ ساور کر کے مطابق:

"ہندو کا مطلب ہے وہ شخص جس کے لیے 'بھارت ورش' کی زمین، جو دریائے سندھ سے سمندروں تک ہے، اپنی آبائی زمین کے ساتھ ساتھ ایک مقدس سرزمین بھی ہو، وہ زمین جو اس کے مذہب کی جائے پیدائش ہے۔"[1]

ہندُتوا نظریے کے مطابق دھارمک مذاہب (ہندو مت، جین مت، بدھ مت، سکھ مت) چونکہ قومی، تاریخی اور ثقافتی اعتبار سے آپس میں کافی مماثلتیں رکھتے ہیں، راشٹر، جاتی اور سنسکرتی میں بھی ایک ہیں، اس لیے وہ اس 'ہندوپن' میں شریک ہیں اور ہندوستانی ہیں۔ جبکہ سامی مذاہب یا ابراہیمی مذاہب (اسلام، عیسائیت اور یہودیت) چونکہ باہر سے آنے والے مذاہب ہیں اور ان کی تاریخ و ثقافت جدا ہے اور یہ دھرتی ان کے مذہب کی جائے پیدائش بھی نہیں ہے اس لیے یہ ہندوستانی نہیں۔

اس طرح سے اس نظریے کے ماننے والے ہندوستان کے باسیوں کو تین درجوں میں تقسیم کرتے ہیں:

1. سب سے اعلیٰ درجے کا ہندوستانی وہ ہے جو کہ ہندو مذہب کا پیروکار ہے۔
2. دوسرے درجے کا ہندوستانی وہ ہے جو ہندو مت کی بجائے دیگر 'مقامی مذاہب' یعنی جین مت، بدھ مت، سکھ مذہب وغیرہ کا پیروکار ہو۔
3. جو اسلام، عیسائیت یا دیگر 'خارجی مذاہب' کا پیروکار ہو وہ ان دونوں درجوں میں نہیں آتا اور اسے ہندوستانی کہلانے کا کوئی حق نہیں۔

ہندُتوا کے مفکرین کے نزدیک وہ سامی مذاہب کے ماننے والے جن کی راشٹر اور جاتی ہندوستانی ہے وہ اصل ہندوستانی کہلائے جاسکتے ہیں اگر وہ دو شرطیں پوری کریں:

1. وہ ہندوستانی سنسکرتی کو بھی اپنا لیں یعنی ہندوستانی رسوم و رواج اور تہواروں کو اپنا لیں اور ہندوستانی تہذیب و ثقافت میں خود کو مکمل طور پر ضم کر لیں،
2. اس سرزمین کو اپنے مقدس مقامات سے زیادہ مقدس تصور کریں۔

مقاصد

اس نظریے کو متعارف کروانے کے بنیادی مقاصد میں سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ چونکہ ہندو خود ذات پات اور طبقات میں بری طرح تقسیم ہیں، اس لیے ان میں اتحاد کا فقدان ہے، جس کے نتیجے میں دیگر مذاہب اور قومیں ان پر غالب آجاتی ہیں اور ان پر حکومت کرتی ہیں۔ اس لیے ایک ایسی مشترکہ شناخت فراہم کی جائے جو کہ ایک طرف ہندو اتحاد (हिन्दू संगठन) کو فروغ دے اور ساتھ ہی ساتھ یہ ایک ایسی شناخت بھی ہو جس کی وجہ سے لفظ 'ہندو' صرف ہندو مت سے منسلک لوگوں تک محدود نہ رہے بلکہ ہندوستان کے دیگر مقامی (دھارمک) مذاہب، یعنی بدھ مت، جین مت اور سکھ وغیرہ بھی 'ہندو' کہلائیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے یہ مقامی مذاہب بھی 'ہندو مت' کا حصہ ہی کہلائیں۔ تاکہ 'ہندو' بیرونی مذاہب اور قوموں کے مقابلے میں زیادہ سیاسی برتری حاصل کر سکیں اور ان پر غالب آسکیں۔

اہداف

ہندُتوا کے درج ذیل تین بنیادی اہداف ہیں:

1. ہندوؤں کو سیاسی طور پر متحرک، مضبوط اور غالب کیا جائے۔
2. ہندو شناخت کے حوالے سے پورے برصغیر میں آگاہی پیدا کی جائے اور ایسے اقدامات کیے جائیں جو اس شناخت کو مضبوط سے مضبوط تر کر سکیں۔
3. ایسے اقدامات کیے جائیں جس سے وہ تمام افراد واپس اپنے پرانے مذہب پر لوٹ جائیں جو کہ 'خارجی' مذاہب قبول کر چکے ہیں۔

ہندُتوا کے اہم نظریہ ساز

کوئی بھی نظریہ اپنے نظریہ سازوں کے افکار کا عکّاس ہوتا ہے۔ اور ان نظریہ سازوں کے افکار پر ان کے پس منظر کی گہری چھاپ ہوا کرتی ہے۔ ہندُتوا کا موجودہ رائج نظریہ مختلف ادوار اور شخصیات کے نظریات سے متاثر ہوتا ہوا بتدریج اس شکل تک پہنچا ہے۔ اس لیے ہندُتوا کے نظریے اور اس کی اساس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے نظریہ سازوں کے پس منظر اور ان کے افکار پر نظر ڈالی جائے۔ ذیل میں ہندُتوا کے اہم نظریہ سازوں کا اور ان کے افکار کا تعارف دیا گیا ہے۔

ونائک دامودر ساور کر

'ونائک دامودر ساور کر' (Vinayak Damodar Savarkar) ہندُتوا کے نظریے کا بانی ہے اور ہندوتوا نظریے سے منسلک تمام تنظیمیں (سنگھ پریوار) اسے اپنا بڑا مانتی ہیں۔ انڈیا میں ساور کر کو 'وِیر' (ہیرو) کا خطاب دیا جاتا ہے۔

[1] Hindutva by V.D. Savarkar

ساور کر ۲۸ مئی ۱۸۸۳ء کو مہاراشٹر کے گاؤں بھاگر میں ایک مراٹھی چِٹپاون براہمن[1] گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن سے ہی اس کے اندر مسلمانوں کے خلاف نفرت بھری ہوئی تھی اور اس کا ذکر وہ خود اپنی آپ بیتی میں بھی کرتا ہے۔ اس کے بقول اس نے ۱۲ سال کی عمر میں اپنے گاؤں میں مسلمانوں کے خلاف ایک بلوے کی قیادت کی اور وہاں ایک مسجد پر حملہ کیا۔ اس حملے پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ''ہم نے جی بھر کے مسجد کو مسمار کیا۔''

اپنے طالب علمی کے دور سے ہی ساور کر ہندو قوم پرست تحریکوں سے منسلک رہا۔ لندن میں تعلیم کے دوران اس کی رہائش 'انڈیا ہاؤس' میں تھی جو کہ ہندو قوم پرستوں کا گڑھ مانا جاتا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے اس نے ابھینا ؤ بھارت سوسائٹی اور فری انڈیا سوسائٹی جیسی ہندو طلبہ تنظیموں کی بنیاد رکھی۔ اسی عرصے میں اس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حوالے سے کتاب The Indian War of Independence لکھی۔

۱۹۱۰ء میں ساور کر کو برطانیہ نے انڈیا ہاؤس کی انقلابی تحریکوں سے تعلق کی وجہ سے اور مہاراشٹر میں اس کے بھائی 'گنیش ساور کر' کی طرف سے شروع کی گئی مسلح بغاوت کی تحریک کا منصوبہ ساز ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ جیل منتقلی کے دوران اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش ناکام رہی۔ اس کے نتیجے میں اس پر مقدمہ چلا اور ۱۹۱۱ء میں اسے پچاس سال کی سزا ہوئی اور اسے کالا پانی میں منتقل کر دیا گیا۔

وہ کالا پانی کی سختیاں برداشت نہ کر سکا اور وہاں منتقل ہونے کے پہلے ماہ کے اختتام پر ہی اس نے رحم کی اپیل دائر کر دی۔ لیکن وہ رد کر دی گئی۔

۱۹۱۳ء میں اس نے پھر رحم کی اپیل کی۔ اس میں اس نے اپنے کاموں پر معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ وہ آئین کی پاسداری کرے گا، اور رہائی کے بعد اپنے جیسے دیگر گمراہ ہندوستانیوں کو واپس راہ راست پر لانے کا کام کرے گا۔ اور حکومتِ برطانیہ اس سے جس طرح کا بھی کام لینا چاہے وہ بخوشی کرنے کو تیار ہے۔ لیکن اس کی یہ اپیل بھی رد کر دی گئی۔

۱۹۱۷ء میں اس نے پھر سے رحم کی اپیل کی لیکن اس پر بھی کوئی عمل نہ ہوا۔

۱۹۲۰ء میں اس نے اپنی چوتھی رحم کی اپیل برطانوی حکومت کو پیش کی۔ اور ۱۹۱۳ء میں کی گئی رحم کی اپیل میں اپنی پیشکش کو دہرایا۔

۱۹۲۰ء میں کانگرس کے رہنما گاندھی، وٹھل بھائی پٹیل اور بال گنگادھر تلک نے ساور کر کی غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کیا۔ ساور کر نے اپنی آزادی کے بدلے میں ایک بیان پر دستخط کیا جس میں اس کے خلاف کی گئی عدالتی کارروائی، اس کو دی گئی سزا اور برطانوی قانون کی مکمل حمایت کی اور تشدد کی مخالفت کی۔

۱۹۲۱ء میں ساور کر کو رتناگری جیل منتقل کر دیا گیا۔ اس جیل میں ہی اُس نے ہندُتوا کے متعلق اپنی کتاب تحریر کی جو ہندُتوا نظریے کی بنیاد بنی۔ اسے ۱۹۲۴ء میں بعض پابندیوں کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔ اس پر پابندی تھی کہ اگلے پانچ سال تک وہ ضلع رتناگری سے باہر نہیں جائے گا اور نہ ہی کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے گا۔

ساور کر نے حکومتِ برطانیہ سے ان پابندیوں کے بدلے میں ۱۰۰ روپے ماہوار کا مطالبہ کیا، جس کے جواب میں برطانوی حکومت ساٹھ روپے ماہوار پر راضی ہو گئی۔ اُس پر سیاسی پابندیاں ۱۹۳۷ء تک قائم رہیں جس کے بعد انہیں اٹھا دیا گیا۔ رہائی کے بعد اُس نے برطانوی راج کی مخالفت ترک کر دی۔ اور اپنی پوری توجہ ہندو قوم پرستی پر مرکوز کر دی۔ قید سے قبل وہ برطانوی سامراج سے ہندوستان کی آزادی کی بات کرتا تھا لیکن رہائی کے بعد اب مسلمان اور عیسائیوں سے ہندوؤں کی آزادی کی بات کرنے لگا۔

۱۹۲۴ء میں رہائی کے بعد ساور کر نے ایک تنظیم 'رتناگری ہندو سبھا' قائم کی۔ اس تنظیم کے مقاصد میں سب سے اہم مقصد ان افراد کو واپس ہندو بنانا تھا جو کہ مسلمان یا عیسائی بن چکے تھے۔ اس میں ایک مشہور واقعہ رتناگری کے 'ڈھرکا' براہمن خاندان کے آٹھ افراد کا بھی ہے جو کہ عیسائی مذہب قبول کر چکے تھے۔ ساور کر نے ایک عوامی اجتماع میں اس خاندان کو واپس ہندو بنایا اور خاندان کی دو لڑکیوں کی شادی کا خرچ بھی اٹھانے کی ذمہ داری لی۔

۱۹۳۷ء میں جب ساور کر کی سیاسی پابندیاں ختم ہوئیں تو وہ بمبئی منتقل ہو گیا اور ہندو قوم پرست جماعت 'ہندو مہاسبھا' کا صدر منتخب ہو گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس نے نعرہ لگایا کہ ''ساری سیاست ہندوؤں کے تحت لاؤ اور سب ہندوؤں کو جنگجو بناؤ''۔ اور اس مقصد کے لیے اس نے دوسری جنگ عظیم میں بھرتیوں کی برطانوی کوششوں کی مکمل حمایت کی، تاکہ ہندوؤں کو عسکری تربیت حاصل ہو سکے۔ جب کانگریس نے ۱۹۴۲ء میں 'ہندوستان چھوڑ دو' تحریک شروع کی تو ساور کر نے اس تحریک کی مخالفت کی اور ہندوؤں سے مطالبہ کیا کہ وہ جنگ میں اپنی خدمات جاری رکھیں اور حکومت کی نافرمانی نہ کریں۔ بلکہ اس کے ساتھ وہ ہندوؤں کو مزید ابھارتا رہا کہ جنگ کے لیے مزید ہندو اپنے نام لکھوائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ہندو فنِ حرب سیکھ سکیں۔

جنوری ۱۹۴۸ء میں گاندھی کے قتل کے بعد پولیس نے گاندھی کے قاتل 'ناتھورام گوڈسے' کو گرفتار کر لیا۔ گوڈسے ہندو مہاسبھا اور آر ایس ایس کا رکن تھا۔ اور ساور کر کو اپنا گورو تصور کرتا

[1]مہاراشٹر کی ساحلی پٹی 'کونکن' پر بسنے والے کونکنی زبان کی قسم 'چِٹپاونی' بولنے والے براہمن

تھا۔ فروری ۱۹۴۸ء کو ساور کر کو بھی گاندھی کے قتل کی سازش میں شریک ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔

قتل میں شریک ایک اور ملزم 'آپٹے' کی گواہی کے مطابق گاندھی کا قتل کرنے سے قبل گوڈسے اپنے گورو ساور کر کا آخری دیدار کرنے کے لیے گیا۔ آپٹے بھی ساتھ تھا۔ ساور کر نے اسے دعا دی کہ "کامیاب ہو کر واپس لوٹو"۔ لیکن عدالت نے ناکافی شواہد کی بنا پر ساور کر کو رہا کر دیا۔ ناتھورام گوڈسے کو گاندھی کے قتل کے جرم میں ۱۹۴۹ء میں پھانسی دے دی گئی [1]۔

گاندھی کے قتل کے بعد مشتعل ہجوم نے ساور کر کے گھر پر پتھراؤ بھی کیا۔ گاندھی قتل کیس میں رہائی کے بعد حکومت نے اسے ہندو قوم پرستانہ تقاریر کرنے پر پھر سے گرفتار کر لیا اور پھر اس وعدے پر رہا کیا کہ وہ سیاسی سرگرمیوں سے دور رہے گا۔ اس کے بعد اگرچہ اس نے سیاسی سرگرمیاں تو ترک کر دیں لیکن اپنی تحاریر کے ذریعے سے ہندُتوا کی دعوت جاری رکھی۔

یکم فروری ۱۹۶۶ء کو ساور کر نے کھانا پینا اور دوائیں لینا چھوڑ دیں اور اسے "آتمارپن" (موت تک روزہ) کا نام دیا۔ موت سے قبل اس نے ایک تحریر "آتماہتھیا نہیں آتمارپن" [2] لکھی جس میں اس نے لکھا کہ "جب زندگی کا مقصد پورا ہو چکا ہو اور سماج کی سیوا کی طاقت باقی نہ رہے، تو بہتر ہے کہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے ختم کر لو بجائے اس کے کہ موت کا انتظار کرو"۔ اس طرح سے ۲۶ فروری ۱۹۶۶ء کو ساور کر کی موت ہوئی۔

ساور کر کے افکار

اسلام دشمنی

ساور کر ہمیشہ ایک اسلام دشمن ہندو قوم پرستی کی دعوت دیتا رہا۔ اس کے نزدیک پولیس اور فوج میں موجود مسلمان ممکنہ غدار ہیں۔ وہ مطالبہ کرتا تھا کہ فوج، پولیس اور پبلک سروس سے مسلمانوں کی تعداد کو کم سے کم کیا جائے اور مسلمانوں پر اسلحہ ساز کارخانے لگانے یا ان میں کام کرنے پر مکمل پابندی ہونی چاہیے۔ ۱۹۶۳ء میں لکھی گئی اپنی کتاب "ہندوستانی تاریخ کے چھے درخشاں ادوار" میں اس نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ پوری تاریخ میں مسلمان اور عیسائی ہندومت کو ختم کرنے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

ساور کر نے ہندُتوا کا نظریہ بھی مسلمانوں کی 'تحریکِ خلافت' کے ردّ عمل میں گھڑا تھا۔ اس کو یہ بات بہت بری لگی کہ ہندوستان کے رہنے والے مسلمان استنبول میں موجود عثمانی خلافت کے ساتھ مدد و تعاون کا عہد کر رہے ہیں۔ اس کے بقول اصل دشمن برطانوی نہیں بلکہ مسلمان ہیں کیونکہ اسلامی نظریہ ہندو راشٹر کے لیے ایک سنگین خطرہ ہے۔

فسطائیت

اپنی بہت سی تحاریر و تقاریر میں ساور کر نے نازی نظریے کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ عموماً جرمنی کی جرمن اکثریت اور یہودی اقلیت کا موازنہ ہندوستان کی ہندو اکثریت اور مسلم اقلیت سے کیا کرتا تھا۔ وہ دونوں جرمن یہودیوں اور ہندوستانی مسلمانوں پر تنقید کرتا تھا کہ وہ معاشرے میں ضم ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ۱۹۳۸ء میں اس نے لکھا:

> "اگر ہم ہندو زمانہ گزرنے کے ساتھ ہندوستان میں طاقتور ہو جاتے ہیں تو یہ لیگی قسم کے مسلم دوستوں کو جرمن یہودیوں کا کردار ادا کرنا ہو گا۔"

لیکن جرمن یہودیوں کی مخالفت کے باوجود ساور کر اسرائیل کی ریاست کی مکمل حمایت کرتا تھا، اور اس کے قیام پر اس نے مبارکباد کا پیغام بھی بھیجا تھا، کیونکہ یہ ریاست مسلمان عرب دنیا کے راستے میں بڑی رکاوٹ تھی۔

ہندو قوم پرستی

ساور کر اپنے آپ کو ملحد کہتا تھا لیکن ہندومت میں الحاد مغرب کے الحاد سے مختلف ہے اور ساور کر ہندومت کے الحاد کا ہی قائل تھا۔ ہندومت میں ملحد ایک علیحدہ فرقہ ہے۔ جو کہ صرف خداؤں کا انکار کرتا ہے جبکہ مذہب کے رسوم و رواج، اور بہت سے عقائد اور پیچیدہ فلسفوں پر یقین رکھتا ہے اور ان سب چیزوں کو بھی مقدس تصور کرتا ہے جسے ہندو مذہب میں مقدس مانا جاتا ہے۔ لیکن شاید ملحد ہونے کی وجہ سے ساور کر نے ہندو کو ہندومت کے پیروکار کے طور پر لینے کی بجائے بطور قوم لیا ہے۔ اور ہندُتوا کو ہندومت کا حصہ کہنے کی بجائے ہندومت کو ہندُتوا کا حصہ کہا۔

ساور کر دھارمک مذاہب کے درمیان اتحاد کی دعوت دیتا تھا۔ اس نے جو 'ہندو' کی تعریف کی تھی اس کے اعتبار سے چونکہ تمام دھارمک مذاہب کے ماننے والے 'ہندو' کہلائیں گے اس لیے اس کے بقول یہ سب دھارمک مذاہب بھی بالاصل ہندومت کا ہی حصہ ہیں۔

(باقی صفحہ نمبر 32 پر)

---

[1] یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا گوڈسے کے اس اقدام سے کلی لاتعلقی کا اظہار کرتی رہیں۔ لیکن جب ۲۰۱۴ء میں نریندر مودی کی حکومت آئی تو ہندو مہاسبھا نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ناتھورام گوڈسے کو قومی ہیرو کا درجہ دیا جائے اور اس کا ایک مجسمہ بھی نصب کیا جائے۔ ۳۰ جنوری ۲۰۱۵ء کو گاندھی کی برسی کے موقع پر ہندو مہاسبھا نے ایک دستاویزی فلم "دیش بھگت ناتھورام گوڈسے" بھی جاری کی۔ ہندو مہاسبھا اب ان کوششوں میں ہے کہ ناتھورام گوڈسے کے نام کا ایک مندر تعمیر کیا جائے اور ۳۰ جنوری کو گاندھی کی برسی کی بجائے شوریا دیواس (بہادری کا دن) منایا جائے۔

[2] خودکشی نہیں موت تک روزہ

نظریاتی جنگیں

مولانا محمد اسماعیل ریحان

مولانا محمد اسماعیل ریحان صاحب (زید مجدہ) کی تالیف 'أصول الغزو الفكري' یعنی 'نظریاتی جنگ کے اصول'، نذرِ قارئین ہے۔ اس وقت مسلمانوں کو اہلِ باطل کی جانب سے ایک ہمہ گیر اور نہایت تند و تیز فکری و نظریاتی یلغار کا سامنا ہے۔ اس یلغار کے مقابلے کے لیے 'الغزو الفکری' کو دینی و عصری درس گاہوں کے نصاب میں شامل کرنا از حد ضروری ہو چکا ہے۔ دینی و عصری درس گاہوں میں اس مضمون کو شامل کرنے کے ساتھ ساتھ 'الغزو الفکری' یعنی نظریاتی جنگ کے مضمون و عنوان کو معاشرے کے فعال طبقات خصوصاً اہلِ قلم، اسلامی ادیبوں اور شاعروں، اہلِ دانش، صحافیوں، پیشہ ور (پروفیشنل) حضرات نیز معاشرے کہ ہر مؤثر طبقے میں بھی عام کرنا از حد ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے 'اصول الغزو الفکری' کے عنوان سے اس علم کے اہم مباحث کو مختصر طور پر مولانا موصوف نے پیش کیا ہے۔ مولانا موصوف ہی کے الفاظ میں 'در حقیقت یہ اس موضوع پر تحریر کردہ درجنوں تصانیف کا خلاصہ ہے جس میں پاک و ہند کے پس منظر کا نسبتاً زیادہ خیال رکھا گیا ہے'۔ یہ تحریر اصلاً نصابی انداز میں لکھی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود خشکی سے پاک ہے اور متوسط درجۂ فہم والے کے لیے بھی سمجھنا آسان ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہم مسلمانوں کو نظریاتی و عسکری محاذوں کو سمجھنے، ان محاذوں کے لیے اعداد و تیاری کرنے اور پھر ہر محاذ پر اہلِ باطل کے خلاف ڈٹنے کی توفیق ملے۔ اللہ پاک مولانا محمد اسماعیل ریحان صاحب کو جزائے خیر سے نوازیں کہ انہوں نے ایسے اہم موضوع کے متعلق قلم اٹھایا، اللہ پاک انہیں اور ہم سب اہلِ ایمان کو حق پر ثبات اور دین کا صحیح فہم عطا فرمائیں، آمین یاربّ العالمین! (ادارہ)

یہودی تنظیمیں اور تحریکیں

یہودی تنظیمیں اور تحریکیں خفیہ بھی ہیں اور اعلانیہ بھی۔ بڑی خفیہ تنظیمیں یہ ہیں:

1. ٹیمپلرز
2. فری میسنری یا الماسونیۃ
3. الومیناتی تنظیم

مشہور تحریکیں یہ ہیں:

1. صیہونیت
2. ایلیا تحریک

بڑی اعلانیہ تنظیمیں یہ ہیں:

1. بنی برتھ سوسائٹی
2. لائنز کلب
3. روٹری انٹرنیشنل

ان کے علاوہ یہودیوں نے کچھ عالمی ادارے بھی قائم کیے جیسے لیگ آف نیشنز اور اقوامِ متحدہ۔

ذیل میں ان تنظیموں اور تحریکوں کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔

1. ٹیمپلرز:

ٹیمپلرز کا ظہور پانچویں صدی ہجری (گیارہویں صدی عیسوی) کے اواخر میں اس وقت ہوا جب پہلی صلیبی جنگ چھڑی اور صلیبیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ انھوں نے مقدس مقامات کی حفاظت کے عنوان سے اپنی ایک فوج بنائی جو یورپ کی تمام فوجوں سے زیادہ مضبوط تھی۔ اس فوج کے سپاہی جنونی عیسائی تھے، لیکن اس کے قائدین صرف یہودی ہوتے تھے۔ صدیوں تک اس تنظیم کو نصرانی ہی تصور کیا جاتا تھا۔ صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کی متواتر شکستوں کی وجہ سے ٹیمپلرز کو شام سے نکلنا پڑا، تب انھوں نے یورپ میں قدم جما لیے۔ ان کی فسادی حرکات سے تنگ آکر ۱۳۱۲ء میں ٹیمپلرز کی تنظیم کو کالعدم قرار دے دیا گیا لیکن ٹیمپلرز ختم نہیں ہوئے۔ انھوں نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ ان کے بہت سے افراد نے "آرڈر اوف کرائسٹ" نامی تنظیم بنا کر بحری تجارت اور قزاقی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ کچھ فری میسنری تنظیم میں شامل ہو گئے اور اسے اپنے عقائد و نظریات کے تابع کر لیا۔ موجودہ فری میسنری ٹیمپلرز ہی کا دوسرا نام ہے۔

2. فری میسنری Free Masonry (الماسونیۃ):

خفیہ یہودی تنظیموں میں سب سے قدیم اور مؤثر تنظیم فری میسنری ہے۔ اس کے نظریات، اہداف اور طریقۂ واردات بہت خفیہ رکھے جاتے ہیں۔

اس تنظیم کی علامات تعمیراتی اوزار اور آلات..... پرکار، گُنیا اور مثلث میں گھورتی ہوئی آنکھ ہیں۔ تنظیم میں کئی درجات اور طبقات ہیں، پہلے طبقے میں تمام مذاہب، قوموں اور نسلوں کے لوگ آسکتے ہیں۔ اس کے ارکان لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ دوسرے طبقے میں صرف یہودی شامل ہو سکتے ہیں۔ تیسرے طبقے میں دنیا بھر کے چنے ہوئے یہودی ہوتے ہیں۔ تمام طبقوں اور عہدے داروں کے اوپر فری میسنری کا سربراہ ہوتا ہے جسے "رئیس" یا "حاخامِ اعظم" کہا جاتا ہے، لیکن اس کی شخصیت ہمیشہ پوشیدہ رہتی ہے۔

اس تنظیم کے اصول و قواعد بہت سخت ہیں۔ کارکن ان کے مطابق نظم و ضبط کے پابند ہوتے ہیں۔ ہر رکن صرف اپنے سربراہ کے طبقے کے رکن سے تعلقات رکھ سکتا ہے۔ ایک ڈگری میں شامل افراد ایک دوسرے کو مخصوص علامات سے پہچان لیتے ہیں۔ پہچان کے یہ اشارے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

مقاصد:

فری میسنری کا شعار اور ظاہری مقصد "عدل، اخوت اور حریت" ہے۔ فری میسنز دعویٰ کرتے ہیں کہ ہماری تنظیم قوم، ملک اور مذہب کی تفریق سے بالاتر ہے اور ہم اپنی کارکردگی سے انسانوں میں حتی الوسع تعاون کا ایک مثالی ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان خوشنما دعووں کے پس پردہ اصل مقاصد تحفظِ یہودیت، غلبہ یہود، تمام مذاہب کی مخالفت اور بے دینی و اباحیت کا فروغ ہیں۔

1. تحفظِ یہودیت اور غلبہ یہود:

یہودیت کا تحفظ اور یہودیوں کا عالمگیر غلبہ فری میسنری کا پہلا ہدف ہے۔ یہودی پیشوا، حاخام اسحاق وایز اعتراف کرتا ہے: "فری میسنری تحریک ایک یہودی ادارہ ہے جس کی تاریخ، اس کے مراتب اور درجہ بندی، تعلیمات اور خفیہ کلمات اول تا آخر یہودی ہیں"۔

۱۹۰۱ء میں شائع ہونے والے کتابچے "European Free Masonry" میں تحریر کیا گیا:

"یورپین فری میسنری "European Free Masonry" ایک ایسی عمارت تعمیر کرے گی جس میں خداوندِ بنی اسرائیل ہمیشہ رہے گا"۔

2. دیگر مذاہب کی مخالفت:

یہودی دیگر مذاہب کو ختم کرکے لادینیت پھیلانا چاہتے ہیں تاکہ عقائد سے عاری قلوب میں یہودیت کی کاشت کرنا مشکل نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے فری میسنری پوری طرح متحرک ہے۔ یہودی پروٹوکولز میں کہا گیا ہے:

"فری میسنری جو پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے ہماری مدد کر رہی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ایمانی عقائد کی زنجیر توڑ دیں۔ جب ہم اپنی مملکت حاصل کرلیں گے تو اپنے عقیدے کے علاوہ کسی عقیدے کو نہیں رہنے دیں گے، اس لیے ہمیں تمام ادیان اور عقائد کا خاتمہ کرنا چاہیے"۔

3. الحاد، بے دینی اور اباحیت کا فروغ:

فری میسنری دنیا کو حیوانوں کی طرح جنسی اباحیت کا عادی بنا کر اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کرنا اور انھیں حال و مستقبل کے خطرات سے غافل رکھنا چاہتی ہے۔ "Jewish Encyclopedia" میں کہا گیا ہے:

"ہم ایسے لوگ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اپنے اعضائے تناسلی کے بارے میں بالکل شرم نہ کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ نوجوان یہ سمجھیں کہ پیدائش کے وقت ہی سے اعضائے تناسل کو تقدس کا درجہ حاصل ہے"۔

(جیوش انسائکلوپیڈیا۔ ایڈیشن ۱۹۰۳ء۔ جلد ۵ صفحہ ۵۰۳)

فری میسنری کی تاریخ:

یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ فری میسنری کی بنیاد اس وقت پڑ چکی تھی جب بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں اہرام تعمیر کر رہے تھے۔ اس وقت بھی بنی اسرائیلی معماروں نے اپنی روایتی اَنا کو ترک نہ کیا اور اپنی ایک آزادانہ حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے

رہے۔ اس طرح فری میسن (آزاد معمار) برادری کی بنیاد پڑ گئی۔ موسیٰ علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے دور میں انھوں نے اپنا تشخص برقرار رکھا۔ بنی اسرائیل کے زوال کے دور میں یہودی پیشواؤں نے اپنی حمیت کو برقرار رکھنے کے لئے مخصوص محفلوں کا انعقاد شروع کیا جنھیں لاج (lodge) کہا جاتا تھا۔ ان میں وہ اپنے نظم و ضبط کی بقا اور اپنے عروج کی بازیابی کے لیے منصوبے بناتے تھے۔ یہود کے ان بڑے راہنماؤں کا تعلق انھیں معماروں اور سنگ تراشوں کے خاندان سے تھا، سنگ تراش کو انگریزی میں "میسن" کہا جاتا ہے، چنانچہ اسی مناسبت سے اس تنظیم کو "آزاد معماروں کی تنظیم" یا "فری میسنری" کہا جانے لگا۔

تاریخی حقائق سے "فری میسنری" کی بنیادوں کے اتنا قدیم ہونے کا ثبوت پیش نہیں کیا جاسکتا۔ فری میسنری کا نام پہلی بار اٹھارہویں صدی میں مشہور ہوا، جب اس تنظیم نے برطانیہ میں اپنے قدم جما کر تیزی سے ترقی شروع کی۔ ۱۷۱۷ء میں برطانیہ میں گرینڈ لاج قائم ہوا پھر جہاں جہاں برطانیہ کا اثر و رسوخ تھا وہاں فری میسنری کے مراکز قائم ہونے کی ایک رَو چل پڑی۔ کینیڈا، آسٹریلیا، مصر، مشرقِ وسطیٰ اور دیگر مقبوضہ ممالک میں لاجز بنتے چلے گئے۔

فری میسنری نے ۱۷۸۹ء میں انقلابِ فرانس برپا کرکے فرانسیسی شہنشاہیت کا خاتمہ کیا اور یورپ میں جمہوریت کی بنیاد ڈالی۔ ترکی سے خلافت کے خاتمے میں بھی فری میسنری کا کردار سب سے فعال رہا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں سرگرم ہونے والی ترک نوجوانوں کی خفیہ جماعت "انجمن اتحاد و ترقی" جو انقلاب کی داعی تھی درحقیقت فری میسنری کے اشارے پر چل رہی تھی۔ فری میسنری کے ایجنٹوں نے تین براعظموں میں پھیلی ہوئی اسلامی خلافت کی جگہ ایک تنگ نظر اور کمزور لادین ریاست قائم کر دکھائی۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں بالشویک انقلاب آیا، اس میں بھی فری میسنری کا بھرپور کردار تھا، جدید ترکی کے بانی مصطفیٰ کمال، افغانستان کے بادشاہ حبیب اللہ خان، ایران کے سابق شاہ رضا شاہ پہلوی، مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر اور صدر انور سادات، اور فلسطینی لیڈر یاسر عرفات جیسے لوگ فری میسنری کے ایجنٹ تھے۔

لوگ فری میسن کیوں بنتے ہیں:

لوگ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تکمیل کے لیے فری میسن بنتے ہیں۔ ذاتی اغراض اور مفادات کے پجاری ہی فری میسنری کے جال میں پھنستے ہیں۔ یہ خاص لوگ مثلاً حکمران، سیاست دان، وزراء، سفیر، سول حکام، فوجی افسران، بڑے تاجر، صنعت کار، سائنسدان، ڈاکٹر، اہل علم و دانش ہوتے ہیں جو مقبولیت، مقام اور دولت میں زیادتی کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اس تنظیم میں داخلے کے وقت امیدوار سے قسم لی جاتی ہے کہ وہ کسی قسم کا راز افشا نہیں کرے گا، اگر خلاف ورزی کرے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ رکن بننے کے بعد آزمائش کے لیے مختلف کام دیے جاتے ہیں، جن کی تکمیل پر اس کی ترقی موقوف ہوتی ہے۔

3. الومیناتی تنظیم (Order of Illuminati):

یہ تنظیم یکم مئی ۱۷۷۶ء کو ان یہودیوں نے قائم کی جو لوسی فر (Lucifer) یعنی ابلیس کو اپنا خدا مانتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں اور دجال کو اپنا نجات دہندہ یا مسیحا تصور کرتے ہیں۔ یہ تنظیم لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ظاہر کرتی ہے کہ اس کا مقصد قوم، مذہب، حیثیت اور پیشے سے بالاتر ہو کر نسل انسانی کو ایک خوشحال برادری میں تبدیل کرنا ہے۔ مگر اس کا اصل مقصد تمام مذاہب، تمام حکومتوں، تمام ذاتی جائیدادوں، حب الوطنی اور خاندانی نظام کا خاتمہ اور اس کے بعد ایک عالمی ابلیسی ریاست کا قیام ہے۔ ۱۶ جولائی ۱۹۸۲ء سے "فری میسنری" اور "الومیناتی" ایک معاہدے کے تحت متحد ہو گئی ہیں کہ دونوں کا مقصد ایک ہی ہے۔

یہودی تحریکیں

1. صہیونیت (Zionism):

یہ یہودیوں کی سب سے قدیم اور سب سے مؤثر تحریک ہے جو بیت المقدس کے جنوب میں واقع ایک پہاڑ "صہیون" کی طرف منسوب ہے۔ یہ تحریک بنی اسرائیل کی عظمت رفتہ کی بازیابی، اقصیٰ کی جگہ ہیکل کی تعمیر، اور پوری دنیا پر ایک یہودی بادشاہ کے ذریعے حکومت کرنے کے خواہاں ہے۔ یہ یہودی بادشاہ "کانا دجال" ہے۔

یہ انتہائی قدیم تحریک ہے۔ صہیون کو واپسی، ہیکل کی از سر نو تعمیر اور عالمگیر بادشاہت کا جذبہ پہلی مرتبہ اس وقت پیدا ہوا جب یہودی بخت نصر کی قید سے آزاد ہو کر فلسطین واپس جا رہے تھے۔ اس وقت جو تحریک شروع ہوئی اسے "تحریکِ مکابیین" کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایسی کئی تحریکیں مختلف زمانوں میں چلتی رہیں مگر ان سب کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں فری میسنری اور یہودی دانشوروں کی سرگرمیوں کی وجہ سے یورپ کی کئی حکومتیں ایک الگ آزاد وطن کے لئے جاری یہودی تحریک کی حامی بن گئیں۔ یورپی حکمرانوں نے یورپ کو یہود کے فساد سے پاک کرنے اور ان کے ذریعے مسلمانوں کو شکست دینے کے خیال سے یہود کی حمایت شروع کر دی۔ ان میں فرانس کا نپولین سر فہرست ہے۔ اس نے یہودیوں سے یہ معاہدہ کیا کہ یہودی مشرق وسطیٰ پر قبضہ کرنے میں اس کی مالی امداد کریں تو وہ فلسطین میں انھیں ایک آزاد ملک دلوائے گا مگر یہ منصوبہ چوپٹ ہو گیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں یہودی لیڈروں نے فلسطین میں زمینیں خریدنے کے منصوبے کا آغاز کر دیا، اس سلسلے کو "ایلیا تحریک" کہتے ہیں۔

۱۸۹۶ء میں عالمگیر صہیونی تحریک کا آغاز ہوا جس کا بانی آسٹریا (یورپ) کا ایک صحافی "تھیوڈور ہرٹزل" تھا۔ اس نے اپنی تصنیف "الدولۃ الیہودیۃ" میں دریائے نیل سے لے کر فرات تک ایک عظیم یہودی ریاست قائم کرنے، فلسطین کو مرکز بنانے اور عالمگیر یہودی بادشاہ کے اقتدار کی راہیں ہموار کرنے کا تفصیلی منصوبہ پیش کیا۔ اس نے صہیونیوں کی پہلی سالانہ کانفرنس میں جو کہ ۱۸۹۷ء سوئزر لینڈ کے شہر باسل میں منعقد ہوئی اعلان کیا کہ ہم نے یہودیت کے غلبے کا پہلا پتھر نصب کر دیا ہے، اور عن قریب دنیا ہمارے تابع ہو گی۔ اسی کانفرنس میں پہلی بار "حکمائے صہیون کے پروٹوکولز" پیش کیے گئے۔

۱۹۰۱ء میں یہودیوں نے خلیفۃ المسلمین سلطان عبد الحمید ثانی سے بھاری رقم کے بدلے فلسطین کی زمین طلب کی، لیکن سلطان نے صاف انکار کر دیا۔ آخر کار صہیونیوں نے عثمانی خلافت کو سبوتاژ کرنے کے لیے پہلی عالمی جنگ چھیڑ دی جس کے اختتام پر خلافت عثمانیہ کا خاتمہ کر دیا گیا، ترکی کی بندر بانٹ کر کے شام اور عرب ممالک پر برطانوی اور یہودی ایجنٹوں کو مسلط کر دیا گیا۔ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ فلسطین یہودیوں کو ملنا چاہیے، یہ ان کا حق ہے۔ تین عشروں بعد دوسری عالمی جنگ چھیڑی گئی اور صہیونیوں کے ہاتھوں اقوام متحدہ وجود میں آئی۔ اس ادارے کے تشکیل پانے کے کچھ ہی عرصے بعد اسرائیل کے قیام کی قرارداد منظور کرا لی گئی۔ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کے قیام کا اعلان ہو گیا۔ صہیونیوں نے اس پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اسرائیل کے گرد و نواح کی اسلامی مملکتوں پر حملے جاری رکھے حتیٰ کہ ۵ جون ۱۹۶۸ء بیت المقدس پر بھی قابض ہو گئے۔ صہیونی مسجد اقصیٰ کو برباد کرنے کے لیے اس کے نیچے سرنگیں کھود چکے ہیں تا کہ کسی معمولی سے زلزلے سے مسجد گر جائے اور انھیں ہیکل سلیمانی تعمیر کرنے کا بہانہ مل سکے۔ جس کے بعد ان کے نزدیک عالمگیر یہودی بادشاہ کا آنا یقینی ہے۔

2. ایلیا تحریک

ایلیا تحریک سے مراد وہ تحریک ہے جس کے تحت یورپ سمیت دنیا بھر میں یہود کو فلسطین واپسی اور وہاں آباد ہونے کی دعوت دی گئی۔ یہ تحریک پانچ ادوار سے گزری ہے۔

1. پہلی ایلیا تحریک ۱۸۸۱ء میں شروع ہوئی جب روس سے بہت سے یہودی فرار ہو کر فلسطین میں آباد ہونے لگے۔ یہودی سرمایہ داروں مونیٹوری اور روتھ شیلڈ نے فلسطین میں ان یہودیوں کی آباد کاری کے لیے پانی کی طرح دولت بہائی مگر یہ تحریک ناکام ہوگئی۔
2. دوسری ایلیا تحریک ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک جاری رہی۔ اس میں چالیس ہزار یہودی فلسطین آئے۔ جنھیں کِبتز(Kibbutz) سسٹم کے تحت آباد کیا گیا، اس میں زمین اور جائیدادیں کسی فرد کی ملکیت میں نہیں ہوتی تھیں۔ تمام لوگ مل کر کام کرتے تھے۔
3. تیسری ایلیا تحریک ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک جاری رہی۔ اس بار جو نئے یہودی آباد کار فلسطین آئے انھوں نے کاشتکاری کے ساتھ تجارت کا آغاز بھی کر دیا اور جلد ہی فلسطین کی تجارت میں اہم مقام حاصل کر لیا۔
4. چوتھی ایلیا تحریک ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۹ء تک جاری رہی۔ اس میں ۸۲ ہزار کے لگ بھگ یہودی روس، پولینڈ، رومانیہ اور دوسرے ملکوں سے فلسطین آ گئے اور بہت بڑے پیمانے پر فلسطین کی زمین ہتھیائی گئی۔
5. پانچویں ایلیا تحریک ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۹ء تک جاری رہی۔ اس بار یہودی آباد کاروں کی تعداد اڑھائی لاکھ سے متجاوز تھی۔
6. چھٹا دور ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک جاری رہا۔ اس دوران ڈیڑھ لاکھ کے قریب یہودیوں کو غیر قانونی طور پر فلسطین میں آباد کیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں قیامِ اسرائیل پر ایلیا تحریک کا اختتام ہو گیا۔

اعلانیہ تنظیمیں

1. بنی برتھ سوسائٹی:

بنی برتھ کا مطلب ہے "عہد کی اولاد" ایک جرمن یہودی نے ۱۸۴۳ء میں اس کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ فری میسنری کی مددگار تنظیم ہے جو اعلانیہ کام کر کے اس کے لیے زمین ہموار کرتی ہے۔ فری میسنری کے بڑے بڑے عہدے دار اعلانیہ زندگی میں اس سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔

2. لائنز کلب(The Lions Club):

لائنز(Liberty, Intelligence, Our Nation, Safety) کا مخفف ہے جس کا معنی ہے "آزادانہ روش اور دانش مندی ہمارا قومی تحفظ ہے"۔ لائنز کلب میں ایسے لوگوں کو لیا جاتا ہے جو سرمائے، علم یا منصب و جاہ کے اعتبار سے غیر معمولی ہوں، یا کسی میدان میں غیر معمولی صلاحیت کے حامل ہوں۔ لائنز کلب کے دو بڑے اہداف ہیں:

1. دنیا میں سیکولرزم (لادینیت) کو فروغ دینا۔
2. نسلِ نو کا ذہن صہیونیت کے مقاصد کے لیے ہموار کرنا۔

3. روٹری انٹرنیشنل(Rotary International):

یہود کی اس عالمی تنظیم کی بنیاد ایک امریکی وکیل پال ہیرس نے ۱۹۹۵ء میں رکھی۔ یہ تنظیم مختلف ملکوں میں فلاحی اور ترقیاتی منصوبوں کے ذریعے اپنے قیام کا جواز نکال لیتی ہے۔ اب دنیا کے ۱۵۷ ممالک میں اس کے تحت تین ہزار کے لگ بھگ کلب کھلے ہوئے ہیں جن کے ممبران کی تعداد بارہ لاکھ سے زائد ہے۔

یہودی تسلط کے عالمگیر ادارے

1. لیگ آف نیشنز(League of Nations):

یہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۸ء) کے بعد قائم ہوئی، اس کے قیام کا ظاہری مقصد ایک ایسا عالمی پلیٹ فارم مہیا کرنا تھا جو تمام ممالک پر اثر انداز ہو اور دنیا میں امن و سلامتی کا ضامن ہو۔ پہلی عالمی جنگ کے اختتام پر لیگ اوف نیشنز(League of Nations) کے ذریعے ہی وہ معاہدے ہوئے جن کے ذریعے خلافتِ عثمانیہ ختم ہوئی۔

2. اقوامِ متحدہ(United Nations Organization):

دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۶ء میں اقوام متحدہ وجود میں آئی، اس کے دو سال بعد ۱۹۴۸ء میں اسرائیل قائم ہو گیا جس کی زیادتیوں کو اقوام متحدہ نے ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔ شام، اردن، مصر اور لبنان پر اس کے متعدد جارحانہ حملوں کے خلاف کوئی تادیبی کاروائی نہیں کی گئی۔ ۱۹۶۶، ۱۹۷۳، اور ۱۹۸۲ء کی جنگوں میں عربوں کے قتلِ عام اور ہر قسم کے ممنوعہ اسلحے کے استعمال کو کبھی دہشت گردی شمار نہیں کیا گیا۔ ۲۰۰۰ء سے تا حال فلسطین میں اسرائیل کی بدترین خون ریزیوں کو کبھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ یہ حقائق اس سچائی کا ثبوت ہیں کہ اقوام متحدہ یہودیوں کے عالمی تسلط کا جال ہے۔

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

مع الأُستاذ فاروق

معین الدین شامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام تعریفیں، بلاشبہ اللہ ہی کے لیے ہیں۔ وہ اللہ جو ہمارا ربّ ہے، ہمارا ہے، ہمارا اللہ ہے! اسی نے ہمیں پیدا کیا اور وہی ہمیں موت دیتا ہے اور بلاشبہ اس نے موت و حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ دیکھے کہ ہم میں سے کون ہے جو بہترین عمل کرتا ہے۔

مع الأستاذ فاروق، استاد احمد فاروق کے ساتھ چند ملاقاتیں، ان کی چند یادیں، ان کی قیمتی باتیں، ان کی بعض ایسی باتیں جو مجھے خاص طور پر اچھی لگیں۔ حضرت استاذ سے آج تک جتنی ملاقاتیں رہیں، سب کا احوال اور سب کی سب تو یاد نہیں، لیکن جتنی ذہن میں تازہ ہیں سب ہی لکھنے کا ارادہ ہے کہ یہ ان شاء اللہ توشۂ آخرت ہوں گی، مجھ سمیت حضرتِ استاذ کے محبّین کے لیے دنیا و آخرت میں فائدہ مند ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ صحیح بات، صحیح نیت اور صحیح طریقے سے کہنے والوں میں شامل فرمالے۔ نوٹ: اس سلسلہ ہائے مضامین میں جہاں بھی 'استاذ' کا لفظ آئے گا تو اس سے مراد شہید عالمِ ربانی استاد احمد فاروق (رحمہ اللہ) ہوں گے۔

راقم تحریر نے زیرِ نظر تحریر کا کافی حصہ فتحِ کابل کے تین دن بعد لکھ لیا تھا، لیکن ناسازیٔ صحت کے سبب اس کی تکمیل نہ کر پایا، لہٰذا اب بہتریٔ صحت کے سفر کے ساتھ تکمیل کی گئی ہے، الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ! قارئینِ کرام سے راقم کی مکمل صحت یابی کی دعا کی بھی التماس ہے۔

یہ تحریر ماہِ ربیع الاول ۱۴۴۳ھ (اکتوبر ۲۰۲۱ء) کے مجلّہ نوائے غزوۂ ہند کے شمارے کے لیے حتمی کی گئی تھی، لیکن راقم کے مجلّے کی مجلس ادارت سے رابطے میں تعطل کے سبب ماہِ مذکورہ میں بھیجی نہ جا سکی، اب نذرِ قارئین ہے۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ!

الحمد لله وكفى والصلاة والسلام على أشرف الأنبياء.

اللّٰهم وفقني كما تحب وترضى والطف بنا في تيسير كل عسير فإن تيسير كل عسير عليك يسير، آمين!

مجھ بے بضاعت کے ساتھ 'مع الأُستاذ فاروق' لکھتے ہوئے کئی بار ایسا ہوا ہے کہ جس زمانۂ حال میں جس زمانۂ ماضی کا لکھ رہا ہوتا ہوں، تو حال اور ماضی کے بیچ ایک عجیب سی نسبت اور مشابہت ہوتی ہے۔

ہمارا کہف بَس چکا تھا، اور استاذ ہی کے کمرے میں ان کی میز سے متصل میز پر مجھے بیٹھنے کا موقع میسر تھا۔ یوں مجھے استاذ کو مکانی اعتبار سے نہایت قربت سے دیکھنے کا موقع حاصل تھا۔ استاذ کے چہرے کا اتار چڑھاؤ، مسکراہٹ، غصہ، غم و خوشی کے جذبات وغیرہ دیکھنا اس مکانی قربت کے سبب بہت سہل تھا۔ کئی طرح کے منصوبوں پر ہم زیرِ فیض و سرپرستیٔ استاذ میں کام کر رہے تھے۔ ان منصوبوں کا ذکر کچھ آگے، کچھ تو اسی نشست میں آجائے گا اور کچھ اگلی نشستوں میں، بعون اللہ، ان شاء اللہ!

لیکن انہی ایامِ ماضیہ میں ایک دن کی یاد آج کے واقعات سے بڑی مناسبت رکھتی ہے، سو اسی کے بیان کی کچھ کوشش کرتا ہوں۔

ہم ایک دن بیٹھے تھے کہ کوئی ساتھی کچھ 'جہادی ڈیٹا' یعنی جہادی رسائل، کتب، صوتیات اور ویڈیوز لے آیا۔ میری یادداشت کے پردۂ سکرین پر اب دو ویڈیوز کی یاد موجود ہے۔ ایک تو مجاہدینِ جزیرۃ العرب کے اعلامی ادارے 'الملاحم میڈیا' کی پیش کش تھی اور دوسری 'الامارہ سٹوڈیو' کی۔ اول الذکر ویڈیو میرے پاس اب بھی موجود ہے اور میں اکثر دیکھتا رہتا ہوں، یہ بھی بڑی اہم ویڈیو ہے۔ لیکن مؤخر الذکر ویڈیو اہم تر ہے۔

یہ سال ۲۰۱۱ء کی آخری سہ ماہی کا زمانہ تھا، مجھے دقیق مہینہ اور تاریخ یاد نہیں ہے۔ استاذ نے اپنے زیرِ استعمال لیپ ٹاپ میں الامارہ سٹوڈیو کی ویڈیو چلائی۔

یہ ویڈیو افغانستان کے صوبۂ کنڑ میں (سابقہ) 'افغان ملی اردو' کے ایک کیمپ کی فتح کی ویڈیو تھی اور میری ناقص معلومات کے مطابق شاید افغانستان کے کسی بھی کیمپ کی (مکمل و مستحکم امریکی قبضے کے بعد) پہلی ویڈیو تھی۔ ہم یہ ویڈیو دیکھنے میں مگن تھے، افغان فوجی اس مورچے کی فتح کی جنگ میں قتل ہوئے، بھاگے اور کئی تسلیم (سرینڈر) ہوئے۔ کثیر مالِ غنیمت مجاہدین کے ہاتھ لگا۔ یہ سب خوشی کے مناظر تھے۔ لیکن جس منظر کو سب ناظرینِ ویڈیو و منتظرینِ فتح نے دل کی آنکھوں سے دیکھا اور ظاہری آنکھیں جو منظر دیکھ کر ضبط نہ کر سکیں، کچھ اور تھا۔ ایک خدا مست مجاہد کلمۂ طیبہ سے مرصع ایک سفید جھنڈا لہراتا ہوا کیمپ کے سب سے اونچے مورچے کی طرف دوڑتا ہے اور جھنڈا اس پر نصب کر دیتا ہے۔ یہ کوئی ریشمی کپڑے کا جھنڈا نہیں تھا، نہ اس پر زری تار سے کاڑھ کر کلمہ لکھا گیا تھا، نہ جھنڈے کا بانس کوئی اچھا تھا۔ یہ خستہ کپڑا تھا، سادی سی روشنائی سے اس پر کلمہ درج تھا اور وہیں آس پاس سے کسی درخت کی شاخ توڑ کر اس پر جھنڈا چڑھا دیا گیا تھا۔

یہ جھنڈا نصب کرنا تھا اور گویا ہم سب ناظرینِ ویڈیو اس مجاہد کے ساتھ ہی تھے اور ناظرین میں سب سے آگے استاذ تھے۔ استاذ نے ہی سب سے پہلے ایک متین چہرے کے ساتھ تکبیر بلند کی۔ استاذ کے چہرے پر ایک گہرا تاثر تھا۔ متانت والا، سنجیدہ، فرحین اور شاید ایک غم بھی اس تاثر میں شامل تھا۔

متانت و سنجیدگی تو استاذ کے چہرے و دل کا مستقل خاصہ تھی۔ فرحانی منظرِ مذکورہ کے سبب تھی اور غم وہ غم تھا جسے شیخ احسن عزیز شہیدؒ نے کہا:

ع بہاروں سے پہلے جو آنکھوں پہ بیتی، وہ اتنی کٹھن تھی کہ مشکل بیاں ہے

لیکن غم اس کے ساتھ ایک اور بھی تھا۔ یقیناً پہلی چھوٹی سی فتح، ایک صوبے کے ایک ضلع کے چھوٹے سے کیمپ کی فتح تازہ ہوا کا جھونکا تھی، لیکن اس کے بعد سارا ہی افغانستان ابھی مقبوضہ تھا۔ اور ابھی پوری امتِ مسلمہ کا جغرافیہ، تاریخ، حال اور مستقبل کا ایک حصہ مقبوضہ تھا۔ بس شاید یہی غم بھی تھا۔

غم کا بیان کچھ زیادہ ہو گیا، لیکن ایسے موقعوں پر غم و خوشی کے ملے جلے جذبات ہی ہوتے ہیں۔ سوچیے کسی کا گمشدہ بیٹا کئی سالوں بعد اس کو مل جائے تو اس کی حالت کیسی ہو گی؟ شاید پہلا جذبہ تو خوشی ہی کا ہو گا لیکن اس کے بعد ماضی کی یادوں کا ایک تانتا ہو گا، اس وقت کی یادیں جو اس بیٹے کے بنا گزریں اور آنکھوں سے ایک سیل جاری ہو گا۔

لیکن فتح مندی کے وقت بندۂ مومن کی آنکھوں سے جو آنسو جاری ہوتے ہیں وہ اللہ کی حمد و ثنا کی بجا آوری کے آنسو ہوتے ہیں۔ المختصر استاذ کی آنکھوں میں اس وقت جو پانی اترا وہ فتح مندی میں شکر کا بھی تھا اور مستقبل کے غم کا بھی۔

۲۰۱۱ء کی اس پہلی سی فتح سے لے کر آج ۲۰۲۱ء تک افغانستان کی مکمل فتح تک تقریباً دس سال کا زمانہ ہے۔ ہمیں استاذ سے بچھڑے ساڑھے چھ سال سے زائد ہو چکے ہیں (جب یہ تحریر زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے تو حضرت کو شہید ہوئے چھ سال اور گیارہ ماہ ہو چکے ہیں)۔ استاذ اب فتح و شکست سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ ان کی فتح اسی وقت اتری تھی جب امریکی ڈرون سے 'پیامِ جنت' لیے 'ہیل فائر (Hellfire)' میزائل چلا تھا۔

کتنی ہزاروں آنکھیں اور ہیں جو اس فتح کے انتظار میں اسی جنگ میں بند ہو گئیں۔ کتنی لاکھوں آنکھیں ہیں جو خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد اسی خلافت و امارت کے قیام کی محنتوں میں کھپیں اور فلپائن تا مراکش اور کاشغر تا دریائے نیل و کانگو اس صبح کو دیکھنے کے لیے جاگتی رہیں، لیکن پہلے ہی بند کر دی گئیں۔ ان سبھی آنکھوں کے خیال سے دل بھر آیا، لیکن پھر وہی خیال آیا کہ ان کا حال تو فرحين بما آتاهم الله من فضله ہے، پھر غم کیسا۔

ہماری منزل کے زینے میں ابھی بہت سے قدم باقی ہیں۔ منزلیں بھی دو ہیں، ایک دنیوی فتح و کامرانی کی اور دوسری حصولِ جنت کی۔ یوں سمجھیے کہ یہ ایک عام زینہ ہے اور اسی کے ساتھ ایک لفٹ (elevator) بھی نصب ہے۔ من حیث المجموع امت کو اس زینے سے ہی چڑھنا ہے، لیکن جیسے ہی اس زینے پر چڑھنے کی محنت کرنے والے کی میعاد یا نذر پوری ہوتی ہے وہ یکایک ساتھ نصب لفٹ پر بیٹھتا ہے اور یک دم منزلِ اصلی کی جانب برق رفتاری سے چل پڑتا ہے۔ لیکن عمومی محنت کا راستہ یہی زینہ ہے۔ کبھی ہم اس زینے کی انتہا پر تھے، پھر آہستہ آہستہ کہیں خود اترے اور کہیں دشمن نے ہمیں دھکا دے کر اتارا۔

کہف کے انہی دنوں کی بات ہے کہ استاذ ہند تا روم کی فتح کی بات کرنے لگے۔ مجھے تھوڑا عجیب سا لگا۔ انہوں نے محسوس کر لیا اور کہنے لگے 'میں آپ کو اپنی بنجو میں بٹھا کر دہلی لے کر جاؤں گا'۔ انہوں نے کچھ اس پختہ انداز میں یہ بات کہی کہ مجھے سنتے ہی یقین ہو گیا۔ اب وہ یہاں نہیں ہیں، دہلی و اسلام آباد سے بے نیاز، لیکن ان کے پختہ عزم کی حدت ہمارے پاس موجود ہے۔ یمن میں مجاہدین کے امیر شیخ ابو بصیر شہید نے شیخ ابو سفیان الازدی شہید کے بارے میں فرمایا تھا کہ 'ان کے پاس بیٹھ کر اور ان کی ایمانی باتیں سن کر آدمی کو یقین ہو جاتا تھا کہ فتح بس صبح ہی آ جائے گی'۔ استاذ رحمہ اللہ کے ساتھ بیٹھ کر بھی کئی بار ایسا ہی محسوس ہوتا۔ سپاہ کو جنگ میں ایسے ہی حوصلے اور یقین کی ضرورت ہوتی ہے کہ فتح ہماری ہی ہے اور بس آیا ہی چاہتی ہے۔

حضور رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے کہ سخت ترین عسر، احزاب کے زمانے میں دنیوی لحاظ سے اعلیٰ ترین یسر، محلّاتِ قیصر و کسریٰ کی فتح یابی کی نوید دے رہے ہیں۔

ہم تو بعون اللہ آج کھلی آنکھوں سے قلبِ آسیا (ایشیا کے دل) یعنی افغانستان میں اسلام کو غالب ہوتا دیکھ رہے ہیں۔ افغانستان محض قلبِ آسیا نہیں بلکہ یہ قلبِ دنیا ہے، یہ قلبِ عالَمِ اسلام ہے۔ یہی وہ قلب ہے جو پوری دنیا کے مسلمانوں اور اسلامی تحریکوں کو گرم و تازہ لہو بخش رہا ہے، ہمارے ہی جسم کے باقی اعضا اس کو قبول نہ کریں تو کیسی بد نصیبی ہے۔ اہلِ افغانستان نے تو اپنا کام پورا کر دیا اور پوری امت پر حجت قائم کر دی کہ دیکھو اسلام یوں نافذ ہوتا ہے اور اس کے نفاذ کی محنت کا راستہ یہ ہے۔ اب ہم پر لازم ہے کہ امت کے باقی اعضا کی مرمت کریں تا کہ وہ اس گرم و تازہ خون سے پھر جی اٹھیں۔ جمہوریت و جدیدیت سے بیمار دماغ کی نہیں، ایمان و اسلام سے دھڑکتے دل کی بات مانیے، ایک بار مان لیں گے تو دماغ و ذہن بھی مان جائے گا اور امت کا یہ جسم اپنی پوری شان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہو گا۔

محفلِ استاذ یہیں روکتا ہوں، لیکن یہ سطور جب لکھ رہا ہوں تو ربیع الاول کا مہینہ ہے۔ یاد آیا کہ اسی کہف میں، میں نے کسی کام کے دوران استاذ سے پوچھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام کسی تحریر وغیرہ میں آئے تو کیا ہمیشہ 'صلی اللہ علیہ وسلم' پورا لکھا جائے یا صرف ' ؐ ' کا نشان کافی ہے؟

کہنے لگے کہ ''ایک بار 'صلی اللہ علیہ وسلم' لکھ دیا تو اصلاً تو کافی ہے کہ ایک مجلس میں ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے ساتھ درود پڑھنا لازمی ہے۔ لیکن جامعہ میں ہمارے ایک استاد تھے، وہ کہتے تھے کہ جو طالبِ علم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ ہر دفعہ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' پورا لکھتے ہیں، میں نے دیکھا ہے کہ ان طالبِ علموں کے ساتھ برکت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہر بار پورا ہی لکھا جائے''۔ (باقی صفحہ نمبر 49 پر)

جمہوریت......ایک دینِ جدید

فضیلۃ الشیخ حسن محمد قائد شہید (ابو یحییٰ اللیبی) رحمۃ اللہ علیہ

مفسرین نے لکھا ہے کہ بعض کفار نے مسلمانوں سے بحث کرتے ہوئے یہ شبہ پیش کیا کہ تمہارا زعم ہے کہ تم اللہ کی رضاجوئی چاہتے ہو حالانکہ جس جانور کو اللہ تعالیٰ ذبح کر دے (یعنی خود مر جائے) اسے نہیں کھاتے اور جسے تم خود ذبح کرتے ہو اسے کھاتے ہو؟ تو ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ○ (سورۃ الانعام:۱۲۱)

”اگر تم نے ان کی اطاعت کی (یعنی مردار کھایا) تو یقیناً تم بھی مشرک ہو جاؤ گے“۔

یہ تو ایک مشتبہ قسم کی بات تھی جو شیاطین نے اپنے دوستوں کو سمجھائی اور ان مشرکین نے پیش کی، اور اس بات کا تعلق بھی فقط ایک مسئلے یعنی مردار کی حِلّت سے تھا۔ ممکن تھا کہ کوئی اس معاملے کو معمولی خیال کرے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ اگر تم نے ان کا کہا مانا اور مردار کو حلال سمجھنے میں ان کی پیروی کی تو تم بھی مشرک ہو جاؤ گے۔ تو پھر آخر ان اسمبلیوں کی پیروی کرنے والے کو کیا کہا جائے گا جن کا قیام ہی حلال و حرام کا فیصلہ کرنے اور خود ساختہ قانون سازی کرنے کے لیے عمل میں آیا ہے۔ یہ اسمبلیاں اپنے ہی بنائے ہوئے دستور کے سوا کسی بات کی پابند نہیں ہیں۔ یہ لوگ تو جاہل و سادہ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے ہی سہی..... اپنے بنائے ہوئے قوانین اور حلال و حرام کے فیصلوں کا شریعت سے ناتا جوڑنے کی زحمت تک نہیں کرتے۔ ان کی نظر میں شریعت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اپنی خواہشات کو قوم کی مصلحت کے نام دیتے ہیں اور پھر اس کے مطابق قانون سازی کرتے چلے جاتے ہیں۔ اقتصادی مصلحت کے نام پر سود کو حلال کرتے ہیں، شخصی آزادی کے نام پر زنا و فواحش کے اجازت نامے جاری کرتے ہیں اور سیاحت و ترقی کے نام پر شراب و کباب کو مباح گردانتے ہیں۔

مثال کے طور پر یہ ایک معلوم شدہ امر ہے کے دینِ اسلام میں شراب قطعاً حرام ہے، لیکن اگر کوئی احمق رکنِ پارلیمان یہ قرارداد پیش کرتا ہے کہ ایک دو سال یا پھر ہمیشہ کے لیے شراب کی خرید و فروخت سے پابندی اٹھائی جائے تاکہ ملک میں اقتصادی ترقی ہو اور سیاحوں کے لیے کشش و سہولت پیدا ہو تو اس احمق پر کوئی مواخذہ نہیں بلکہ اس ”عظیم اقتصادی بل“ کو اپنے نفاذ کے لیے صرف اکثریت درکار ہو گی۔ اور اگر پارلیمنٹ کی اکثریت اس کی توثیق کر دے تو پھر شراب کی خرید و فروخت مباح ہو گی اور کسی کو یہ حق نہ ہو گا کہ اس کا انکار کرے بلکہ جو اس کی مخالفت کرے گا اس پر فردِ جرم عائد ہو گی اور وہ سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔

ارکانِ پارلیمنٹ میں سے اگر کوئی ہم جنس پرستی کا دلدادہ ہے اور اسے قانونی جواز مہیا کر کے اپنے اور اپنے جیسے دوسرے بدمعاشوں کو سہولت دینا چاہتا ہے تو اسے بھی بل پیش کرنے کی اجازت ہے۔ اسی طرح سودی لین دین کرنے والی بڑی کاروباری مچھلیاں اپنی پسند کی سودی اصلاحات کے نفاذ کے لیے قانون سازی کروا سکتی ہیں، شراب و کباب کے رسیا بھی اسمبلی سے ریلیف حاصل کرنے کے لیے بل پیش کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہیجڑے بھی اپنی تنظیمیں بنا کر ہیجڑا سازی کے کاروبار کو قانونی جواز عطا کرنے کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔ صرف ایک ہی شرط ہے کہ وہ دستور کے مخالف نہ ہو، جبکہ اسلام کے مخالف ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے بعد اگر پارلیمنٹ کی اکثریت چاہے تو ان تمام قراردادوں اور مطالبات کو منظور کر کے انہیں جواز مہیا کر سکتی ہے اور اس کے بعد تمام لوگوں پر انہیں تسلیم کرنا اور ان کا احترام کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

اور اسی طرح وہ قانون جو پارلیمنٹ سے منظور ہو جائے..... اگرچہ کہ وہ شریعت سے کلی طور پر متصادم ہی کیوں نہ ہو...... دینِ جمہوریت میں اسے ہر طرح کا تحفّظ اور تقدّس حاصل ہو گا کیونکہ پارلیمنٹ کی بالادستی اِس کے نزدیک ہر قسم کی حاکمیت سے بالاتر ہے۔

ثالثاً: دینِ اسلام میں کسی چیز پر یہ حکم لگانا کہ یہ حق ہے یا باطل، جائز ہے یا ناجائز، حرام ہے یا حلال..... اُس دلیلِ شرعی کی بنیاد پر ہوتا ہے جو کتاب اللہ اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے، جبکہ اجماع و قیاس بھی اسی کے تابع اور اسی سے مستنبط ہوتے ہیں۔ ایسے احکام کا ثبوت محض عقل، ذوق، رغبت، صلاحیت یا تجربہ پر مبنی نہیں ہوتا۔ حق تو وہ ہے جو خالص اور پاکیزہ آسمانی احکام پر مبنی ہو۔ یہ کسی گروہ یا جماعت کی ملکیت نہیں خواہ وہ کیسے ہی اوصاف کے حامل کیوں نہ ہوں، چاہے وہ سیاست سے متعلق ہوں، چاہے اکثریت کے حامل ہوں، چاہے عربی ہوں اور چاہے عجمی۔ وہ صرف اس وجہ سے حق ہے کہ شریعت نے اسے حق کہا ہے۔ اور جو باطل ہے وہ اس لیے باطل ہے کہ شریعت اسے باطل قرار دیتی ہے۔ اگر آسمانوں اور زمینوں کے تمام لوگ اس بات پر جمع ہو جائیں کہ شریعت سے ثابت شدہ حق کو باطل اور باطل کو حق قرار دیں تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ حق، حق ہی رہے گا اور باطل، باطل ہی کہلائے گا۔ ہدایت کو ہدایت ہی کہا جائے گا اور گمراہی، گمراہی ہی قرار پائے گی۔ جبکہ لوگوں کی قیاس آرائیوں اور اٹکل کی کوئی حیثیت نہیں۔

یہ بات اسلام سے ثابت ہے اور یہ عقیدہ رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اس کے برعکس دینِ جمہوریت میں کسی چیز کے صحیح یا باطل ہونے پر اور اس کے حسن و قبح پر حکم لگانا پارلیمنٹ کی

غالب اکثریت کا حق ہے۔(یہ عین وہی مسئلہ نہیں جس کا ذکر سابقہ صفحات میں گزر چکا ہے کہ پارلیمان کو تشریع و قانون سازی کا حق حاصل ہے۔ یہاں ہم یہ بات کر رہے ہیں کہ ارکانِ پارلیمنٹ کو اپنی مرضی و منشا کے مطابق رائے دینے کا حق بھی حاصل ہے۔ یہ سابقہ مسئلے سے مختلف ہے اگرچہ اس کے مشابہ ضرور ہے۔)

عظیم ترین مصیبت تو یہ ہے کہ جب کوئی تجویز اکثریت کی حمایت سے منظور ہو جائے تو اسے تمام ارکانِ پارلیمنٹ کی جانب سے سمجھا جاتا ہے اور ہر رکن پارلیمنٹ کو اس کا معترف اور موافق سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح مجلسِ ارباب (پارلیمنٹ) میں قانون سازی کا عمل تین مرحلوں میں طے ہوتا ہے۔

1. پہلا مرحلہ: اس میں کوئی بھی رکنِ پارلیمنٹ اپنی مرضی اور منشا سے دستور کی حدود میں رہتے ہوئے ایک تجویز (بل) پیش کرتا ہے۔
2. دوسرا مرحلہ: یہاں ہماری بحث اسی مرحلہ سے متعلق ہے، اس مرحلے میں اس تجویز پر رائے زنی اور مناقشہ و مباحثہ ہوتا ہے۔ ہر شخص اس بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی مرضی ہے کہ اس پر اعتراض کرے یا اس کی حمایت کرے۔ اس میں ترمیم کا مطالبہ کرے یا چاہے تو خاموش رہے۔ البتہ جب اکثریتی رائے سے وہ قانون منظور ہو جائے تو اسے قانونی و شرعی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔
3. تیسرا مرحلہ: یہ ہے کہ جب کوئی قانون بواسطہ پارلیمان منظور ہو جائے تو پھر یہ نہیں کہا جاتا کہ اکثریت کی حمایت سے منظور ہوا ہے۔ بلکہ ہر رکن پارلیمنٹ کو اس میں شریک سمجھا جاتا ہے کیونکہ کسی نہ کسی طور پر وہ قانون سازی کے اس عمل میں شریک ضرور ہوا ہے اور وہ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اکثریت کی حمایت سے منظور شدہ قانون تمام لوگوں پر واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

بہت سے لوگ دینِ جمہوریت کے خدوخال کی داد و تحسین میں مگن ہیں مگر میں یہاں ایک مثال بیان کرتا ہوں جس کے ذریعہ اس کا مکروہ چہرہ نمایاں ہو گا۔ مثلاً اگر کوئی گھٹیا ترین رکن پارلیمان دستور کی حدود میں رہتے ہوئے یہ تجویز پیش کرے کہ دو مردوں کو اعلانیہ طور پر شادی رچانے کی اجازت دی جائے اور اس سلسلے میں قانون منظور کیا جائے تو تمام ارکانِ پارلیمنٹ اس تجویز پر مناقشہ کرتے ہوئے اپنی اپنی رائے کا اظہار کریں گے۔ اپنی اپنی رائے دہی اور بحث کا اختیار استعمال کریں گے۔ پھر اس پر ووٹنگ ہو گی تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ اکثریت اس تجویز کی حمایت کرتی ہے یا مخالفت۔ اور اگر اکثریت اس کی حمایت میں ووٹ ڈال دے تو یہ تجویز ملکی قانون کا درجہ حاصل کر لے گی جسے ہر طرح کا احترام اور تقدس حاصل ہو گا اور اس قانون کو پورے پارلیمان سے منظور شدہ قرار دیا جائے گا، صرف اکثریت کی طرف سے نہیں۔

رسمی اعتراض تو صرف اس وقت تک ہوتا ہے جب تک وہ تجویز منظور نہ ہوئی ہو، مگر جب اکثریت کی حمایت سے کوئی قانون پاس ہو جائے تو پھر کسی کو اس پر اعتراض کا حق باقی نہیں رہتا۔ ایک دفعہ قانون منظور ہونے کے بعد تو اقلیت و اکثریت تمام ارکانِ پارلیمان پر واجب ہوتا ہے کے اس پر ''آمنّا وصدقنا'' کہیں۔

یہ انتہائی خطرناک اور مہلک حقیقت ہے جس کی زد میں نام نہاد اسلامی ارکانِ پارلیمنٹ بھی آتے ہیں۔ لیکن بہت سے لوگ اس حقیقت کا ادراک نہیں رکھتے اور یہ گمان کرتے ہیں کہ اسلام پسند لوگوں کے پارلیمنٹ میں جانے سے مفاسد کی روک تھام ہو گی اور اسلام کے بعض مفادات کی نگہبانی ہو سکے گی۔ مگر حقائق اس کے برعکس ہیں۔ اسی وجہ سے میں کہا کرتا ہوں کہ بالفرض اگر کسی پارلیمنٹ میں شرعی احکام کو محض جائزے ہی کے لیے پیش کیا جائے اور پھر ارکانِ پارلیمنٹ ان کے قبول و عدم قبول پر بحث کریں اور پھر ارکانِ پارلیمان کے اتفاق سے شرعی احکامات ہی نافذ بھی کر دیے جائیں تب بھی تمام ارکان پارلیمنٹ کی شرکیہ کفریہ اور طاغوتی حیثیت ختم نہیں ہو گی۔ وہ شرعی احکام بھی خود ساختہ قوانین کہلائیں گے جو چند انسانوں کے اتفاق سے منظور ہوئے ہیں۔ عین ممکن ہے یہی ارکان پارلیمنٹ آئندہ اجلاس میں ان قوانین کو کالعدم قرار دیں یا ان کے بعد آنے والے لوگ مختلف آرا و خواہشات رکھنے کی وجہ سے انہیں ختم کر دیں۔

علاوہ ازیں ہماری شریعت نے عوام کی اکثریت کو معصوم یا درست قرار نہیں دیا بلکہ کتابِ عزیز میں عموماً اکثریت کی مذمت ہی کی گئی ہے جیسے کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ (سورۃ یوسف:۱۰۳)

''اور اکثر لوگ اگرچہ تم کتنی ہی خواہش کرو ایمان لانے والے نہیں ہیں۔''

نیز فرمایا:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ (سورۃ یوسف:۱۰۶)

''اور اکثر لوگ اللہ پر ایمان کا دعویٰ رکھنے کے ساتھ اس کے ساتھ شرک بھی کرتے ہیں۔''

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (سورۃ الانعام:۱۱۶)

''اور اگر تم زمین میں بسنے والے اکثر لوگوں کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کر دیں گے، یہ محض خیال کے پیچھے چلتے ہیں اور نرے اٹکل کے تیر چلاتے ہیں۔''

اور فرمایا:

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ (سورة الاعراف:۱۰۱۔۱۰۲)

"اور ہم نے ان میں سے اکثر میں عہد نہیں پایا اور یقیناً ہم نے ان میں سے اکثر کو نافرمان پایا۔"

ایک اور مقام پر اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا (سورة الاسراء:۸۹)

"اور ہم نے اس قرآن میں سب باتیں طرح طرح سے بیان کر دی ہیں لیکن اکثر لوگوں نے انکار ہی کیا، قبول نہ کیا۔"

مزید ایک مقام پر فرمایا:

وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ (سورة الصافات:۷۱)

"اور ان سے پیشتر، پہلے لوگوں کی اکثریت گمراہ ہو گئی تھی۔"

اس حوالے سے دیگر بہت سی آیات بھی ہیں جو مشہور و معروف ہیں۔

اکثریت کے حوالے سے قرآنِ حکیم کا بیان آپ پڑھ چکے، اب سوال یہ ہے کہ اس دورِ جمہوریت میں کس نے اکثریت کو درست میزان اور انصاف پسند فیصلہ قرار دے کر شریعت سازی کا حق سونپ دیا ہے؟

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ (سورة القمر:۴۳)

"کیا تمہارے کفار ان سابقہ کفار سے بہتر ہیں یا تمہارے لیے سابقہ صحیفوں میں برات لکھ دی گئی ہے؟"

اس دینِ جدید (جمہوریت) پر بہت سے علمائے کرام نے لکھا ہے اور اس کی قباحتوں کو بیان کیا ہے تاکہ لوگ اس کی حقیقت سے آگاہ ہو جائیں۔ یہاں ہمارا مدعا صرف یہی تھا کہ جمہوریت کی بحث کی بنیادی اور اہم باتوں کی نشاندہی کریں۔ ورنہ اگر ہم جمہوریت کے شیطانی راستوں کی تفصیل میں جائیں تو بات بہت طول پکڑ جائے، (واللہ المستعان)!

اہم ترین تنبیہ

آخر میں ایک اہم بات کی تنبیہ کرنا چاہوں گا۔ ہم نے جمہوریت میں پائے جانے والے واضح نواقص بیان کیے تاکہ ایک مسلمان کے ذہن میں اس کی صحیح تصویر بن سکے، اور وہ اس میں داخل ہو کر اپنے دین کو خسارے میں ڈالنے سے بچائے۔ کیونکہ یہی دین تو ایک مسلمان کی عزیز ترین متاع ہے اور اس میں نقصان عظیم ترین خسارہ ہے۔ لیکن اس کا یہ مقصود نہیں کہ ہم اشخاص پر حکم لگائیں۔ یہاں جو حکم جمہوریت پر لگایا گیا ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو شخص جہالت یا تاویل کی بنا پر اس جمہوری عمل میں شامل ہوتا ہے اس پر بھی یہی حکم لگایا جائے۔ علمی و شرعی حقائق کا بیان ایک الگ چیز ہے اور اشخاص پر ان کا حکم لگانا ایک مختلف چیز۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ہدایت پر ثابت قدم رکھے اور راہِ حق پر ہمارے دلوں کو جما دے، یہاں تک کہ ہم اس میں کوئی تبدیلی و تغیر کیے بغیر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملیں، آمین۔

والحمد لله رب العالمین!

تمّت بالخیر

☆☆☆☆☆

بقیہ: اخباری کالموں پر ایک نظر

وہ مسلمان جو سیکولر آئین سے ساری امیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں اور یہ سارا ظلم خاموشی سے سہہ رہے ہیں انہیں اب حقیقت کو تسلیم کر کے اجتماعی طور پر آگے کی تیاری کرنی ہو گی۔ کیونکہ انڈیا کی نام نہاد سیکولر جمہوری حکومت ہندو اسٹیٹ کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔ اس خام خیالی سے بھی باہر آنے کی ضرورت ہے کہ اگلے انتخابات میں بی جے پی کی حکومت ختم ہو جائے گی اور کانگرس کی آجائے گی تو حالات بہتر ہو جائیں گے۔ اوّل تو جو ماحول اب بنا دیا گیا ہے اس میں کانگرس کا حکومت میں آنا ممکن ہی نظر نہیں آتا، اور اگر کسی وجہ سے وہ آ بھی جائے تب بھی وہ کبھی اکثریت کی خواہشات کے خلاف جانے کی جرأت نہیں کر پائے گی۔

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اگر آج ہم اپنے دفاع کے لیے اور اس ایجنڈے کے راستے میں رکاوٹ بننے کے لیے نہیں اٹھے تو ظلم کی یہ رات تاریک سے تاریک تر ہوتی چلی جائے گی، پھر شاید انجام بہت بھیانک ہو۔ غزوۂ ہند کے حوالے سے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں ہمارے لیے امید کی کرن ضرور ہیں، لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اُس وقت تک کوئی ابن قاسم مسیحا بن کر ہماری مدد کو نہیں آئے گا جب تک کہ ہم خود اپنے دفاع کے لیے اور اپنی حالت کو بدلنے کے لیے کھڑے نہیں ہو جاتے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امارتِ اسلامیہ افغانستان

دفترِ امیر المومنین

حقوقِ خواتین کے حوالے سے امیر المومنین شیخ ہبۃ اللہ اخندزادہ (دامت برکاتہم العالیۃ) کا فرمانِ خاص

امارتِ اسلامی کی قیادت تمام متعلقہ اداروں، علمائے کرام اور قبائلی بزرگان و سرداران کو حقوقِ خواتین کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے سنجیدہ اقدامات اٹھانے کی ہدایت کرتی ہے۔

1. نکاح (شادی) کے لیے بالغ عورت کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے۔ (نکاح میں فریقین کا ہم کفو ہونا بھی ضروری ہے اور فتنہ و فساد رفع کرنے کا اصول مدِ نظر رکھا جائے) کوئی شخص زور زبردستی سے کسی خاتون کو نکاح پر مجبور نہیں کر سکتا۔
2. عورت کسی کی ملکیت یا جائیداد نہیں بلکہ ایک آزاد و محترم انسان ہے، کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ جنگ و دشمنی ختم کرنے یا صلح کا معاہدہ کرنے کے لیے عورت کا سودا نہیں کر سکتا۔
3. شوہر کے انتقال کی صورت میں، شرعی عدت (چار ماہ دس دن یا مدتِ حمل) کی مدت گزرنے کے بعد، بشمول بیوہ کے خاندان و رشتہ داروں کے، کسی کے لیے روا نہیں کہ وہ بیوہ سے زبردستی، اس کی مرضی کے خلاف نکاح کرے۔ بیوہ شادی کرنے یا اپنے مستقبل سے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار خود رکھتی ہے۔ (گو کہ اس میں بیوہ کے لیے دوسری شادی کی صورت میں فریقین کے مابین برابری ہونا اور فتنہ و فساد رفع کرنے کا اصول مدِ نظر رکھا جائے گا)۔
4. اپنے نئے خاوند سے 'مہر' حاصل کرنا بیوہ کا شرعی حق ہے۔
5. بیوہ اپنے شوہر، بچوں، والد اور رشتہ داروں کے مال میں وراثت کا حق رکھتی ہے اور کوئی شخص اسے اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔
6. ایک سے زیادہ نکاح کرنے والے حضرات کے لیے ضروری ہے کہ وہ شریعتِ مطہرہ کے مطابق تمام خواتین کے حقوق ادا کریں اور ازواج کے مابین عدل و مساوات قائم کریں۔

اس فرمان کے درست طور پر نفاذ کے لیے تمام متعلقہ اداروں کو درجِ ذیل اقدامات کرنے کی ہدایت کی جاتی ہے:

- وزارتِ حج و اوقاف کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ علمائے کرام کو عوام کے درمیان خواتین کے حقوق سے متعلق آگاہی پھیلانے کی تحریض دلائے، تاکہ وہ اپنے خطوط و دروس اور تبلیغ کے ذریعے عوام میں یہ شعور پیدا کریں کہ خواتین پر ظلم اور ان کے حقوق کی پامالی، اللہ تعالی کے غیض و غضب اور ناراضگی کا سبب ہے۔
- وزارتِ اطلاعات و ثقافت کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنے وسائل استعمال کرتے ہوئے حقوقِ خواتین کے حوالے سے تحریری و صوتی مضامین اور مقالے شائع اور نشر کرے اور دیگر لکھاری و ادیب حضرات اور داعیان و مبلغین کی بھی حوصلہ افزائی کرے کہ وہ اس موضوع پر مفید مقالے لکھیں اور نشر کریں تاکہ خواتین کے شرعی حقوق کے موضوع پر علمائے کرام اور عوام الناس کی توجہ حاصل ہو اور عورتوں پر جاری ظلم کا خاتمہ کیا جا سکے۔
- عدالتِ عظمیٰ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنی تمام ذیلی عدالتوں کو حکم نامے جاری کرے کہ خواتین کے حقوق سے متعلق بالعموم اور بیوگان کے حقوق سے متعلق بالخصوص، تمام درخواستوں کو درست، مناسب اور با اصول طریقے سے سنا جائے اور ان پر غور کیا جائے تاکہ خواتین کو ان کے شرعی حقوق حاصل کرنے اور ظلم و جبر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے معاملے میں مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔
- تمام والی (صوبائی گورنر) اور ولسوال (ضلعی کمشنر) حضرات کے لیے ضروری ہے کہ اس فرمان پر عمل درآمد کے لیے مذکورہ وزارتوں اور عدالتِ عظمیٰ کے ساتھ مکمل تعاون کریں۔

والسلام

۲۸/۴/۱۴۴۳ھ ق | ۱۲/۸/۱۴۰۰ھ ش | ۳/۱۲/۲۰۲۱ء

قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر!

خلیفہ صاحب الحاج ملا سراج الدین حقانی حفظہ اللہ

امارت اسلامیہ افغانستان کی جانب سے شہید فدائی مجاہدین کی یاد میں ان کے عزیز و اقارب کے لیے منعقد کی گئی ایک محفل خاص میں خلیفہ صاحب الحاج ملا سراج الدین حقانی حفظہ اللہ کی گفتگو

نحمده ونصلي على رسوله الكريم

فاعوذ باالله من الشيطن الرجيم بسم الله الرحمٰن الرحيم

میرے دین اسلام کے پیروکار، غیرت مند معزز بزرگو! اساتذۂ کرام اور فدائی مجاہد ساتھیوں کے گھرانوں کے معزز بھائیو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اللہ تعالیٰ آپ سب کا ادھر آنا خیر وبرکت کا ذریعہ بنائے۔ میں پہلے پہل آپ سب حضرات سے معذرت کرتا ہوں اور آپ سے معافی مانگتا ہوں، کیونکہ یہ بیس سالہ جہاد کا جو مرحلہ گزرا، اس کا احاطہ عقل و تصور سے کرنا نہایت مشکل ہے۔ جو قربانیاں ان بیس سالوں میں پیش کی گئیں، تو چاہیے تو یہ تھا کہ ہم خود ہر شہید کے گھر تعزیت اور تسلی کے لیے چل کر جاتے۔ یقیناً آپ بھائیوں کے دلوں کو تکلیف پہنچی ہو گی، آپ کو ہم سے شکوہ پیدا ہوا ہو گا اور ناراض ہوں گے، لہٰذا ہمیں معاف کر دیجیے، اللہ تعالیٰ آپ سب کی قربانیاں قبول فرمائے، آمین!

یقین جانیے ہماری خواہش تھی کہ ہر استشہادی مجاہد کے گھر چل کر جاتے اور ان کے گھرانے کے ساتھ تعزیت کرتے، ان کو تسلی دیتے، لیکن حالات کی خرابی کی وجہ سے ہم یہ نہ کر سکے، اور مشکلات کی وجہ سے ہم نے اسی پر اکتفا کیا (اور سوچا تھا) کہ ایک وقت اللہ تعالیٰ ان شاء اللہ لائے گا کہ ان قربانیوں کے نتیجے میں ہماری جو آرزوئیں ہیں، اسلامی نظام کے قیام کی خاطر، نفاذِ شریعت کی خاطر، کفار کو اپنی سرزمین سے بھگانے کی خاطر، تو ہم ایک ایسے مبارک دن کو مبارک محفل میں شریک ہوں گے، یہ ہمارا رب سے کیے گئے وعدے پر ایمان تھا، اللہ تعالیٰ نے ہم سے کیا وعدہ سچا کر دکھایا، آپ سب کو مبارک ہو۔

میں آتا ہوں کچھ مختصر باتوں کی طرف، یقیناً ہر گھرانے کی یہ خواہش ہو گی کہ ہم آپ کے ساتھ تنہائی میں مجلس کرتے، ہمارے بچوں اور پیاروں کی قبریں ہمیں معلوم ہوتیں یا جہاں وہ شہید ہوئے تھے وہ جگہیں آپ دیکھ لیتے اور اس سے آپ سب کو تسلی و اطمینان حاصل ہو جاتا۔ ہمارے دلوں میں بھی یہی خواہش ہے، ان شہدا کی جو یادیں ہمارے پاس رہ گئی ہیں، وہ صرف ہمارا رب جانتا ہے، ان فدائین کو ان کارروائیوں کے لیے منتخب کرنا ہمارے اختیار میں نہیں تھا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا انتخاب تھا جس نے ان کو دینِ اسلام کے دشمنوں کے مقابلے کے لیے منتخب کیا۔

سال ۲۰۰۱ء یا ۲۰۰۲ء میں ہم مدرسے کے طالب علم تھے، یہ خلیفہ احمد شاہ صاحب میرے استاد ہیں، ان سے میں پڑھتا تھا، مجاہدین ہمارے پاس آتے تھے اور ہم سے کارروائی پہ جانے کے لیے ترتیب اور وسائل مانگتے تھے۔ اس وقت کئی لوگ یہ پروپیگنڈا کرتے رہتے تھے کہ امریکہ کے مقابل اپنے آپ کو نہ تھکاؤ، اس ابرہہ اور فرعون کا مقابلہ کرنا پہاڑ سے ٹکرانے کے مترادف ہے اور ان کے خلاف کامیابی ناممکن ہے۔ حتیٰ کہ یہاں تک یہ زہریلے پروپیگنڈے ہوا کرتے تھے کہ امریکی جہاں چاہیں بندے کو دیکھ سکتے ہیں اور جو ان کے خلاف اسلحہ اُٹھائے اس اسلحے کو لیزر کے ذریعے ناکارہ بنا دیا جاتا ہے۔ ہم بھی اسی کوشش میں رہتے کہ ایسے اسباب و وسائل ڈھونڈیں جن کے ذریعے ان کا مقابلہ کر سکیں، حالانکہ ہمارے پاس اس وقت کوئی رسمی مسئولیت بھی نہیں تھی۔ لیکن ہمارے والدِ محترم فرماتے تھے کہ ہمارا کام اس فریضے کو ادا کرنا ہے، کامیابی و ناکامی کی مسئولیت ہمارے سر نہیں یہ اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے، بس ہم نے جہاد نہیں چھوڑنا کیونکہ یہ ہم سب پر فرضِ عین ہے۔ ہم اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کریں گے اور ان شاء اللہ ایک وقت اللہ تعالیٰ لائے گا کہ مجاہدین اس دشمن کو شکست دے کر کامیاب ہوں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ ہماری نصرت فرمائیں گے۔

الغرض بات ہو رہی تھی ہمارے مجاہد بھائیوں کی...... تو عرض یہ ہے کہ اگر ہم ان کفار کے مقابلے کے لیے، ان پر حملے کرنے کے لیے فدائی کارروائیاں نہ کرتے تو ان کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا، لیکن اللہ رب العزت کی رضا، ارادہ اور فیصلہ تھا وَجَاهِدُوْا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ [1] ...یہ اللہ تعالیٰ کا انتخاب تھا۔

آپ کے علم میں ہو گا پہلا حملہ پلِ چرخی روڈ پر جرمنی کی فوج پر ہوا، اس حملے کے لیے جس فدائی مجاہد کا انتخاب کیا گیا تھا، زیادہ غم کی وجہ سے ہم اس فدائی مجاہد سے ملاقات بھی نہیں کر سکے، ہم بہت زیادہ غمگین تھے کہ یا اللہ آج حالات یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ ہم ان کفار کا مقابلہ مادی

[1] اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو، جیسا کہ جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں (اپنے دین کے لیے) منتخب کر لیا ہے۔ (سورۃ الحج: ۷۸)

وسائل و اسباب سے کرنے سے قاصر ہیں، اور ان کفار کے مقابل ایسی حسین جوانیاں قربان کرنی پڑ رہی ہیں، انہیں اپنے والدین، بہن بھائیوں سب کو چھوڑنا پڑ رہا ہے!

دوسرا حملہ یہاں دارالامان میں امریکیوں پر ہوا، چونکہ ابتدائی دن تھے، ہمارے پاس ان فدائی مجاہدین کی ترتیب نہیں تھی، ہمیں ایک ذریعے سے یہ فدائی ملے اور ہم نے ہدف تک پہنچانے کے لیے صرف ان کی رہبری کا کام کیا، پھر اس کے بعد نوجوان جوق در جوق استشہادی مجاہدین کی صفوں میں شامل ہوتے گئے، اس دور کے گواہ ہمارے پاس کافی ہوں گے، ہم نے جب ان نوجوانوں کا جذبۂ ایمانی دیکھا جو کفار کے مقابلے میں اپنی جانیں پیش کرنے کے لیے بے تاب تھے، اور ہم سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ ہمارے لیے فدائی کارروائی کی ترتیب بنادیں، تو ہم نے سوچا کہ یہ اللہ رب العزت کی نصرت ہے جس نے دینِ اسلام کے دفاع اور کفار کو شکست دینے کے لیے یہ اسلحہ، یہ طاقت ہمیں عطا کی ہے اور اگر یہ فدائی نوجوان خدانخواستہ غلط ہاتھوں میں چلے گئے تو روزِ محشر ہم اللہ تعالیٰ اور مخلوق کے سامنے شرمندہ ہوں گے، لہٰذا ہم پر لازم تھا کہ ہم ان نوجوانوں کی تربیت کا انتظام کریں۔ ہم نے کافی سوچا کہ ان کے لیے کس عنوان و ترتیب کے تحت تربیت کا نظام بنایا جائے، ہمارے لیے یہ بھی ایک امتحان تھا کیونکہ یہ ایک بہت بڑی امانت تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی مسئولیت ہمارے کندھوں پر ڈالی تھی۔ اگر ہم ان کی جانوں کو اپنی جانوں کے برابر نہ سمجھتے تو کل اللہ کے ہاں مجرم ہوتے۔ واللہ! اس وقت انتہائی مجبوری کے حالات تھے، ہم پر مستقل چھاپے پڑتے تھے، مستقل دن اور رات دشمن ہمارے تعاقب میں رہتا تھا، لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم ان نوجوانوں کی تربیت کے لیے اپنے گھر کے کسی فرد کا انتخاب کریں گے۔ یہی وہ موقع تھا کہ ہم نے حافظ بدرالدین (تقبلہ اللہ) کا انتخاب کیا، آپؒ نوجوان تھے اور یقین جانیے کہ اس بات کا بھی دل میں ڈر تھا کہ ان فدائین کے معاملے میں کہیں حافظ بدر الدین سے غفلت نہ ہو جائے، لیکن اللہ رب العزت کی رہنمائی تھی وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ [1]۔ اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو ان امور میں ایسی فراست و بصیرت سے نوازا کہ آپؒ نے ہمیشہ ایسی حکمتِ عملی بنائی جس پر عمل کرنے سے دشمن کو بھاری نقصان پہنچا۔

اکثر فدائی ساتھی ایک ایمانی غیرت اور جذبہ لے کر آتے تھے، حتیٰ کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کی محبت اور اللہ سے ملاقات کے شوق میں ایسے بے قرار تھے کہ ایک مقام آتا تھا جب ان کو کارروائی یا ہدف سے کوئی سروکار نہیں رہتا تھا، بلکہ مقصد صرف یہ تھا کہ کسی طریقے سے کارروائی کی ترتیب بن جائے اور وہ کارروائی ہماری شہادت کا ذریعہ بن جائے۔

ہم ان کے ساتھ اس معاملے میں چھوٹے بچوں کی طرح پیش آتے، ہم کوشش میں لگے رہتے اور ان کو کہتے کہ آج یا کل میں ترتیب بن جائے گی۔ اللہ گواہ ہے کہ ہم نے کبھی بھی ایسے ہدف کا انتخاب نہیں کیا جس میں ہمارا مقصد نام و نمود پیدا کرنا، ناموری یا اپنی کوئی خواہش پورا کرنا ہو۔ بلکہ ہمیشہ ایسے اہداف پر کام کیا جن سے دشمن کو بھاری نقصان پہنچے اور دینِ اسلام کو ترقی ملے۔ جب بھی ان فدائین کو کسی ہدف پر کارروائی کرنے کے لیے بھیجتے تو اس سے قبل ہم اپنے آپ کو اور ان فدائین کو آخری مرحلے تک ہدف کے بارے میں مطمئن کرتے اور ان کو دشمن کے بارے میں پوری معلومات دیتے تھے۔

جیسا کہ مجھ سے قبل اساتذۂ کرام اور ترانہ خوانوں نے ان استشہادی نوجوانوں کا تذکرۂ خیر کیا، یقین جانیے ان کی بہت سی یادیں اور کرامات ہمارے پاس ہیں، اور آج میں آپ سب کے سامنے شرمندہ ہوں، کیونکہ یہ آپ کی اولاد تھی جس کے فراق کے بعد آپ یقیناً دکھ اور درد سے گزرے ہیں۔ یہاں اکثر فدائین کے اقربا آئے ہوں گے، ہم کوشش کرتے تھے کہ وہ آپ سے ملاقات کرلیں، ان کو جب پتہ چلتا کہ میرے والد صاحب، بھائی یا رشتہ دار ملنے آئے ہیں، تو وہ ان سے چھپنے کی جگہ ڈھونڈتے تھے۔ میرے پاس ایک مولوی صاحب آئے اور انہوں نے گزارش کی کہ میرے بیٹے کو کوئی ورغلا کر ادھر لایا ہے، مجھے جہاد سے انکار نہیں لیکن میرا بیٹا کم سن ہے، مدرسے کا طالب علم ہے، آپ برائے مہربانی میرے بیٹے کو بلا کرلے آئیں۔ میں نے ایک ساتھی کو اس کو بلانے کے لیے بھیجا، ان کے بیٹے کا نام عبد اللہ تھا، اور ساتھی کو تاکید کی کہ عبد اللہ سے کہو کہ خلیفہ صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں کیونکہ اگر ان کو ان کے والد صاحب کا بتاتے تو شاید وہ نہ آتے۔ ہمارے اور ان کے درمیان جو محبت والا تعلق تھا وہ صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور اس محبت کی وجہ سے وہ مجھ سے ملاقات کا بے قراری سے انتظار کرتے تھے۔ جب عبد اللہ کمرے میں داخل ہوا اور اپنے والد کو دیکھا تو چیخیں مار مار کے رونے لگا، ایسے رویا جیسے ہم اس کو کسی دشمن کے حوالے کر رہے ہوں، میں نے اس کو سینے سے لگا کر پیار کیا اور کہا کہ عبد اللہ تم پریشان نہ ہو، تمہارے والد صاحب کے دل میں کافی شکوے ہیں، یہ سارے شکوے ختم ہو جائیں گے، تم ان کے ساتھ چلے جاؤ اور اگلی بار اجازت لے کر آجانا۔ خیر وہ اپنے والد صاحب کے ساتھ چلا گیا۔ دس دن بعد عبد اللہ اپنے والد صاحب کے ہمراہ دوبارہ آگیا، اور اس کے والد صاحب نے کہا کہ میری ساری عمر کے لیے توبہ ہے...... آئندہ میں اپنے بیٹے کے بارے میں آپ سے سوال نہیں کروں گا کیونکہ یہ محبتِ الٰہی جو اللہ نے اس کے دل میں ڈالی ہے اس کے سامنے میرے اختیار میں نہیں کہ میں اس کو روک سکوں، یہ اللہ تعالیٰ کا

---

[1] اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم لازماً ان کی رہنمائی کریں گے اپنے راستوں کی طرف اور یقیناً اللہ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (سورۃ العنکبوت: ۶۹)

انتخاب ہے، بس خلیفہ صاحب آپ سے ایک گزارش ہے کہ اس کو غلط جگہ استعمال نہ کیجیے گا، غلط ہاتھوں میں یہ استعمال نہ ہو۔

اکثر گھرانے مجھ سے ناراض ہوئے ہوں گے اس وجہ سے کہ ان کی ملاقات نہیں ہو سکی یا ہم نے ان کا حال نہیں پوچھا۔ اس کے باوجود آج بھی مجھے جن القابات، اوصاف اور مدح سے یاد کیا جاتا ہے، اس پر میں آپ سب کے سامنے شرمندہ ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے اور ہمارے ساتھیوں کو معاف کردے۔

جب فدائین کارروائی کے لیے روانہ ہوتے تو ان سب کی خواہش ہوتی کہ خلیفہ صاحب سے ملاقات والوداع کیے بغیر نہ جائیں۔ کئی دفعہ بے تحاشا مصروفیت و تھکاوٹ کے باوجود میری کوشش ہوتی کہ ان کو رخصت کرنے کے لیے ضرور جاؤں۔ یقین جانیے ان کی آہیں وسسکیاں اور یادیں جو ہمارے پاس رہ گئی ہیں، آج ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے اور آپ سب کے سامنے شرمندہ ہیں کہ کہیں خدانخواستہ ہم سے ان امور میں کوئی کوتاہی یا نقصان سرزد نہ ہو جائے۔ ان کی یادیں جو ہمارے پاس رہ گئی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ہم سب کی کامیابی کا ذریعہ بنائے اور اس سے ہمارے حق میں نیک نتیجہ نکالے، آمین!

یقین جانیے ہمارا اور آپ کا رشتہ قربانی اور دین کی وجہ سے ہے، آج اگر یہ پورا کابل ایک مضبوط حصار بنا ہے تو یہ ان فدائین کی غیرت و حمیت کی وجہ سے بنا ہے۔ میں اس وزارت اور اس ریاست کے عہدے پر شرمندہ ہوں، ہم آج ان شہدا کے خون میں تیرتی کشتی میں بیٹھے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں آزمائش میں نہ ڈالے۔ واللہ العظیم میری یہ سوچ کبھی نہیں رہی یا میرے ذہن میں یہ کبھی نہیں آیا کہ اس سرخ خون و گوشت کے ٹکڑوں کے بدلے ہم ان شہدا کو بھول جائیں اور حکومت واقتدار ہمارے ہاتھوں میں آجائے۔ میں اللہ تعالیٰ سے یہ توفیق مانگتا ہوں کہ آپ سب کے ساتھ یہ تعلق تاابد قائم ودائم رہے تاکہ اس تعلق کی برکت سے ہم ان شہدا کی قربانیوں اور یادوں کو بھلا نہ سکیں، یہ قربانیاں میں اپنے لیے، پوری قوم کے لیے اور امارت اسلامیہ کے لیے سعادت سمجھتا ہوں، کیونکہ یہ ایسی قربانیاں ہیں جو دینِ اسلام کی تقویت اور کامیابی کا ذریعہ بنیں۔

دیکھیے یہ انٹر کانٹیننٹل ہوٹل ہے، یہاں اس ہوٹل کا عملہ بھی موجود ہو گا۔ معذرت کے ساتھ کہ میں ان کے سامنے یہ ذکر مناسب نہیں سمجھتا لیکن مجبوراً عرض کر رہا ہوں۔ یہاں غیر ملکیوں یا امریکیوں کی اہم مجالس ہوا کرتی تھیں اور ہم ان پر کارروائی کی ترتیب بنا رہے تھے۔ اس ہدف کی تکمیل میں مشکلات اور رکاوٹیں بہت زیادہ تھیں جیسے فدائین کو کس طریقے سے اندر داخل کریں؟ اور اسی میں کئی مہینے گزر گئے۔ جیسا کہ خلیفہ احمد شاہ صاحب نے تذکرہ کیا کہ مختلف راستوں سے ہم نے اس ہدف کا ترصد کیا، ہوٹل کے اندر سے مخبروں کو ڈھونڈا، استخارے کیے۔ راستے میں رکاوٹیں زیادہ تھیں تو کس سمت سے داخل ہونا چاہیے؟

...... آخر 'باغ' والی سمت سے اندر داخل ہونے والا راستہ اللہ تعالیٰ نے سجھا دیا۔ اللہ تعالیٰ شاہد ہے کہ ہم جب کوئی ترتیب بناتے تھے تو ہمیں اپنے ترصد پر اعتماد و یقین نہیں ہوتا تھا، ہم کوشش کرتے کہ جو فدائی بھائی اس کارروائی میں حصہ لیں گے ان میں سے ایک دو کو خود ہدف کے ترصد کے لیے بھجوایا جائے تاکہ وہ آنکھوں دیکھا حال بتا سکیں۔ اس کے بعد استخارہ کرتے اور استخارے کے بعد جو ممکن ہوتا اس کے مطابق ترتیب بنا دیتے۔ جب اس کارروائی کی ساری ترتیب مکمل ہوئی، تو ان فدائین میں سے ایک فدائی ساتھی...... غالباً شاہد نام تھا جو سفر پر گئے ہوئے تھے۔ وہ یہاں میدان وردگ آئے اور اس نے ہم سے رابطہ کیا اور حافظ بدر الدینؒ کو کہا کہ آپ تو ترتیب بنا چکے ہیں لیکن مجھے کل رات خواب میں رسول اللہ ﷺ نظر آئے تھے اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان فدائیوں تک اپنے آپ کو پہنچاؤ، اور جس سمت سے آپ نے حملہ کرنا ہے، اس جگہ کی نشانی ساتھیوں کو بتا دو، تم ان کے ساتھ اس جگہ پر جا کے مل جانا۔ میں نے جب یہ سنا تو حافظ صاحب سے کہا کہ اس میں تو کچھ کہا نہیں جا سکتا، اگر ہمارا راز اس حد تک استشہادی مجاہدین کو معلوم ہوتا ہے، تو پھر خواب دیکھنے والے بھائی کو اجازت دے دیجیے تاکہ وہ باقی فدائین تک پہنچ سکے۔

پھر جب کارروائی شروع ہوئی تو رحمٰن اللہ دروازے میں شہید ہو گئے، حافظ کلیم اللہ اور باقی ساتھیوں نے جنگ جاری رکھی اور تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ اس وقت حافظ بدر الدینؒ ان کے ساتھ فون پر رابطے میں تھے، حافظ صاحب میرے پاس آئے اور مجھے کہا کہ خلیفہ صاحب کارروائی کا آخری مرحلہ آن پہنچا ہے اور فدائین نے ایک بھاری مطالبہ کیا ہے جس کو پورا کرنا میرے لیے ممکن نہیں، وہ چاہتے ہیں کہ خلیفہ صاحب ہمارے ساتھ فون پر بات کریں۔ اس دور میں، میں (امنیاتی مشکلات کے سبب) فون پر بات نہیں کرتا تھا، میں نے حافظ صاحب سے کہا کہ ان فدائین نے پانچ منٹ یا ایک گھنٹہ بعد شہید ہو جانا ہے، اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر اپنی جانوں کو قربان کرنے والوں کی آخری خواہش ہے، چاہے جتنا بھی خطرہ ہو میں ضرور پوری کروں گا۔

پھر میں فون کی جگہ گیا اور ان کے ساتھ بات چیت کی۔ جب میں نے حافظ کلیم اللہ کو فون پر سلام کیا، تو کلیم اللہ نے مجھ سے کہا کہ ''خلیفہ صاحب! ہم نے اپنے دل کی آرزو پوری کی ہے اور بہت سے کافروں کو مردار کیا ہے، اب ہم صرف شہادت کے انتظار میں ہیں......''۔ اس کے بعد جب یہ بھائی شہید ہو گئے تو ہمارے ایک ساتھی نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ایک مسجد کی چھت کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں، اور انٹر کانٹیننٹل ہوٹل کے فدائین کو سند دے رہے ہیں اور ان سے فرما رہے ہیں کہ میرے مومنین میں سے بہادر ترین تم لوگ ہو۔ یہ فدائی کسی کے تربیت یافتہ نہیں تھے، مبشرِ صادق رسول اللہ ﷺ ان کی رہنمائی کر رہے تھے۔

خوست کے سرہ باغ میں جو فدائی ساتھی شہید ہوئے، باقی پیچھے رہنے والے فدائی ساتھیوں کے مرکز میں، مَیں گیا تو وہ سارے ایسے بیٹھے تھے جیسے والدین سے یتیم ہو گئے ہوں اور رو رہے

تھے کہ ہم کارروائی سے پیچھے رہ گئے اور میں ان کو حوصلہ دلا رہا تھا، خوش کر رہا تھا۔ اُس رات ایک بھائی نے خواب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے روضۂ مبارک پر گئے ہیں، آپ ﷺ سب میں حلوہ تقسیم کر رہے ہیں اور فرما رہے ہیں كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ [1] اور ان کے مرکز کے اوپر لکھ رہے ہیں "اصحاب الجنة"، میں کہتا ہوں کہ آپ سب اللہ تعالیٰ کی حمد اور شکر ادا کریں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے گھرانے میں ایسا انتخاب کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی قربت میں آپ کے سفیر بیٹھے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کے وبال سے ہمیں بچانے کی خاطر، ہماری شفاعت کی خاطر، اس اُمت کی نجات کی خاطر... ہم اللہ تعالیٰ کے حضور ان گھرانوں کی قربانیاں وسیلے کے طور پہ رکھتے ہیں، اللہ ان کی وجہ سے آنے والی آزمائشوں کو رفع کر دے۔ ایک تڑپ میرے دل میں رہے گی اور وہ یہ کہ دنیاوی لحاظ سے میں آپ کے ساتھ وہ خیر خواہی نہیں کر سکا جس کے آپ سب لائق ہیں، آپ سب نے اس راستے میں جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے اللہ تعالیٰ سے آپ کے لیے اس کے اجر کا سوالی ہوں، آپ سب بنی آدم میں اللہ تعالیٰ کے یہاں معزز ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں آخرت کے دن بھی رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے تلے اکٹھا فرمائے، آمین!

حافظ بدرالدینؒ کو میں کہتا تھا کہ حافظ صاحب آپ کے کندھوں پر کافی بھاری مسئولیت ہے، نوافل و وظائف کا اہتمام کیا کریں، خدانخواستہ کوئی کوتاہی نہ ہو جائے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض نہ ہو جائیں، حافظ صاحب نے مجھے جواب دیا کہ "اے خلیفہ صاحب! آپ مجھ سے کیسا گمان کر رہے ہیں، آپ نے مجھے ایسے لوگوں پر امیر بنایا ہے جن کی وجہ سے میں تمام دنیاوی خواہشات بھول گیا ہوں، اس مسئولیت کی وجہ سے میں مجبور ہوں کہ نوافل و وظائف کا اہتمام کروں"۔

اللہ تعالیٰ نے آپؒ کو حکمت و بصیرت سے نوازا تھا، شہادت سے قبل آپؒ پر ایک دو جگہ بمباری ہوئی تھی جس میں ساتھی شہید ہو گئے تھے، لیکن آپؒ نے عین بمباری کے وقت احتیاطی تدابیر اختیار کیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی۔ پھر جب آپؒ پر آخری بمباری ہوئی تو میں نے ساتھیوں سے کہا کہ آپ لوگ جائیں اور وہاں جھاڑیوں میں حافظ صاحب کو تلاش کریں، شاید جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ہوں۔ پھر ساتھیوں نے ان کی میت ڈھونڈ نکالی لیکن مجھے صدمے سے محفوظ رکھنے کی خاطر خبر نہیں دی۔ بعد میں ایک بھائی نے مجھے بتایا کہ حافظ صاحبؒ کا صرف سینہ سلامت رہ گیا تھا اور باقی جسم نہیں ملا۔ ہم نے ان کو ان کے سینے سے پہچانا کیونکہ وہ حافظِ قرآن تھے۔

اگرچہ ہمیں خود فدائی کارروائی کا موقع نہیں ملا لیکن میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ کل قیامت کے دن اپنے مامورین اور دین کے اِن پروانوں کی قربانیوں کے صدقے، ان کے جسم کے ٹکڑوں کے عوض اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے ساتھ اُٹھائے۔ میرے والد صاحبؒ جب فوت ہو گئے تو ہمارے گھرانے کے افراد میں سے کسی نے خواب میں دیکھا کہ آپ اور حافظ بدرالدین رحمہما اللہ قبرستانِ شہدا میں کھڑے ہیں اور والد صاحبؒ نے امارت اسلامیہ کا جھنڈا ہاتھ میں اُٹھایا ہوا ہے اور فرماتے ہیں کہ جس طرح حافظ صاحب نے ان فدائین کو اللہ کے دین پر قربان کر دیا، اسی طرح میں نے بھی اپنے بیٹے حافظ بدرالدین کو اللہ کے دین پر قربان کر دیا۔

ابھی الحمدللہ اللہ تعالیٰ کی نصرت سے اسلامی نظام کا قیام ہو گیا، آپ سب مستجاب الدعوات ہیں، جس طرح آپ سب کے دلوں میں اپنی اولاد کا دکھ اور ان کی محبت رچی بسی ہے، اپنی اولادوں کی خاطر اس نظام کی ترقی اور کامیابی کے لیے دعائیں کیا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمارا استحکام شریعت کے سائے میں کرے، ہماری نیتوں کو اپنی رضا کے لیے خالص کر دے، ہمیں مال ومتاع اور خواہشات کی طرف مائل ہونے سے بچائے رکھے، کیونکہ جہاد میں کامیابی احدی الحسنیین پر موقوف تھی، لیکن ادھر حکومت قائم ہونے میں شہرت، مال، دنیاوی خواہشات بے حد زیادہ ہیں، ان سب مراحل میں اگر ایک فرد اس نیت سے نکلے کہ میں اللہ کے دین کا خادم بن کر خدمت کروں گا تو بھی اس راستے کے فتنوں کا شکار ہو سکتا ہے، لہٰذا ہمارے لیے اپنی اولاد کی طرح دعائیں کیجیے گا کہ اللہ تعالیٰ ہماری باقی زندگی اللہ رب العزت کی اطاعت اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کے احیا میں گزارے، اور اس نظام کے قیام میں جو رکاوٹیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب رکاوٹوں کو اپنے فضل سے رفع کر دے اور اللہ تعالیٰ ہمیں مجبور نہ کرے کہ ماضی میں ہم جن حالات سے گزرے دوبارہ اس طرح کے حالات سے گزرنا پڑے۔

ہم پر اس راستے میں جب بھی ایسے حالات آئے جن میں ہمیں خدشہ ہوا کہ کہیں خدانخواستہ تنزل کا شکار نہ ہو جائیں تو ہماری نظریں شہدا کی طرف اٹھتی تھیں کہ ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ ان کی برکت سے ہمیں گرنے نہیں دے گا، میری تو خواہش ہے کہ ان شہداء کی ساری یادیں آپ کے ساتھ شریک کروں، لیکن آپ سب دور سے آئے ہیں اور وقت بھی کم ہے، اللہ تعالیٰ آپ سب کو ہر ہر قدم پر اجرِ عظیم سے نوازے، آمین!

وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العالمین!

☆☆☆☆☆

[1] اپنے ان اعمال کے صلے میں مزے سے کھاؤ پیو، جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے تھے۔ (سورۃ الحاقۃ: ۲۴)

ہم بیس سال تک افغانستان میں ہارتے رہے!

زلمے خلیل زاد

زلمے خلیل زاد ایک افغان نژاد امریکی سیاست دان و سفارت کار ہے، امارتِ اسلامیہ افغانستان اور امریکہ کے درمیان ہونے والے معاہدۂ دوحہ میں امریکہ کی جانب سے سفیر تھا۔ خلیل زاد نے افغانستان میں مجاہدین کی فتح اور امریکی شکست (فتحِ کابل) کے تقریباً دو ماہ بعد بطورِ سفیر اپنے عہدے سے شکست کا اعتراف کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔ خلیل زاد کی امریکی انتظامیہ میں اہمیت اس بات سے بھی واضح ہوتی ہے کہ 'وار آن ٹیرر' کے گزشتہ بیس سالوں میں وہ امریکہ میں ریپبلکن و ڈیموکریٹ دونوں پارٹیوں کی حکومت میں کلیدی عہدوں پر فائز رہا (امریکی سفیر برائے افغانستان، امریکی سفیر برائے عراق، امریکی سفیر برائے اقوامِ متحدہ، امریکہ کی خصوصی مذاکراتی ٹیم برائے امارتِ اسلامیہ افغانستان کا سربراہ، وغیرہ)۔

ذیل میں ہم امریکی سفیر زلمے خلیل زاد کے چند ہفتے قبل سی بی ایس نیوز کے پروگرام فیس دی نیشن میں دیے گئے انٹرویو کے معتد بہ حصے کا خلاصہ و استفادہ پیش کر رہے ہیں۔ ذیل میں اکثر جگہوں پر میزبان صحافی کے سوالات درج کیے گئے ہیں اور بعض جگہوں پر ان کو درج نہیں کیا گیا۔ کوشش کی گئی ہے خلیل زاد کے اکثر الفاظ کو ان کی اصل ہئیت میں ہی برقرار رکھا جائے۔ اس انٹرویو میں جہاں امریکیوں کی شکست کا اعتراف ہے تو وہیں مجاہدین کی اعلیٰ صفات کا اعتراف بھی جابجا موجود ہے۔ انٹرویو کا ترجمہ اور بعض جگہوں پر حاشیوں کا اضافہ اسلامی صحافی سیلاب خان (س خ) نے کیا ہے۔ (ادارہ)

صحافی: امریکہ کے افغانستان جانے کے مقاصد کیا تھے؟

خلیل زاد: ہم افغانستان میں اس لیے گئے تھے کہ ہم چاہتے تھے کہ نائن الیون کے حملوں میں جو کوئی بھی ملوث ہے اس کو انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے (یہ پہلا مقصد تھا)۔ جہاں تک ایک 'جمہوری' افغانستان کی تعمیر کی بات ہے تو میرے خیال میں یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ اور اس کوشش کو اب خود افغانوں کو آگے جاری رکھنا ہو گا۔ ہم افغانستان میں بہت سی تبدیلیاں لائے ہیں، میرا خیال ہے لاکھوں افغان آج تعلیم یافتہ ہیں، وہاں موبائل فون (جدید ٹیکنالوجی) استعمال کرنے والے بہت سے لوگ ہیں۔ لیکن ہمارا دوسرا ہدف یعنی افغانستان کو ایک متحدہ جمہوری ریاست میں تبدیل کرنا...... ہم اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

صحافی: کیا آج کے طالبان ہمارے اتحادی ہیں؟

خلیل زاد: ہم نے طالبان سے بیس سال جنگ کی ہے۔ وہ ہمارے اتحادی نہیں ہیں۔ طالبان افغانستان کی حقیقت ہیں۔ وہ عسکری طور پر زمین پر جیت رہے تھے۔ اور یہی وہ سبب ہے کہ...... ہم چونکہ عسکری طور پر افغانستان میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے...... ہم طالبان کے ساتھ مذاکرات کی میز پر بیٹھے بھی اسی لیے کہ ہم وہ نتائج حاصل نہیں کر پائے جو ہم حاصل کرنا چاہتے تھے اور سالانہ بنیادوں پر ہم سے علاقے چھنتے جا رہے تھے۔ حتیٰ کہ جب ہم ان سے مذاکرات کر رہے تھے تب بھی وہ میدان میں مستقل فتوحات حاصل کرتے جا رہے تھے۔

صحافی: کیا وہ جنگ جیت رہے تھے؟

خلیل زاد: [کچھ اٹکتے ہوئے اور تھوک حلق سے نیچے نگلتے ہوئے] آہستہ آہستہ...... ہاں...... وہ مستقل کامیاب ہوتے جا رہے تھے اور اس کامیابی کو ناکامی میں بدلنے کے لیے ہمیں کہیں زیادہ کوششیں کرنا پڑتیں (جو ہم کر رہے تھے ان کی نسبت)۔ اور ہم نے کئی دفعہ ان کوششوں کو تیز کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن ہم ان کے مقابل پیش قدمی (progress) نہیں کر پا رہے تھے۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ مذاکرات کرنے چاہییں اور مذاکرات اس رائے (یعنی ہدف) اور اس رائے (حاصل ہوتے نتائج) کے نتیجے میں سوچ بچار اور غور و فکر کا نتیجہ تھے کہ...... ہم جنگ نہیں جیت رہے تھے اور وقت ہمارے ساتھ نہیں تھا اور بجائے مزید وقت ضائع کرنے کے جلدی کسی معاہدے پر پہنچنے کی ضرورت تھی۔

صحافی: اور اسی نتیجے پر صدر اوبامہ، صدر ٹرمپ اور صدر بائیڈن بھی پہنچے؟!

خلیل زاد: جی ہاں!

صحافی: پنٹاگان نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بہت سے ایسے افغانی کمانڈوز بھی افغانستان میں پھنسے ہوئے ہیں جو ہمارے فوجیوں کے ساتھ مل کر لڑے، ہماری خاطر لڑے اور بہت سے ترجمان (جنگی کارروائیوں میں امریکی و افغانی زبانوں کے مترجمین) بھی وہاں پھنسے ہوئے ہیں جو امریکہ آنا چاہتے ہیں...... کیا ہم ان کو وہاں سے نکالنے کی ذمہ داری کا مزید بوجھ اٹھانا چاہیں گے؟

خلیل زاد: سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ ہماری خاطر نہیں لڑے۔ وہ اپنے ملک کی خاطر لڑے۔ کبھی کبھی ہم ٹھیک سے اندازہ نہیں کر پاتے (اور کہتے ہیں کہ) جو کچھ افغانستان میں ہوا وہ ہماری کوشش تھی، دراصل افغان خود اپنے اندر بڑے پیمانے پر تقسیم ہیں۔ کچھ افغان ایک جمہوری ریاست میں یقین رکھتے ہیں، زیادہ مغربی انداز کی حکومت۔ پھر اور افغان ہیں جو زیادہ اسلامی حکومت کو سپورٹ کرتے ہیں، طالبان کی طرح (یہ ایک بات ہو گئی)۔

جہاں تک وہاں پھنسے لوگوں کی بات ہے تو طالبان نے خود قومی ٹیلی وژن پر کہا ہے کہ جو افغانی امریکہ کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں اگر وہ وہاں جانا چاہیں تو وہ (طالبان) ان کو نہیں روکیں گے۔

صحافی: بعض رپورٹوں کے مطابق ان کو تلاش کیا جا رہا ہے اور مارا بھی جا رہا ہے، طالبان کی طرف سے؟

خلیل زاد: میں نے ایسی رپورٹیں دیکھی ہیں۔ اور جب میں خود حکومت میں تھا تو میں نے یہ مشاہدہ کیا کہ کئی بار اس قسم کی رپورٹیں درست نہیں ہوتیں۔ کئی لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو طالب ظاہر کیا اور کسی ذاتی مسئلے کے سبب دشمنی نکالی یا انتقام لیا۔

صحافی: (آپ جانتے ہیں) بچیوں کو سکول جانے سے روکا جا رہا ہے، عورتوں کو حقوق نہیں دیے گئے، غذائی قلت سے دس لاکھ بچوں کی ہلاکت کا خطرہ ہے![1]

خلیل زاد: طالبان کا افغانستان کے لیے وژن ایک زیادہ اسلامی وژن ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام کی تعبیر میں ایک اختلاف موجود ہے[2]۔ ایسے میں ہمیں ان کے پیسے منجمد رکھنے چاہئیں اور جو چیزیں وہ دنیا سے چاہتے ہیں وہ روکے رکھنی چاہئیں۔

صحافی: جنرل ملی اور جنرل مک کنزی وغیرہ سے جب بھی افغانستان کی جنگ سے متعلق بات ہوتی ہے تو وہ ہر دفعہ بات کو واپس لوٹاتے ہیں ۲۰۲۰ء کے معاہدے کی طرف اور کہتے ہیں کہ یہ وہ لمحہ تھا جب افغان فوجیں حوصلہ ہار گئیں۔ جب بائیڈن کہتا ہے کہ Afghan forces melted away تو اس کا سبب یہ معاہدہ تھا؟!

خلیل زاد: میں اس کے بارے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

ایک تو یہ کہ ہم جو اس معاہدے کی طرف گئے تو اس کا سبب یہ تھا کہ صدر اوبامہ یہ چاہتے تھے، ٹرمپ نے یہ کر دیا اور بائیڈن نے بھی اسی کو جاری رکھا کیونکہ ہم عسکری طور پر پیش قدمی نہیں کر رہے تھے۔ ہم جنگ نہیں جیت رہے تھے۔ لہٰذا سوال یہ تھا کہ ہم وہی عمل جاری رکھیں جو ہم کئی سالوں سے کر رہے تھے، یعنی عملی میدان میں زمین سے پیچھے ہٹتے رہنا، علاقوں سے شکست کھا کر نکلتے رہنا..... سوال یہ تھا کہ ہم مزید کئی سال بغیر جیتے جنگ جاری رکھیں یا پھر ہم ایک متبادل کی طرف جائیں۔

دوئم، ایک بہت بڑا سوال جو ہمیں اپنے آپ سے کرنا چاہیے کہ افغان فوج نے جنگ کیوں نہیں کی؟ کیا وہ خود اپنے نظریے پر یقین نہیں رکھتے تھے؟

صحافی: انہوں نے بیس سال جنگ کی ناں!

خلیل زاد: ......جب ہم وہاں تھے تب......تو کیا وہ محض ہماری خاطر لڑ رہے تھے یا وہ کسی مقصد کی خاطر لڑ رہے تھے؟!

طالبان تو مقصد کی خاطر لڑ رہے تھے، وہ اس پر یقین رکھتے تھے اور حکومتی فورسز یقین نہیں رکھتی تھیں؟ کیا یہ ان کی حکومت کی کرپشن کے سبب تھا؟ یا ان کا اعتماد اس حکومت پر ختم ہو گیا تھا؟ یا حکومت نے ان سے صحیح سلوک نہیں کیا؟ کیا حکومت تنخواہیں نہیں دے رہی تھی یا جن افغان فوجیوں نے اپنی جان اس جنگ میں ہاری ان کے خاندانوں کی دیکھ بھال نہیں کی جا رہی تھی؟

(پھر وہی بات دہراتا ہوں کہ) کیا یہ فوجی صرف امریکہ کے لیے لڑ رہے تھے کہ انہوں نے معاہدے کے بعد لڑائی نہیں کی؟

میرے خیال میں بہت سے اور عوامل بھی تھے جن کو دیکھا جانا چاہیے۔

صحافی: جنرل میک ماسٹر کا خیال ہے کہ آپ نے جو معاہدہ کیا وہ دراصل ایک ہتھیار ڈالنے/تسلیم ہونے کی ڈیل تھی۔

خلیل زاد: میرے دوست جنرل میک ماسٹر اور دوسروں کے لیے عرض ہے کہ اس لیے ہم نے یہ ڈیل کی کہ ہم جنگ جیت __نہیں__ رہے تھے۔ جنرل میک ماسٹر کا کیا خیال ہے کہ کب تک یہ

---

[1] صرف بارہ سال سے بڑی بچیوں کو افغانستان میں سکول جانے سے ابتداءً روکا گیا اور اس کا سبب بھی سکولوں وغیرہ کا غیر مناسب اخلاقی ماحول تھا۔ جن جن علاقوں میں امارتِ اسلامیہ یہ ماحول بہتر بنانے اور کنٹرول کرنے میں اب تک کامیاب ہو چکی ہے تو وہاں بارہ سال سے بڑی بچیوں کے سکول بھی کھولے جا چکے ہیں اور اس وقت افغانستان کے دس سے زائد صوبوں میں بڑی بچیاں بھی سکول جا رہی ہیں اور باقی صوبوں میں بھی اصلاحِ ماحول کے ساتھ یہ سکول کھول دیے جائیں گے (اس بات کا اظہار حکومتِ امارتِ اسلامیہ افغانستان کے ترجمان اور نائب وزیرِ اطلاعات و ثقافت مولوی ذبیح اللہ مجاہد صاحب نے طلوع ٹی وی کو ایک انٹرویو میں کیا، نیز بعض معلومات ہمیں افغانستان میں موجود بعض صحافتی ذرائع سے حاصل ہوئیں)۔

یہی معاملہ عورتوں کے حقوق کا بھی ہے۔ عورتوں کو ہر وہ حق حاصل ہے جو اسلام: دینِ عدل ان کو دیتا ہے۔ اس وقت افغانستان میں عورتیں تمام کاروبارِ زندگی میں شریک ہیں، گھروں میں سودا سلف لانے کے لیے بازار جانا، علاج معالجے کے لیے ہسپتال جانا، عورتیں اپنی ملازمتوں پر بھی جا رہی ہیں، بلکہ کئی بازاروں میں عورتیں دکاندار بھی موجود ہیں اور سب سے بڑھ کر افغان معاشرے میں عورتوں کو جو مال کی طرح خریدا اور بیچا جاتا تھا اور صدیوں سے بیواؤں کے نکاح کی 'افغانی' رسمیں تھیں، جنہیں عورتوں کے حقوق کا چیمپئن امریکہ اور اس کے افغانی اتحادیوں نے بھی جاری رکھا تھا، کو عالی قدر امیر المومنین شیخ ہبۃ اللہ اخندزادہ (نصرہ اللہ) کے فرمان سے کالعدم قرار دے دیا گیا ہے، یہ سب عورتوں کے حقوق نہیں تو اور کیا ہے؟

جہاں تک دس لاکھ بچوں کے غذائی قلت کا شکار ہونے کا خطرہ ہے تو اس کا براہِ راست ذمہ دار امریکہ خود ہے جس نے افغانستان کی عوام کے اربوں روپے اپنے بینکوں میں روک رکھے ہیں اور جس امریکہ نے افغانستان پر اپنے اتحادیوں کے ذریعے تجارتی و معاشی پابندیاں لگا رکھی ہیں اور بنیادی خوراکی مواد اور دوائیوں تک کی ترسیل مشکل بنا دی گئی ہے۔ (س خ)

[2] اسلام کی تعبیر بنیادی طور پر تو ایک ہی ہے، لیکن جدید دنیا کے تناظر میں سمجھیں تو دو قسم کی ہے: ایک صحابۂ کرامؓ، سلفِ صالحین، ائمہ و فقہاء و محدثینِ اسلام کی تعبیر اور دوسری امریکی برانڈڈ تعبیر۔ طالبان خود اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ ان کے ملک کا قانون و نظام فقہِ حنفی ہو گا جو عباسی و عثمانی خلفا کے زمانے میں قریباً ایک ہزار برس تک عالَمِ اسلام کا اور برِّ صغیر و افغانستان میں مغلوں اور دیگر بادشاہوں کے دور میں قریباً چھ سو برس تک قانون و نظام رہا! (س خ)

لڑائی جاری رکھنی چاہیے تھی، جب کہ ہم ہر سال علاقے کھوتے جا رہے تھے؟! آخر کیا وجہ تھی کہ ہم بیس سال مستقل یہ جنگ ہارتے رہے۔ ایسے میں حل یہ تھا کہ یا ہم ڈیل کرتے یا پھر ہم یہ جنگ جو ہم ہار رہے تھے جاری رکھتے۔

(یہ فیصلہ میں نے نہیں کیا)، مجھ سے زیادہ بڑے عہدوں پر اور مجھ سے زیادہ تنخواہ لینے والوں نے یہ فیصلہ کیا۔

صحافی: آپ کی مراد وزیرِ خارجہ مائیک پومپیو اور صدر ٹرمپ ہیں؟

خلیل زاد: جی ہاں، یہ دونوں بھی اور بعد میں بائیڈن انتظامیہ کے افراد نے بھی سوچ بچار کر کے یہ فیصلہ کیا۔ اور صورتِ حال وہی تھی جو تھی۔ بعض دفعہ لوگوں کا خیال ہوتا ہے فیصلہ سازی کا سارا اختیار میرے (خلیل زاد کے) پاس تھا اور ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ بات درست نہیں ہے۔ میں نے کئی صدور کے ساتھ کام کیا اور میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ بہت زیادہ سوچ بچار کے بعد، جو جو متبادل طریقے ہو سکتے تھے ان سب پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا۔

صحافی: اس لیے کہ امریکی عوام میں جنگ لڑنے کا ارادہ (will to fight) ختم ہو گئی تھی؟!

خلیل زاد: (اثبات میں اشارہ کر کے کہتا ہے) اور اس لیے (بھی) کہ بیس سال بعد جنگ ٹھیک سمت میں نہیں جا رہی تھی۔

صحافی: میں کچھ مخصوص سوال رکھنا چاہتی ہوں۔ کہتے ہیں کہ آپ نے جو ڈیل کی اس میں دیا بہت کچھ اور لیا بہت کم...... آپ نے کیوں پانچ ہزار قیدیوں کو چھوڑنے کا مطالبہ تسلیم کیا؟[1]

خلیل زاد: افغان حکومت کے ساتھ مذاکرات کرنے سے قبل طالبان کچھ یقین دہانیاں چاہتے تھے، Confidence Building Measures، دونوں طرف سے۔ وہ چاہتے تھے کہ دونوں طرف سے تمام قیدی رہا کر دیے جائیں، ایک اچھے شگون کے طور پر کہ وہ اب مذاکرات کے لیے بیٹھنے والے تھے۔

صحافی: آپ نے جنگ کے قابل (potential fighters) افراد کو رہا کر دیا؟

خلیل زاد: افغان حکومت کے پاس پندرہ ہزار قیدی تھے اور طالبان کے پاس ایک ہزار قیدی۔ طالبان کا مطالبہ دونوں طرف سے سب کو چھوڑ دینے کا تھے۔ اور جنگجوؤں کی کمی دونوں طرف نہیں تھی، ایک طرف تین لاکھ اور دوسری طرف ستّر ہزار سے زیادہ یا کم لڑنے والے تھے۔ اور یہ طے ہوا کہ رہا ہونے والے دونوں طرف کے قیدی جنگ میں حصہ نہیں لیں گے۔

صحافی: کیا طالبان اپنے اس قول پر قائم رہے؟

خلیل زاد: جی ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اکثر جگہوں پر ایسا ہی ہوا، طالبان کے رہا ہونے والے جنگجوؤں نے جنگ میں حصہ نہیں لیا۔ ہاں بعض واقعات ہوئے، لیکن اس کے متعلق طالبان نے کہا کہ جب ان کے جنگجو دوبارہ اپنے علاقوں میں واپس گئے تو افغان حکومت نے ان کو دوبارہ پکڑنے کی کوشش کی، تب وہ جواباً لڑے۔

صحافی: اشرف غنی اور آپ کے درمیان تلخ کلامیاں بھی ہوتی رہیں اور وہ اس ڈیل سے خوش نہ تھے جو آپ نے کی؟

خلیل زاد: جی ہاں، ایسا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک سیاسی حل نہیں چاہتے تھے، وہ سٹیٹس کو/status quo (موجودہ صورتِ حال) کو برقرار رکھنا چاہتے تھے، انہیں جو عہدے ملے ہوئے تھے وہ ان کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور جو امریکی امداد اور سپورٹ ان کو مل رہی تھی وہ اس کو جاری رکھنا چاہتے تھے، وہ 'سٹیٹس کو' کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ پھر جب ہمارے نکلنے وغیرہ کی چیزیں حتمی ہو گئیں تو انہوں نے اس سب کا اندازہ لگانے میں خطا کی، وہ سیاسی حل کے لیے سنجیدہ نہیں تھے۔

صحافی: کیا مائیک پومپیو اور ٹونی بلنکن ذمہ دار نہیں کہ انہوں نے اتنا زور نہیں ڈالا اشرف غنی پر جتنا ڈالنا چاہیے تھا؟

خلیل زاد: انہوں نے بہت کوشش کی اور دونوں نے اشرف غنی کے ساتھ بہت سا وقت گزارا لیکن وہ نہیں مانا۔ اب چونکہ آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو اب میرا خیال ہے کہ ہم نے اتنا پریشر اس پر نہیں ڈالا جتنا ڈالنا چاہیے تھا، ہم اس کے ساتھ نرم تھے، ہم سفارت کاری سے اور تحریض دلا کر اس کو قائل کرتے رہے۔ ہاں ایک دفعہ پومپیو نے کہا کہ ہم امداد میں سے ایک بلین ڈالر کی کٹوتی کریں گے تب...... جب عبد اللہ عبد اللہ اور اشرف غنی کے مسائل ہوئے...... اور آپ صورت حال ذرا دیکھیں۔

(باقی صفحہ نمبر 61 پر)

[1] یہاں یہ نکتہ نہایت قابلِ غور ہے کہ اب تک تمام امریکی عہدے دار بھی اور خلیل زاد بھی زبان سے یہی کہتے رہے ہیں کہ افغانستان میں ایک خود مختار حکومت قائم تھی اور اصولاً و قانوناً دیکھا جائے تو یہ پانچ ہزار قیدی اسی حکومت کے تحت جیلوں میں بند تھے، جبکہ ان کو رہا کرنے کی یقین دہانی امریکہ نے کروائی اور عملاً رہا بھی امریکہ نے کیا؟! (س ح)

ہو تیری خاک کے ہر ذرّے سے تعمیرِ حرم

محترمہ عامرہ احسان صاحبہ

ایک معجزہ گزشتہ صدی کے وسط میں ہوا۔ خلافت عثمانیہ کے پارہ پارہ ہو جانے کے بعد بدترین اسلام دشمن قوتوں کے پنجوں سے نکل کر یکایک حالات تخلیق پاکستان پر منتج ہوئے۔ ہندو بھارت اور مسلمانوں پر ظلم کی تاریخ اور صلیبی اسلام دشمنی کا ورثہ رکھنے والا انگریز دیکھتا رہ گیا۔ پاکستان ۲۷ رمضان المبارک کو تائید ایزدی کی روشن علامت بن کر دنیا کے نقشے پر ہلالی پرچم لیے ابھر آیا۔

خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

اسی پیرائے میں اس صدی میں افغانستان کی غیر متوقع آزادی اور لہلہاتے کلمۂ طیبہ والے پاکیزہ پرچم نے پوری دنیا کو دم بخود کر دیا۔ دونوں ممالک کی آزادی سیاسی نہیں، ایمان کے بل بوتے پر ہوئی۔ پاکستان کا ایمانی چہرہ مسخ کرنے والے سیکولر، ملحد طبقات کے نااہل پلاسٹک سرجن، تاریخ کا لکھا مٹانے سے قاصر ہیں۔ پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ کی پکار اس پر ثبت ہے۔ لاکھوں جان کی قربانی، شوبز کی دھماچوکڑی، سیاست بازی کے اکھاڑوں، الگ کرکٹ ٹیم، رئیل اسٹیٹ کے قبضہ مافیاز کے لیے نہیں دی گئی تھی۔ ہمارے والدین خالی ہاتھ خونچکاں ٹرینوں میں جان کی بازی لگا کر آئے۔ وہ اس زمین پر اس دن کے لیے سجدہ ریز نہ ہوئے تھے، جو آج گھمبیر ترین مسائل کی دلدل بنی پڑی ہے۔ کفر کی چیرہ دستی سے نکل کر آج پھر ہر طرح کے کفر کے آگے سجدہ ریز ہونے، دنیا بھر میں کشکول لیے پھرنے اور کلچرل کچرے اکٹھے کرنے کے لیے خون کی ندیاں عبور نہ کی تھیں۔ آج افغانستان ہمارے سامنے ایک ایسے ہی، بلکہ اس سے بھی بڑے معجزے کی صورت میں موجود ہے۔ وہ اپنی شناخت برقرار رکھنے اور آزادی کے مقصد کو دانتوں سے پکڑے رکھنے کا عزم لیے ہوئے ہے۔ سراج الدین حقّانی (افغان وزیر داخلہ) نے اپنے ایک ساتھی کا خواب سنایا۔

> ”انہوں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ یہ دیکھا کہ آپ کا دامنِ مبارک، خون سے بھرا ہوا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ خون کس کا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ یہ افغانستان کے شہداء کا خون ہے۔ یہ بہت ہی معزز اور مبارک خون ہے۔ یہ خون زمین پر نہ بہنے پائے۔“

جو خون پاکستان بننے کی راہ میں بہا، وہ ہم نے بڑی محنت سے رائیگاں کیا۔ مشرقی پاکستان اپنے ہاتھوں توڑ کر۔ اللہ نے پھر بھی درگزر فرما کر آدھے ادھورے پاکستان کو ایٹمی قوت بنا کھڑا کیا۔ پرویز مشرف کو یہ قوت و شوکت ایک آنکھ نہ بھائی۔ ڈاکٹر عبد القدیر خان سے معافی منگوائی، ملک بھر سے چوکوں پر لگے میزائل ہٹا کر کہیں گائے چوک بنا اور کہیں کوئی اور بت ایستادہ ہوئے۔ پاک خون کی سرخی ویلنٹائن ڈے کے ناپاک گلابوں اور غباروں میں بھر کر اخلاق گراوٹوں سے حیا کا دامن تار تار کیا۔ یہ خون گل سڑ کر سیاہ بدبودار ہو کر ہیلووین کی کالی بلائیں بن کر نور مقدم جیسے حقیقی المناک خوفناک مناظر میں ڈھلا۔ اس خون کا رنگ ہندوؤں کے مقدس پیلے رنگ کی صورت میں قومی سطح پر 'ریاستِ مدینہ' کے دعوے داروں نے دیوالی منا کر پھیلایا۔ قبول اسلام کو ناممکن بنانے کے بل (bill) اور پاک ملک کو LGBT کی غلاظت سے لتھیڑنے چل پڑے۔

یہ بے نور آنکھیں، یہ روحوں کی پستی
یہ گھر گھر میں تھیٹر، یہ عصیاں کی بستی

افغانستان اپنے اثاثوں سے محروم رہتے ہوئے بھی حکمرانی کے شاندار نمونے پیش کر رہا ہے۔ حکمران اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر عوام کو سہولت دینے، انصاف فراہم کرنے میں بے مثل ایثار سے کام لے رہے ہیں۔ عوام بہ چشم سر لوٹ مار کرتے بدعنوان پچھلے کٹھ پتلی حکمرانوں سے یہ تقابل دیکھ رہے ہیں۔ لاقانونیت جو پاکستان کے بڑے شہروں کا قرار اور امن لوٹ رہی ہے اس کا وہاں گزر نہیں۔ قانون بلا استثناء سب پر لاگو ہے۔ (افغان حکومت کی عمر تین ماہ ہے۔ اس کا موازنہ سو سال پرانی حکومتوں، نظاموں سے کیا جا رہا ہے!) قندھار میں پرانی ٹریفک پولیس بحال کر دی گئی۔ ایک صحافی نے سپاہی کا انٹرویو کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا طالبان ٹریفک قوانین کی پابندی کرتے ہیں؟ پولیس والے نے بتایا کہ کل طالبان کی چند گاڑیاں غلط سڑک پر آ گئیں، میں نے انہیں واپس ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ سب واپس ہو لیے۔ لمبا چکر کاٹ کر صحیح سڑک پر آئے۔ فتح کے نشے میں یہ سپاہ چور نہ ہوئی کیونکہ سورۃ النصر پڑھتے، سجدہ ہائے شکر آنسوؤں سے بھیگی سجدہ گاہوں نے انہیں عجز کی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ عمران خانی دھرنے میں قبل از فتح ہی پولیس کی جو شامت آئی تھی وہ ریکارڈ پر ہے۔ ابھی حالیہ تحریک لبیک دھرنے میں پولیس بندوقوں کی نوک پر رکھی گئی مگر شاہ کے ان نئے مصاحبوں (ایم کیو ایم نما) کو اف کہنے کی مجال کسے ہے! ادھر افغانستان میں ذمہ داران کا عالم یہ ہو کہ خوشی میں طالب نے فائرنگ کر دی تو امیر رو دیے۔

> ”کس بات پر فائرنگ کر رہے ہو؟ کس کو قوت دکھا رہے ہو؟ اللہ کا خوف کرو۔ اس کے سامنے سجدہ کرو۔ آہ و زاری کرو۔ اس نے ہم پر اتنا بڑا رحم کیا۔ اس قوم پر رحم کیا۔ خوشی تب ہو گی جب ہم اپنے اوپر اور عوام پر شریعت الٰہی اور

اسلامی عدل نافذ کریں گے۔ یہ وقت خالق و مخلوق کے سامنے عاجزی اختیار کرنے کا ہے۔“

چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں پر سرکاری اہلکاروں پر ذمہ داران گرفت کرتے ہیں۔ ملّا سراج الدین حقّانی نے تنبیہ کی کہ ہم بازار میں رکے ہوئے تھے تو ہم نے دیکھا کہ طالبان کی گاڑیاں تیزی کے ساتھ بازار کے درمیان سے گزر رہی تھیں۔ بازار میں موجود لوگوں کو تکلیف دی گئی۔ انہوں نے تاکید کی کہ طالبان بلاضرورت گاڑیوں میں نہ گھومیں۔ تواضع سے رہیں۔ عوام یہ محسوس نہ کریں کہ طالب نے ہم پر جابرانہ حاکمانہ حکومت مسلط کی ہے۔ غریب اور لاچار لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آنا، انہیں تکلیف دینا مجاہدین کے شایان شان نہیں۔ ہمارے ہاں شان کا نشانہ ہی غریب اور عوام الناس بنتے ہیں۔ اسلام آباد میں سی ڈی اے کے ہاتھوں روزگار طلب غریب سبزی پھل والوں کی ریڑھیاں الٹنے کے مناظر عام ہیں تجاوزات کے نام پر۔ اور حکومتی سرکاری تجاوزات؟ کسی دن تیونس کے ریڑھی بان کی ریڑھی الٹنے والا انقلاب آپ کو بھی نہ لے ڈوبے۔ امراء، رؤساء کے تجاوزات جو اعلیٰ ترین سطح سے سب سپانسر ہوتے ہیں ملاحظہ ہوں۔ لینڈ مافیہ، ۵۵ کھرب کی سرکاری اراضی پر قابض ہے۔ تین بڑے شہروں میں ۱۸۶۹ ارب کے جنگلات پر ان کا قبضہ ہے۔ سیاسی اشرافیہ (یا بدمعاشیہ) بھی مددگار رہی۔

جب طالبان آئے تو ہمارے سادہ لوح غلامی پر پلے بڑھے (دین سے فارغ) لوگ کہتے تھے کہ انہوں نے سی ایس ایس نہیں کیا حکومت کیسے چلائیں گے؟ حکومت ڈگریوں، کورس در کورس کے بل پر چلا کرتی تو اشرف غنی کے سرخاب کے پروں میں کیا کمی تھی۔ امریکہ کی ترقی یافتہ ترین لیاقت بھری فوج، رپورٹروں کے صفحے کالے کرنے والے امریکی افسران کو کابل ایئر پورٹ کی بد نظمی، افراتفری میں دنیا نے دیکھ لیا! سچائی، امانت و دیانت، نظم وضبط، اخلاص، خیر خواہی اور اللہ کے حضور جواب دہی کی تربیت آج طالبان کی قوت کا راز ہے۔ بدترین دشمن مغرب آج حیران ہو کر طالبان تلے پرسکون افغانستان کو دیکھ رہا ہے۔ باوجودیکہ ان کی بے مثال کامیابی کو تہہ و بالا کرنے والی قوتیں (اسلام کا نام لے کر بھی) کفر کے مقاصد پورے کرنے میں جتی ہوئی ہیں۔

امریکی سینیٹر مٹ رومنی، جو امریکی فوجی انخلاء کے طریقے پر شدید ناقد ہیں، مسلسل سینہ کوبی کر رہے ہیں کہ جو کچھ ہوا اس نے امریکہ پر گھڑوں پانی شرمساری کا الٹا دیا۔ زندگی میں اس سے بڑے گڑبڑ گھٹالے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ سینیٹر نے بتایا کہ وہ جب افغانستان پہلے پہل گئے تو بیوی نے (فون پر) پوچھا کہ ساڑھے دس گھنٹے کے فرق کے عادی ہونے میں وقت لگے گا۔ سینیٹر نے جواب دیا، ساڑھے دس گھنٹے نہیں، ہزار سال کا فرق اہم تر ہے جو ہمارے اور اس آبادی کے درمیان ہے۔ رومنی کا (افغانستان کی پسماندگی پر) تبصرہ، سورۃ الجمعہ اور الاعراف کی آیات یاد دلاتا ہے۔

”وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“ (الجمعہ: ۲)

اس وقت یہودی اپنی علمیت کے زعم اور قومی فخر و غرور میں عربوں کو تحقیر سے ناشائستہ، کمتر، ان پڑھ کہتے (گوئم) اور سمجھتے تھے۔ اللہ نے بتادیا لطیف طنز کے پیرائے میں کہ اللہ، بادشاہِ کائنات نے رسالت انہی میں رکھ دی۔ تزکیہ (مکمل طرز زندگی کا اجلا پن)، علمِ حقیقی اور تہذیب و تربیت کے لیے دنیا اب انہی امیوں سے رہنمائی لے گی۔ اور پھر ہوا بھی یہی! ہجرت نبوی کے ۱۰۰ سال کے اندر شرق تا غرب مسلمان چھاگئے۔ اسی خراسان پر ۲۰۷ھ میں قتیبہ بن مسلم، چین ترکستان تک فتوحات پہنچا کر امیر مقرر ہوئے۔ وہ عالم گیر سلطنت قائم ہوئی کہ مفتوح قومیں (طالبان جیسے حلم، عفو کے پیکر) مسلمانوں سے محبت رکھتی تھیں۔ انسانوں پر انسانوں کی حرص و ہوس بھری ظالمانہ جبری حکمرانی سے نکال کر اللہ کی کریم حکمرانی تلے انہیں لے آئے۔ علاج اس کا وہی اب نشاط انگیز ہے ساقی! دنیا ایک مرتبہ پھر العطش العطش پکار رہی ہے!

ہو تری خاک کے ہر ذرے سے تعمیرِ حرم
خود کو بیگانۂ اندازِ کلیسائی کر

[یہ مضمون پہلے ایک معاصر اردو روزنامے میں شائع ہو چکا ہے۔ (ادارہ)]

☆☆☆☆☆

مسلمان عوام کی حرمت

”مسلمان عوام کے فسق و فجور، کمی و تقصیر یا جہاد کی نصرت سے پیچھے بیٹھ جانے کے باعث اگر کوئی جان بوجھ کر اُن پر قتل کا حکم لگاتا ہے اور اس زعم میں ہے کہ ان کے خون کے بارے میں اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی تو وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہے اور علم و فقہ کی حدود سے خارج ہے۔ ایسا شخص حرام کا مرتکب ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ناراضی، غضب اور پکڑ کو دعوت دے رہا ہے۔ وہ اس بات کا حق دار ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کو ناکام کر کے دشمن کو اس پر مسلط فرمادے۔“

(شیخ عطیۃ اللہ اللیبی شہید رحمۃ اللہ علیہ)

سانحۂ آرمی پبلک سکول

معین الدین شامی

ربّ اشرح لي صدربي. ويسّر لي أمري. واحلل عقدة من لساني. يفقهوا قولي.

۱۶ دسمبر پاکستان کی تاریخ میں ایک اندوہناک دن ہے۔ آج سے پچاس برس قبل ۱۹۷۱ء میں، لا الٰہ الا اللہ کی خاطر بننے والا ملکِ پاکستان، ایک طرف امریکی مفادات کے چاکر حکمرانوں اور جرنیلوں کے دین وملت مخالف غلط فیصلوں اور دوسری طرف بھارت نواز و بھارت غلام سیاست دانوں کی سازشوں کے ذریعے دولخت کیا گیا۔

اس دن کی تلخی پہلے ہی بہت تھی کہ سنہ ۲۰۱۴ء میں اسی تاریخ کو پاکستان میں ایک اور سانحہ پیش آیا۔ یہ سانحہ پشاور میں آرمی پبلک سکول کے بچوں کے قتلِ ناحق کا فعل تھا۔ آرمی پبلک سکول میں رونما ہونے والا یہ سانحہ ہمارے خطّے میں جہاد کی تاریخ میں منفی معنوں میں ایک سنگِ میل تھا۔ تمام اہلِ ایمان ایسے ناحق فعل کی مذمت کرتے رہے اور کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سانحہ کسی قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے دریدہ لاشے، معصوم بچوں کے کٹے پھٹے جسم کے مناظر دیکھنا کچھ آسان نہ تھا اور ہمیں تو پہلے پہل یہ خبر صوتی ذرائع (ریڈیو) سے پہنچی اور مناظر دیکھے بنا ہی ہمارا حال بہت خراب تھا۔ [1]

سانحۂ آرمی پبلک سکول ایک المیہ تھا، لیکن پاکستان میں نفاذِ اسلام کے لیے کوشاں لوگوں (جن میں مجاہدین اولین صفوں میں شامل ہیں) کے لیے اس المیے سے بڑا المیہ یہ تھا کہ یہ ناحق فعل دین کے نام لیواؤں اور اہلِ جہاد کے ہاتھوں سے سرزد ہوا تھا۔

یہی دو المیے کم نہ تھے کہ اسی نوعیت کے بعض اور ناحق افعال ہمیں تاریخ جہادِ پاکستان میں دیکھنے کو ملے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ایک خطا (جو کہ نہایت سنگین تھی) کے بعد جو جو اس میں شریک تھا وہ ٹھہر تا، ٹھہر کر اپنے اس فعل پر نظر کرتا، جائزہ لیتا، اہلِ دین و دانش جن سے خصوصاً جاکر پوچھنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ وہ پہلے ہی اس پر بات کر رہے تھے [2] کی بات سنی جاتی، اپنے فعل پر نادم ہوا جاتا، اس سے رجوع کرتے، اللہ کے سامنے توبہ کرتے اور جن عبادُ اللہ کا حق پامال کیا تھا ان سے معافی مانگتے، شرعی دیت ادا کرتے یا مال میسر آنے پر اس کو ادا کرنے کا عہد کرتے اور آئندہ کبھی ایسے فعل کو عمداً کرنے سے ہمیشہ کے لیے رک جاتے۔ لیکن ایک اور المیہ ہماری قسمت میں لکھا تھا۔ حسبِ قولِ شاعر:

حادثے سے بڑا سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں، حادثہ دیکھ کر

اس واقعے کے ٹھیک ایک سال بعد (دسمبر ۲۰۱۵ء میں) مردان میں شناختی کارڈ بنوانے کے مرکز میں یہی فعل دہرایا گیا، پھر اس واقعے کے تقریباً مزید ایک سال بعد (جنوری ۲۰۱۶ء میں) باچا خان یونیورسٹی چارسدہ میں پھر اسی فعل کی تکرار ہوئی۔ یہ ناحق فعل اب محض خطاءً ہونے والا کوئی عمل نہ رہا تھا بلکہ یہ جرم تھا۔ اس المیوں کی داستان میں ایک اور المیہ یہ رونما ہوا کہ باچا خان یونیورسٹی میں ہونے والے قتلِ ناحق کے جرم کے بعد اس ساری کارروائی کی ترتیب و اجازت دینے والوں کی ایک ویڈیو منظرِ عام پر آئی جس میں انہیں یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ 'یہ یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے وہ مراکز ہیں جس سے پاکستانی طاغوتی نظام کے لیے افراد مہیا کیے جاتے ہیں، یہی طالبِ علم مزید بڑے ہو کر بیوروکریٹ، وکیل وجج اور سیاست دان بنتے ہیں' اور ان سب واقعات پر نہایت افسوس کے ساتھ بعض لوگوں نے 'خضرِ دوراں' ہونے کا دعویٰ کیا اور حضرتِ خضرؑ نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سفر میں جس بچے کو 'اللہ کی جانب سے علم' کے سبب قتل کیا تھا، کو دلیل بنایا۔

اس واقعے پر مذمت و تنقید سے کوئی یہ تاثر نہ لے کہ ہم یہاں گروہِ مخالف کی تائید کر رہے ہیں۔ بلکہ آج بھی جس وقت ہم ان واقعات کی مذمت کر رہے ہیں اور شریعت کی روشنی میں علمائے حق سے پوچھ کر جب ان افعال کو ناحق کہہ رہے ہیں تو اس وقت بھی مجاہدین کا جو گروہ اس فعل میں شامل تھا، ان مجاہدین کے مقاصد "جہاد برائے اعلائے کلمۃ اللہ، محنت و کوشش برائے نفاذِ شریعتِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مظلوم امت کو کفر اور کفری نظاموں کی غلامی سے نکالنا وغیرہ" میں ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں، ایک مومن مجاہد کے دعوت و جہاد کے یہی اہداف و مقاصدِ عالیہ ہوا کرتے ہیں۔ کوئی کیسے ان لوگوں کی تائید کر سکتا ہے یا کیسے کسی کے دل میں ان لوگوں کے لیے نرمی پیدا ہو سکتی ہے جنھوں نے دشمن کے مفادات کی خاطر اپنے ذاتی مفادات کو پروان چڑھایا، وہ جرنیل اور انٹیلی جنس اداروں کے امریکی نمک خوار افسر جنھوں نے امریکی وار آن ٹیرر کا حصہ بن کر قبائل کو خون میں نہلایا، اہلِ سوات کے گھر اجاڑے اور انہیں یتیمی و بیوگی کے داغ دیے، جنھوں نے نامعلوم کتنے ہزار افراد کو لاپتہ افراد میں بدل دیا

---

[1] ممکن ہے کہ بعض حضرات یہاں ہماری بات کے مقابل امریکی اتحادیوں کے جرائم گنوائیں۔ ہمیں بھی یہ بات قبول ہے بلکہ ہم تو اپنی صبح و شام کی دعوت میں ان ظالموں کے خلاف زبان و قلم اور بجا محل پر گولی بھی استعمال کرنے کے قائل ہیں اور جانتے ہیں کہ امریکہ اور اس کے وردی و بے وردی اتحادیوں کے جرائم اے پی ایس واقعے سے کہیں بڑے ہیں، لیکن یہ ظالم ابھی ہمارا موضوع نہیں ہیں، ہمارا موضوع و مخاطب تو اہلِ جہاد سے منسوب افعال اور لوگ ہیں۔ ظلم کے جواب میں بھی ہمارے لیے روا نہیں کہ ہم ظلم کریں یا حد سے بڑھیں۔ انگریزی زبان کی مثل مشہور ہے کہ 'Two wrongs don't make a right!'۔

[2] مثلاً امارتِ اسلامیہ کے علما قائدین جنھوں نے اس فعل کی مذمت کی اور اسی طرح ہمارے خِطّے کی دیگر جہادی و غیر جہادی صالح دینی جماعتوں، تنظیموں اور علمائے کرام نے اس بابت لکھا اور بولا۔

اور ان میں کتنوں کو جعلی مقابلوں میں 'مار' کر ڈیموں کے گیٹوں اور بیراجوں کی گراریوں میں ڈال دیا اور جنہوں نے جامعہ حفصہ کی عفیفات کی ناموس تار تار کی اور لال مسجد کو لہو سے لال کیا!!

میں شاید اس موضوع پر کچھ نہ لکھتا لیکن حال میں گزارنے والی ۱۶ دسمبر (۲۰۲۱ء) کی شام سوشل میڈیا پر جہاد و مجاہدین کی تائید کرنے کے حوالے سے معروف بعض احباب کے تبصروں نے مجھے یہ چند سطریں لکھنے پر مجبور کر دیا۔ ہمارے یہاں کم از کم دو قسم کے رویے ایسے قتلِ ناحق کے واقعات پر پروان چڑھے ہیں، مبنی بر عدل رویے کے علاوہ۔ اور علمائے کرام کے بیان کردہ مبنی بر عدل و شریعت رویے پر ہم اپنی اسی مختصر تحریر کے آخر میں بات کرتے ہیں۔

ایک رویہ تو وہی ہے جس کی ہم نے پہلے بات کی اور وہ ہے اپنے ناحق افعال پر اصرار، ایسے ہی واقعات کو دہراتے رہنا، اپنی صفوں کا تصفیہ کیے بغیر اپنے عملِ 'جہاد' کو جاری رکھنا اور ان افعال کا بے جا دفاع کہ یہ برحق تھے۔ یہ ایسی بھول بھلیاں ہیں جن میں ساری زندگی بھٹکنے کے باوجود منزل کی بھنک بھی نہیں پڑ سکتی۔ یہ ناحق قتل پر اصرار اور ایسے ناحق افعال کے مرتکب افراد کو اپنی صفوں میں بغیر تادیب و اصلاح کے شامل رکھنے کا راستہ خدانخواستہ اس ذاتِ باری تعالیٰ کی ناراضی کا راستہ ہو سکتا ہے۔

دوسرا رویہ ہے اپنے اعلانیہ گناہوں کو بنا معافی مانگے چھپانے کا رویہ۔ اپنے یا اپنے دوستوں، ساتھیوں یا اپنے جہاد سے وابستہ لوگوں کے ہاتھوں سرزد ہونے والے ناحق افعال کے لیے ناحق عذر تراشنے کا رویہ۔ یہ رویہ اور یہ کہنا کہ آرمی پبلک سکول میں بچوں کو مجاہدین نے قتل نہیں کیا بلکہ فوج نے ان کو مارا تا کہ مجاہدین کو بدنام کیا جا سکے، وغیرہ وغیرہ۔ ابھی 'مونچھوں والے اور غیر مونچھوں والے' بچوں کی عبث بحث میں نہیں پڑتے (اور اس دلیل کے غلط ہونے پر علمائے حق بہت کچھ بیان کر چکے ہیں)، صرف ان نابالغوں اور ان معصوموں ہی کی بات کرتے ہیں جن کے بارے میں 'ہم' کہہ رہے ہیں کہ انہیں فوج نے قتل کیا۔ اگر فوج نے قتل کیا بھی تو اس قتل کا موقع فوج کو کس نے فراہم کیا؟ پھر ہمارے یہ احباب کیوں اس فعلِ ناحق کے لیے ایسے عذر تراش رہے ہیں جس کے بارے میں حملہ آور گروہ نے خود ذمہ داری قبول کی اور آج تک اپنے رویے کی بنا پر اس کارروائی کو 'برحق' گردانتے ہیں اور اس کارروائی کے ذمہ دار کو 'بطلِ امت' قرار دیتے ہیں؟!

اسی رویے کے ساتھ ملحق اور سانحۂ اے پی ایس کے ذکر کے ساتھ جس چیز نے ہمیں سخت دکھ پہنچایا وہ یہ تھی کہ سوات میں پاکستان فوج نے جن بچوں کو قطار میں کھڑا کر کے کلمۂ طیبہ ان کی زبانوں سے سن کر گولیوں سے بھونا تھا اس ویڈیو کو سوشل میڈیا پر بعض احباب نے شیئر کیا اور اس کے ساتھ پوری پاکستانی قوم کو ایسے واقعاتِ ظلم میں فوج کا ساتھی محض اس بنا پر قرار دیا کہ ان کا خون فوج کے بنائے گئے گانوں کو سن کر جوش مارتا ہے (بڑا دشمن بنا پھرتا ہے اور مجھے دشمن کے بچوں کو پڑھانا ہے، وغیرہ)۔

......اور پھر اسی قسم کے مزید تبصرے، عوام کو امریکی اتحادیوں کی صف میں کھڑا کرنے کی باتیں، عوام کے باطل افکار پر قائم ہونے کی باتیں اور پھر اپنے افعال کو ثابت کرنے کے لیے عبث دلیلیں اور سازشی نظریات(conspiracy theories)......

انّا للہ وانّا الیہ راجعون! کیا محض فوج کے بنائے گانوں اور ترانوں پر جس عوام کا خون جوش مارے وہ اس فوج کے ظلم میں شریک ہو گئی جس نے ان بچوں کو قتل کیا؟ اور جب یہ عوام اس ظلم میں شریک ہوئے تو گویا مجرم و ظالم ہوئے اور پھر اسی عوام کے بچوں کو گویا اے پی ایس اور باچا خان یونیورسٹی میں قتل کرنا جائز ٹھہرا؟ عوام مجرم ہیں سو عوامی مقامات گلشنِ اقبال پارک لاہور سے نادرا آفس مردان تک سبھی قتلِ عام جائز و روا ہے؟

یہ فہم درست نہیں ہے، قتال اور وہ بھی قتال فی سبیل اللہ اور پھر اس جہاد و قتال کی دعوت ایسا معاملہ نہیں جسے ہم محض ریاضی کے کسی فارمولے اور کہیں محض عقلی نما دلیل یا جذبات سے سمجھیں اور اس کے بعد اس کا بیان اپنی زبان و قلم اور تلوار و کلاشن کوف سے کریں! کفارِ اصلی پر بھی 'عام تباہی' مسلط کرنے کے آداب شریعتِ مطہرہ نے بیان کیے ہیں اور ہمارا امید ان تو مسلمانوں کا ایک ملک و معاشرہ ہے جس کے عوام لا الٰہ الا اللہ کے متوالے ہیں اور ناموسِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت کے مظاہرے صبح و شام جہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مبنی بر عدل و شریعت رویہ جس کو علمائے حق خصوصاً علمائے جہاد نے بیان کیا ہے اور جو سیرتِ رسولِ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یہی ہے کہ اعلانیہ خطاؤں سے اعلانیہ توبہ و برأت کا اظہار کیا جائے اور ان کو دہرایا نہ جائے اور ان کے لیے عذرِ لنگ نہ تلاشے و تراشے جائیں۔ اور یہ رویہ محض جہاد کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ تو دینِ مبین کا آفاقی اصول ہے اور جہاں جہاد و قتال میں ایسی کوئی خطا سرزد ہو جائے تو علمائے ربّانیین نے شارع علیہ الصلاۃ والتسلیم کا وہ فرمان بطورِ نمونۂ عمل بیان کیا جو صحیح بخاری میں منقول ہے کہ جب جلیل القدر صحابی، فاتحِ تختِ قیصر و کسریٰ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، جنہیں خود رسولِ مبارک صلی اللہ علیہ وسلم نے 'سیف من سیوف اللہ'، اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار کا خطابِ عالی عطا فرمایا، جب ان سے لوگوں کا خطاءً قتل ہو جاتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دو مرتبہ فرماتے ہیں:

''اللهم إني أبرأ إليك مما صنع خالد!''

''اے اللہ! خالد نے جو کیا میں اس سے تیرے سامنے برأت کا اعلان کرتا ہوں!''

(باقی صفحہ نمبر 104 پر)

اخباری کالموں پر ایک نظر

شاہین صدیقی

پچھلے عرصے میں ہندوستان کے اندر بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے جس کو مد نظر رکھتے ہوئے اس بار ہم ہندوستانی اخبارات میں مسلمانوں کے حوالے سے زیر بحث اہم موضوعات کا احاطہ کریں گے۔

مسئلہ ایک کتاب کا

ایک اہم موضوع سابق وزیر خارجہ اور کانگریس کے سینئر رہنما سلمان خورشید کی منظر عام پر آنے والی کتاب ''Sunrise in Ayodhya: Nationhood in our times'' پر پورے ہندوستان میں گرما گرم بحث ہے۔

ایودھیا تنازعہ جس کے نتیجے میں ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء میں ہندو انتہا پسندوں نے بابری مسجد شہید کی پھر مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرف سے یہ معاملہ عدالت میں زیر سماعت رہا۔ جس کا فیصلہ ۲۰۱۹ء میں سپریم کورٹ نے یہ دیا کہ بابری مسجد کی جگہ پر سرکار رام مندر تعمیر کرے اور مسلمانوں کو کسی اور جگہ پانچ ایکڑ زمین مسجد کی تعمیر کے لیے فراہم کرے۔

سلمان خورشید نے، جو خود سیکولر نظریے کا حامل ہے، اپنی کتاب لکھنے کا مقصد واضح کیا کہ 'ایودھیا فیصلے پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مذہبی رواداری کا فروغ' ہے۔ لیکن تنازع کا باعث پوری کتاب میں موجود صرف ایک جملہ بنا جس میں سلمان خورشید نے ہندُتوا نظریے کو داعش اور بوکوحرام سے تشبیہ دی۔ یہ معاملہ ہندوستانی میڈیا میں اس قدر زیر بحث رہا کہ بلوائیوں نے اس کے گھر کو نذر آتش کر دیا۔

ملاحظہ ہو اس حوالے سے سلمان خورشید کے انگریزی روزنامہ The Indian Express میں چھپے کالم سے اقتباس (کا اردو ترجمہ):

No one burnt my cottage | Salman Khurshid | The Indian Express

''کتاب کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کا فروغ اور ایودھیا تنازع کے فیصلے کی روشنی میں ناپسندیدہ ماضی کو بھلا کر مشترکہ مستقبل کی طرف دیکھنا ہے۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ ملکی میڈیا اور حکومتی جماعت کی طرف سے بہت کم توجہ ملی، بلکہ وہ چوتھے باب میں موجود ایک جملے میں پھنس گئے جو ہندوازم اور ہندُتوا میں فرق کر رہا ہے:

'سَنَتَن دھرم[1] اور روایتی ہندومت جو کہ سَنتوں (saints) اور باباؤں کی تپسیا سے عبارت ہے۔ اسے ہندتوا کے طاقتور نظریہ نے پرے دھکیل دیا۔ جو ہر اعتبار سے موجودہ دور کی داعش اور بوکوحرام جیسی اسلامی جہادی تنظیموں سے ملتا جلتا ہے۔'

......میری شنکر اچاریہ کی تعظیم، سَنَتَن دھرم کی ستائش، ایودھیا تنازع پر فیصلے کی تائید، (ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان) تصفیہ کی درخواست اور اس بات کی تکرار کے 'رام' کی حیثیت 'امامِ ہند' کی ہے، کوئی معنی نہیں رکھتی یہاں تک کہ میں ایک عظیم مذہب کے سیاسی استحصال کی توثیق نہ کر دوں اور اس کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کر دوں۔''

سلمان خورشید کی اس کتاب پر اردو اخبارات کے بہت سے لکھاریوں نے بھی قلم اٹھایا ہے۔

معصوم مراد آبادی روزنامہ اعتماد میں سلمان خورشید کی اس کتاب اور ہندُتوا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ہندُتوا کا موازنہ بوکوحرام سے کیوں؟ | معصوم مراد آبادی | روزنامہ اعتماد

''سلمان خورشید کی کتاب منظر عام پر آنے کے بعد سب سے زیادہ بے چینی ان حلقوں میں پھیلی ہے جو ہندُتوا کو ہی اس ملک کی نجات کا راستہ تصور کرتے ہیں۔

......جہاں تک ملک میں ہندُتوا بریگیڈ کی سرگرمیوں کا تعلق ہے تو پورا ملک اس بات سے واقف ہے کہ کس طرح اس ملک میں اقلیتوں کا جینا حرام کر دیا گیا ہے۔ جب سے بی جے پی مکمل اکثریت کے ساتھ اقتدار میں آئی ہے تب سے مسلمانوں کی لنچنگ کے واقعات مسلسل ہو رہے ہیں۔ انہیں کبھی 'لوّ جہاد'، کبھی 'لینڈ جہاد' اور کبھی جبری تبدیلیٔ مذہب کے نام پر مسلسل نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اقلیتوں میں خوف و دہشت کا ماحول ہے اور جو لوگ اس کے خلاف لب

---

[1] سَنَتَن دھرم کا لغوی مطلب ہے 'ابدی مذہب'۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہندومت دنیا کا پہلا اور قدیم ترین مذہب ہے جو کہ ہمیشہ سے موجود ہے۔

کشائی کر رہے ہیں انہیں دہشت گردی مخالف قانون سے ڈرانے دھمکانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ سلمان خورشید ان کوششوں کا تازہ شکار ہیں۔"

ایک اور قلمکار ندیم عبد القدیر سلمان خورشید کے موقف پر تنقید کرتے ہوئے روزنامہ اردو ٹائمز میں لکھتے ہیں:

کیا سلمان خورشید مسلمانوں کی ہمدردی کے حقدار ہیں؟ | ندیم عبد القدیر | روزنامہ اردو ٹائمز

"سلمان خورشید کی کتاب ہندُتوا اور ہندوازم کے فرق کے لیے نہیں لکھی گئی تھی۔ البتہ یہ بات سچ ہے کہ ایک جگہ پر انہوں نے ہندُتوا اور ہندوازم کو الگ الگ کر کے ضرور بتایا ہے۔ اگر اس بات کو مان لیا جائے کہ سلمان خورشید ہندُتوا اور ہندوازم میں فرق سمجھتے ہیں تو انہوں نے پوری کتاب میں آخر تک یہ کیوں نہیں بتایا کہ ۶ دسمبر کو بابری مسجد کو شہید کرنے کا کام ہندوازم تھا یا ہندُتوا؟ اور بابری مسجد کی جگہ پر ہندو بھگوان رام مندر تعمیر کرنا ہندوازم ہے یا ہندُتوا؟"

روزنامہ اردو ٹائمز نے اپنے اداریہ میں کتاب پر ہنگامہ کی اصل وجہ سیکولر کانگرسی لیڈر غلام نبی آزاد کو بتایا:

ہندُتوا اور ہندوازم | اداریہ | اردو ٹائمز

"ایسے درجنوں دانشور ہیں جو ہندُتوا کو دہشت گرد تنظیموں جیسا بتا چکے ہیں، لیکن ہنگامہ سلمان خورشید کی کتاب پر ہی ہے۔ یہ ہنگامہ شروع نہیں ہوتا اگر غلام نبی آزاد اس کتاب پر تنقید نہیں کرتے۔ ان کی تنقید سے ہی اس ہنگامہ کو زندگی ملی۔ غلام نبی آزاد کی شخصیت بھی عجیب ہے۔ ملک میں اسلام کے خلاف اتنا کچھ کہا جاتا ہے، لیکن غلام نبی آزاد کو کبھی برا نہیں لگا۔ ملک میں مذہبِ اسلام کو تشدد سے جوڑا گیا اور ہندُتوا کے نام پر مسلمانوں کی جانوں سے کھیلا گیا۔ اس پر کبھی ایسی شخصیتوں نے زبان نہیں کھولی۔ لیکن جیسے ہی ہندُتوا کے بارے میں سلمان خورشید نے لکھا، غلام نبی آزاد آگ بگولہ ہو گئے۔ ایک مسلمان ہونے کے ناطے جو ہمدردی اور غیرت اسلام کے تئیں ہونا چاہیے تھی وہ جذبہ غلام نبی آزاد کا ہندُتوا نظریے کے تئیں ہے۔"

ہندُتوا کی پرچارک آر ایس ایس، بی جے پی اور سنگھ پریوار کی دیگر تنظیموں کے غنڈوں کا ہندوستان کے مسلمانوں پر ظلم روزِ روشن کی طرح عیاں ہے لیکن حیرت ہوتی ہے ان ہندو لکھاریوں کے اس پروپیگنڈہ پر کہ ہندوستان میں سب سے مظلوم قوم بھی ہندوؤں کو ہی ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔

ٹائمز آف انڈیا میں ہندو صحافی اشالی ورمہ کے کالم سے یہ اقتباس (اردو ترجمہ کے ساتھ) ملاحظہ ہو:

Salman Khurshid's insane analogy | Ashali Varma | The Times of India

"سلمان خورشید کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ انڈیا نے اسے سب کچھ دیا لیکن پھر بھی وہ ہماری تہذیب و مذہب کی تحقیر کر رہا ہے۔ حالانکہ وہ کانگرس پارٹی میں ایک وزیر تھا لیکن اس نے دہلی فسادات کے دوران ہندوؤں اور سکھوں کے قتل اور لنچنگ کے خلاف کچھ نہ کیا۔ بلاشبہ وہ یک طرفہ ذہنیت کا حامل ہے۔ میں اُس کے سامنے ثابت کر سکتی ہوں کہ پچھلی آٹھ صدیوں میں عظیم ترین نسل کشی جو کی گئی وہ داعش ہی کے ڈھنگ میں اسلامیوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کی کی ہے۔"

مسلم کش فسادات

پچھلے عرصے میں بنگلہ دیش سے ملحقہ ریاست تری پورہ میں مسلم کش فسادات شروع ہوئے اور ہندو بلوائیوں نے مسلمانوں کی املاک اور مساجد کو نشانہ بنایا۔

ویسے تو مسلم کش فسادات اب معمول ہی بن چکا ہے، اور جب مسلمانوں کا معاملہ آتا ہے تو حقوقِ انسانی کا راگ الاپنے والوں کی بھی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔ زیادہ تر ہندو لکھاری تو حقیقت کا مکمل انکار کرتے ہوئے خود ہی مظلومیت کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔ اس حوالے سے اردو اخبارات سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

تری پورہ فسادات؛ الٹا چور! | ڈاکٹر عابد الرحمن | روزنامہ اردو ٹائمز

"جب مسئلہ مسلمانوں کا آجاتا ہے تو سارے انصاف پسند خاموش ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے تئیں پورے ملک کا ضمیر منافق ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی کچھ نہیں بولتا سوائے چند گنے چنے لوگوں کے۔ مسلمانوں کے تئیں پورے ملک کے دل و دماغ میں نفرت اتنی سختی سے بیٹھ گئی ہے کہ مسلمانوں کے حق میں بولنے والے غیر مسلم بھی الگ تھلگ کر دیے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے حق میں بولنے والوں کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی کچھ بولنے کی ہمت کرتا ہے تو پھر اس کے خلاف قانون کا ایسا استعمال کیا جاتا ہے جس طرح تری پورہ میں کیا گیا۔"

تری پورہ میں نہ صرف مسلمانوں کے گھروں، املاک اور مساجد کی توڑ پھوڑ کی گئی بلکہ مسلم خواتین کے ساتھ بھی بدسلوکی کی گئی۔

جب دو ہندو خواتین صحافی سمردھی سکونیا اور سورنا جھانے وہاں مساجد پر حملے اور قرآن پاک کی بے حرمتی کی حقیقت پر رپورٹنگ کی تو انہیں دشمنی اور نفرت پیدا کرنے اور جعلی رپورٹنگ کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ ان فسادات کے حوالے سے ندیم عبد القدیر روزنامہ اردو ٹائمز میں لکھتے ہیں:

الجھن، گھٹن، ہراس، تپش، کرب، انتشار | ندیم عبد القدیر | روزنامہ اردو ٹائمز

”تری پورہ سے لے کر اتر پردیش تک اور اتر پردیش سے لے کر ہریانہ تک ایک ہی معاملہ الگ الگ عنوان سے جاری ہے، اور ہر جگہ مسلم نفرت کا راج ہے۔ تری پورہ میں تو حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہو گئے ہیں کہ پولیس اور شر پسندوں میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا ہے کہ مسجدوں کو نذرِ آتش کرنے اور مسلمانوں پر حملے کرنے والے فسادی زیادہ بڑے مخالف ہیں یا پھر وردی میں ملبوس پولیس؟ پولیس کا کام مظلوموں کو تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے، لیکن تری پورہ پولیس مظلوموں کی بجائے ظالموں کو تحفظ فراہم کر رہی ہے، اور اس میں پولیس نے تمام حدوں کو بھی پار کر دیا ہے۔ تری پورہ پولیس نے اس ریاست کو پولیس اسٹیٹ میں بدل کر رکھ دیا ہے، جہاں لا قانونیت ہی قانون ہے۔ جہاں قانون کا چابک لے کر پولیس انصاف پسندوں کو ہی ہانکنا چاہتی ہے۔

...... مسلم نفرت کی یہی سوچ گڑ گاؤں میں بھی اپنے عروج پر ہے۔ یہاں کے شدت پسند ہندوؤں کے لیے مسلمانوں کو جمعہ کی نماز سے روکنا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جمعہ کی نماز مع خطبہ بھی بمشکل آدھے گھنٹے کا اجتماع ہوتا ہے، لاوڈ اسپیکر استعمال نہ کرنے کی صورت میں تو اس میں تھوڑا بہت بھی شور نہیں ہوتا۔ گڑ گاؤں میں جن علاقوں میں نماز کے خلاف شدت پسند ہندو نفرت میں پاگل ہو رہے ہیں، وہاں نماز میں لاوڈ اسپیکر کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ جن لوگوں کو اس سے پریشانی ہے ان کی بلڈنگ تک تو تکبیر کی آواز بھی نہیں پہنچتی۔“

خود وزیر داخلہ امِت شا نمازِ جمعہ کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ گڑ گاؤں ریاست ہریانہ کا اہم صنعتی شہر ہے۔ جہاں نمازِ جمعہ کے موقع پر ہندو انتہا پسندوں کی جانب سے رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ کبھی میدان میں گوبر ڈال کر، کبھی ڈھول بجا کر، اور کبھی دھمکا کر نمازِ جمعہ سے روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اس حوالے سے معصوم مراد آبادی روزنامہ اعتماد میں لکھتے ہیں:

گڑ گاؤں میں نمازِ جمعہ کے دوران شر انگیزی | معصوم مراد آبادی | روزنامہ اعتماد

”انتظامیہ نے جن عوامی مقامات کو نمازِ جمعہ کے لیے نشان زد کر رکھا ہے، وہاں شر پسند عناصر ہر جمعہ کو رخنہ ڈالتے ہیں اور نماز رکوانے کی کوشش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انتظامیہ نے ان کے دباؤ میں پہلے جن ۱۲۵ مقامات کو نماز جمعہ کے لیے نشان زد کیا تھا، اب ان کی تعداد گھٹا کر ۲۹ کر دی گئی ہے۔ گزشتہ جمعہ بھی ۵ نومبر کو سیکٹر ۱۲ میں نماز رکوا کر وہاں گوردھن پوجا کی گئی اور اس میں دہلی میں اشتعال پھیلانے کے لیے بدنام بی جے پی لیڈر کپل مشرا نے بھی شرکت کی۔ انہوں نے کہا، ”گڑ گاؤں میں نماز کی مخالفت نے پورے ملک میں ایک ٹرینڈ بنایا ہے اور پورا ملک اس میں متاثر ہے“۔ اس موقع پر وشوا ہندو پریشاد کے سیکریٹری سریندر جین نے کہا، ”جو کھلے میں نماز پڑھنا چاہتے ہیں وہ پاکستان چلے جائیں۔ گڑ گاؤں ہی نہیں پورے ملک میں کہیں کھلے میں نماز نہیں پڑھنے دی جائے گی۔“

لیکن ہندو لکھاریوں کے ہاں تو ایسے لگتا ہے جیسے الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف اتنے فسادات ہونے کے باوجود ہندو لکھاری مستقل مسلمانوں کی بجائے ہندوؤں کی مظلومیت کا رونا رو رہے ہیں اور جو کچھ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے اسے اس طرح ظاہر کر رہے ہیں جیسے یہ سب اصل میں ہندوؤں کے ساتھ ہو رہا ہے۔

کانگرس رہنما راہُل گاندھی کی ایک ٹویٹ نے بھی ہندُتوا کے حامیوں پر جلتی پر تیل کا کام کیا۔ راہُل گاندھی نے اپنے ایک ٹویٹ میں کہا:

”ہندُتوا مسلمانوں اور سکھوں کا قاتل ہے۔“

ٹائمز آف انڈیا میں ایک صحافی راہُل شوشنکر اپنے کالم میں ایک آر ایس ایس کے حامی ۲۷ سالہ سنجیت کا ذکر کرتے ہوئے، جسے کیرالہ میں مبینہ طور پر لنچنگ کے ایک واقع میں قتل کر دیا گیا، لکھتا ہے (اردو ترجمہ پیش ہے):

"Hindutva kills Sikhs & Muslims" says Rahul Gandhi, but can he tell what killed Sanjith | Rahul Shivshankar | The Times of India

”وہ ہندو جنہیں ہندُتوا تنظیموں آر ایس ایس اور بی جے پی میں خدمات انجام دینے والا سمجھا جاتا ہے، دشمنوں کی جانب سے ان کی باقاعدگی سے لنچنگ کی جا رہی ہے۔

...... سوال یہ ہے کہ اگر، جیسا کہ راہُل گاندھی اور اس کا گروہ دعویٰ کر رہا ہے، کہ ہندُتوا مسلمانوں اور سکھوں کی قاتل ہے، تو وہ کون سا نظریہ ہے جو سنجیت جیسے ہندُتوا کے سرگرم کارکنوں کے قتل کا موجب ہے؟“

ایک اور ہندو لکھاری سروج چڈھا ٹائمز آف انڈیا میں ہندوؤں کی مظلومیت کا رونا روتے ہوئے لکھتا ہے (اردو ترجمہ پیش ہے):

Why does Hinduism find itself in a quandary in the country of origin? | Saroj Chadha | The Times of India

"ہندومت دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے کیونکہ ایسا مانا جاتا ہے کہ یہ لگ بھگ ۷۰۰۰ قبل مسیح میں وجود میں آیا۔

......۹۰۰۰ سال سے زیادہ قدیم اس مذہب نے خود کو وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء پذیر کیا ہے تاکہ اپنے دور کے ساتھ اس کی مطابقت رہے، یہ آزاد فکر کی حمایت کرتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو اپنے عقائد پر عمل کرنے کے مختلف طریقے فراہم کرتا ہے۔ کسی ایک خدا کی پیروی کی ضرورت نہیں۔ کوئی ایک کتاب نہیں کہ جو حکم دے کہ کیا کرسکتے ہو اور کیا نہیں کرسکتے۔ یہ دوسرے مذاہب کی تحقیر نہیں کرتا بلکہ رواداری کو فروغ دیتا ہے۔ اس حوالے سے کوئی بھی اور مذہب ہندومت کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔

......پھر ایسا کیوں ہے کہ آج ہمارے ملک میں خود کو مسلمان، عیسائی، بدھ یا سکھ کہلوانا بالکل ٹھیک ہے، لیکن اگر ہندو ہونے کا دعویٰ کیا جائے تو بہت سے سوالات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں بشمول فرقہ پرستی کے الزام کے۔ ایسا کیوں ہے کہ آزاد ہندوستان میں، ہندومت کو اس کا جائز حق نہیں دیا جارہا جبکہ اس ملک کی ۸۳ فیصد سے زیادہ آبادی ہندو ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ ہندوستان میں سیکولرازم کا مطلب ہے کہ تمام اقلیتی مذاہب کو کھلی چھٹی دے دی جائے اور ساری پابندیاں ہندومت پر لگادی جائیں؟

......اب وقت آگیا ہے کہ ہم اٹھ کھڑے ہوں اور کہیں، "ہاں میں ہندو ہوں اور مجھے اس پر فخر ہے۔"

اختتامیہ

ہندوستان میں مسلم کش فسادات اور مسلمانوں کے خلاف حکومتی سطح پر اقدامات کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کی اتنی طویل تاریخ ہے کہ چند سطروں میں یا ایک مضمون میں اس کا احاطہ ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں ہندوستانی میڈیا میں ہونے والی بحث کی یہ صرف ایک جھلک ہے۔ لیکن اس ایک جھلک سے ہی ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی سوچ کی عکاسی ہو جاتی ہے۔

ایک طرف ہندو صحافی ہیں جو بار بار یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہے ہیں کہ بالاصل وہاں کی اقلیتیں ہندو مخالف ہیں، اس لیے وہاں ہندو مظلوم ہیں۔

ہندُتوا نظریے کا پرچار کرنے والے ہندوستان کو ایک ہندو اسٹیٹ بنانے کے لیے بی جے پی کے جھنڈے تلے مسلسل ایسے اقدامات کر رہے ہیں اور آگے سے آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ مسلمانوں کو جمعہ کی نماز سے روکنا، گائے ذبیحہ کے نام پر کبھی پڑوسی ملکوں میں ہندوؤں پر ظلم کا بہانہ بنا کر، اور کبھی مسلمان دور کے علاقوں کے نام بدل کر ان کی جگہ ہندو نام رکھ کر۔ یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ یہ ہندُتوا ہی کی شر انگیزیاں ہیں کہ وہاں کوئی ہندو کھڑا ہو کر کسی مسلمان کی توہین کرے، بے عزتی کرے یا قتل، قانون مسلمان کے خلاف ہندو کا ہی ساتھ دے گا۔

دوسری طرف وہاں کے بیشتر مسلمان لکھاری ایسے ہیں جو انڈیا کے سیکولر اسٹیٹ اور سیکولر آئین کی دہائی دے رہے ہیں۔ اور وہاں کی گنگا جمنی تہذیب پر فخر کرتے ہیں کہ یہ وہ تہذیب ہے کہ جہاں صدیوں سے ہندو مسلم، سکھ اور عیسائی مل جل کر مذہبی اتحاد و رواداری سے رہتے ہیں۔

مسلم مخالف فسادات اور مسلمانوں کو جوش دلانے کے لیے ایک مہرہ وسیم رضوی ملعون بھی استعمال ہوا۔ جو لکھنؤ میں بیٹھ کر اسلام، قرآن اور رسول کریم ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرتا رہتا ہے اور حال ہی میں اس نے اعلانیہ ہندو مذہب بھی اپنا لیا ہے۔ پورے ملک میں متعدد بار اس کے خلاف ایف آئی آر کٹوائی گئی لیکن اس ملعون کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ مہاراشٹر میں اس کے خلاف پرامن ہڑتال کو پرتشدد بنایا گیا اور سینکڑوں مسلمانوں کو گرفتار کیا گیا۔

ایک قابل ذکر اور قابل افسوس بات یہ بھی ہے کہ بہت سے مسلمان صحافی اور دانشوران تمام فسادات کو بی جے پی کے سیاسی حربے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ چونکہ مارچ میں ریاستی انتخابات ہونے والے ہیں تو بی جے پی ہندوؤں کی اکثریت کے ووٹ کے لیے ایسے اقدامات کر رہی ہے۔ گویا الیکشن کے بعد جلد ہی یہ سب رک جائے گا۔ چند کالم نویسوں نے تو یہاں تک کہا کہ سیکولر آئین کے خلاف یہ ہوا کا ایک جھونکا ہے اور اسے جذباتی ہوئے بغیر سہہ لیں۔ یہ گزر جائے گا تو حالات معمول پر آجائیں گے۔

اسے ان کی سادگی کہیے یا حقیقت سے نظریں چرانا کہیے کہ واضح نظر آرہا ہے کہ جو کچھ مودی سرکار کے دور میں ہو رہا ہے وہ ہندُتوا نظریے کے مطابق انڈیا کو ہندو اسٹیٹ بنانے کے ایجنڈے پر پیشقدمی ہے اور اس ایجنڈے کے مطابق اب اترپردیش کے شہر متھرا میں شاہی عید گاہ ہندو بلوائیوں کے نشانے پر ہے۔ متھرا کی شاہی عید گاہ مغل بادشاہ اورنگزیب رحمۃ اللہ علیہ نے تعمیر کرائی تھی۔ شاہی عید گاہ میں ہندُتوا تنظیموں کی جانب سے ہندوؤں کے بھگوان کرشن کی مورتی نصب کرنے اور اس پر "جل ابھیشک" (گنگا کے پانی کا چھڑکاؤ) کا اعلان کیا گیا ہے۔ جس کے بعد وہاں کی حکومت نے فی الحال ظاہراً تو وہاں سکیورٹی سخت کر دی ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ معاملہ کب تک رک پاتا ہے۔

(باقی صفحہ نمبر 86 پر)

اور میں چپ ہی رہوں؟

محمد راشد دہلوی

تجھ پہ ظلمات کی گھنگھور گھٹا چھائی تھی
اور میں چپ تھا کہ روشن ہے میرے گھر کا چراغ

جاڑے کا موسم شروع ہوتے ہی ہم اپنے اور اپنے اہل وعیال کے حفاظتی انتظامات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ گرم کپڑوں، سویٹر، جیکٹوں کا فیشن شروع ہو جاتا ہے، ڈرائے فروٹس، چائے و کافی کے دور چلتے ہیں، گرم کمروں میں گرم گرم بستروں پر ہم سردی کے مزے لوٹتے ہیں۔ لیکن ہم یہ شاید بھول جاتے ہیں کہ ہماری امت کبھی کشمیر میں، تو کبھی شام و عراق میں، تو کبھی برما و فلسطین میں سخت سردی کے موسم میں دشمنِ دیں کے ظلم و ستم سے دو چار ہے، زمہریری ہوائیں ان کے جسموں کو سن کیے جاتی ہیں، کہرے میں چندھیائی آنکھیں کسی کی منتظر ہیں، کپکپاتے ہونٹ اللہ تعالیٰ کے سامنے دعا گو ہیں، کہ شاید کوئی امت کا بطل ہمیں ظالموں کے شکنجے سے چھڑا لے!!!

امت کو سرحدوں، قوموں، زبانوں میں تقسیم کرنا، کفار کا ایک اہم مقصد ہے تا کہ امت یکجانہ ہو سکے، امت منتشر رہے اور امت کے مظلوموں کی حالت دیکھ کر غیرت کھانے والی آنکھیں تماشائی بن جائیں، برما میں ایسی مسلم قوم بستی ہے جس کا درد ہر مسلمان اپنے سینے میں محسوس کرتا ہے، جس کے غم میں ہر آنکھ نم ہوتی ہے، جس کے لیے ہاتھ دعا کے لیے اٹھتے ہیں۔ لیکن......

ع خون جہاں بہنا ہو وہاں اشکوں کا کیسا بہنا؟!

برما میں روہنگیا مسلمانوں پر ڈھائے جانے والا ظلم دیکھ کر شاید پتھر بھی چیخ اٹھیں۔ امت پر ظلم کی ایسی ایسی ویڈیوز وائرل ہوئی ہیں جنہیں دیکھ کر دل دہل گئے اور ایسا محسوس ہوا جیسے یہ انسان نہیں! جانور ہیں! نہیں جانور بھی تو کچھ اصولوں کے پابند ہوتے ہیں، یہ کچھ اور ہیں؟!

روہنگیا مسلمانوں کی کھلم کھلا نسل کشی کی گئی، ظلم کی اسی کڑوی داستان میں ایک اور ہولناک داستاں رقم کی گئی، جب مسلمانوں پر ظلم کرنے والے ہاتھ کفار کے نہیں نام نہاد مسلمانوں کے تھے۔

اس بار ظالم کوئی اور نہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جن کے نام مسلمانوں جیسے تو ہیں لیکن دل ان کے اسلام سے خالی ہیں، جو مسلمانوں کے وسائل کو تو لوٹتے کھسوٹتے ہیں لیکن گاتے بھارت کی ہیں۔ جو اسلام اور اسلام کے ماننے والوں کے جانی دشمن ہیں، ایسے لوگوں سے آخر کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ روہنگیا مسلمانوں کو قبول کریں؟ سردیوں کے آغاز میں آنے والی ان خبروں نے ہوش اڑا دیے جب یہ پتہ چلا کہ جان بچا کر برما سے بنگلا دیش میں آئے روہنگیا مسلمانوں کو بنگلا دیشی حکومت نے بھاشان 4 نامی جزیرے میں دھکیل دیا ہے، جس پر انسانی حقوق کی تنظیمیں بھی چیخ اٹھیں۔ اور یہ کہا گیا کہ یہ پچیس سو (۲۵۰۰) مسلمان اپنی مرضی سے وہاں جانے کے لیے تیار ہوئے ہیں، اب اللہ ہی بہتر جانتے ہیں کہ ان مظلوموں کے لیے وہاں خوراک کے کیا انتظام ہیں، وہاں سردی سے بچنے اور رہائش کے کیا بندوبست ہیں؟ ظالم بنگلہ دیشی حکومت سے خیر کی کیا توقع کی جاسکتی ہے جس نے اس سخت وقت میں جب برمی اپنی جانیں بچا کر مسلمان حکومت سمجھتے ہوئے بنگلا دیش میں پناہ لینا چاہتے تھے تو ان کے ساتھ اس ظالم، بھارتی ایجیٹ حکومت نے کیا کیا؟

برمی مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، ان کو دوبارہ خونخوار سمندر میں دھکیلنے کی کوشش کی گئی اور حد تو اس وقت ہو گئی جب ان کی کشتیوں میں سوراخ کر کے ان پر سوار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی گئی۔ بنگلہ دیشی حکومت کے جرائم کی لسٹ بہت لمبی ہے۔ یہ بھارت کے وہ ایجنٹ ہیں اکھنڈ بھارت کے مشن کو پورا کرنے میں گامزن ہیں، اپنے ملک میں ہندو اسکون وغیرہ تنظیموں کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ یہ اسلام کے دشمن ہیں اور مسلمانوں کے دلوں سے ایمان کو کھرچ کھرچ کر نکالنا چاہتے ہیں۔

بربریت کی ان داستانوں میں ایک اور داستان اضافہ اس وقت ہوا جب بنگلہ دیش میں مقیم روہنگیا مسلمانوں کی پانچ سو (۵۰۰) جھگیوں پر مشتمل ایک بستی میں آگ لگ گئی، جس کے نتیجے میں پینتیس سو (۳۵۰۰) لوگ بے سرو سامان ہو گئے۔ آخر کب تک، ان مظلوموں کو کبھی ادھر تو کبھی ادھر ستایا جائے گا؟ آخر کب تک امت یوں ہی تماشائی بنی رہے گی؟

یہاں امت کے ایک ایسے بطل کا ذکر کرنا مناسب ہو گا جس نے اسی طرح ظلم کے ستائے مسلمانوں کی مدد کر کے کفار کے دانت کھٹے کر دیے۔

خیر الدین باربروسا، ایک ایسا نام ہے جس نے ساکت سمندروں میں طوفان برپا کر دیا، جس نے کفار کو یہ پیغام دیا کہ صرف خشکی پر نہیں بلکہ سمندروں میں بھی اللہ کے دین کا غلبہ ہو گا۔ اندلس میں مسلمانوں پر عیسائی ایسے ہی ظلم ڈھا رہے تھے جس سے آج برما کے مسلمان پر ظلم ڈھائے جا رہے ہیں، اندلس کے مسلمان اپنی جان و ایمان بچانے کے لیے شمالی افریقہ کی اسلامی سلطنت تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن ان کی راہ میں ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، وہ مسلمان بے بس تھے لاچار تھے، ان پر ظلموں کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے، ایسے سخت وقت میں امت کے

ابطال نے اس امت کے مظلوموں کا ہاتھ تھاما اور اندلس کے ان مسلمانوں کو ظلم سے نجات دلوائی، جس کے نتیجے میں وہ نوجوان سلطان کی فوج میں شامل ہوگئے اور انہوں نے اسلام کی فتح کے لیے اندلس پر کیے جانے والے جہادی حملوں میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

آج ایسے ہی ابطال کی ضرورت ہے جو کمزور امت کو سہارے دے سکیں! موجودہ دور میں امارتِ اسلامیہ نے وہ مثال پھر سے زندہ کی ہے، جسے دیکھنے کے لیے یہ امت ترس گئی تھی۔ جس نے ایک شیخ کی حفاظت کی خاطر پوری دنیا کو للکارا اور انتہائی کمزوری و سختی کی حالت میں یہ ثابت کر دکھایا کہ حق و باطل کے رن میں فتح آخر حق کی ہوتی ہے۔ بھارت کے اشاروں پر ناچنے والی چاہے بنگلہ دیشی حکومت ہو یا پھر برما کی ظالم حکومت، یہ امت کا جینا اس وقت تک دوبھر کرتے رہے گے جب تک امت یکجا نہیں ہوتی اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر نہیں کھڑی ہوتی!

میرے دشمن نے یہ سوچا ہی نہیں تھا شاید
یہ دیا بادِ فنا سے بھڑک سکتا ہے

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس امت کے غم کو اپنا غم سمجھیں۔ ہم مظلوم امت کو تھامنے والے بن جائیں۔ جس طرح ہم اپنی اور اپنے عیال کا غم کرتے ہیں، اسی طرح اس امت کی فکر کو اپنے دلوں میں بسا لیں۔ ان کی حفاظت کے لیے دعائیں کریں، ان کی فلاح کے لیے حتی الامکان جدوجہد کریں اور اس بات کو یقینی بنائیں کہ یہ امت ایک امت ہے۔ کسی برمی کا دکھ میرا دکھ ہے، کسی کشمیری کا غم میرا ہی غم ہے، کسی فلسطینی کی بے بسی، میری ہی بے بسی ہے اور یہ بھی یاد رکھیں کہ اس امت کی جیت میری ہی جیت ہے۔ افغانستان میں امریکہ کی شکست میں، میں بھی امارتِ اسلامیہ کے ساتھ ہوں۔ افغانستان میں کفر کی شکست اس امت کی فتح ہے!

اس نے اک مشعلِ تاباں کو بجھانا چاہا
اور فضا میں لپک اٹھے ہیں کروڑوں بازو

بھائی محمد راشد دہلوی کا تعلق سیکڑوں برس تک برِّصغیر کی مسلم سلطنت کے دار الحکومت رہنے والے شہر 'دہلی' سے ہے جو آج بھارتی ریاست کا ایک مقبوضہ ہے!

☆☆☆☆☆

بقیہ: سانحۂ اے پی ایس

پس اپنی خطاؤں سے رجوع و توبہ، اپنے اعمال و صفوف کا تصفیہ اور علمائے حق کی رہنمائی میں اپنی دعوت و جہاد کی جدوجہد کو جاری رکھنا دنیا و آخرت میں سلامتی کی راہ ہے۔

بلاشبہ ہمارے دل اے پی ایس اور اس طرح کے تمام سانحات پر زخمی و چھلنی ہیں۔ اے پی ایس ہو یا جامعہ حفصہ یا آج سے ڈیڑھ دہائی قبل باجوڑ کے ایک مدرسے کے حفاظِ قرآن پر بمباری کے نتیجے میں اسّی سے زائد طلبائے علمِ دین کی شہادت کا واقعہ، ان کے مقتولین کا صحیح بدلہ اللہ کی شریعت کا اتباع کرتے ہوئے، جہاد فی سبیل اللہ کرنا اور نفاذِ شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش کرنا ہے، وہ شریعت جو چڑیوں اور اونٹوں کے حقوق کی بھی حقیقی ضامن ہے۔

آج کے اس دورِ پر فتن میں اور خصوصاً آج کے حالات میں پاکستان سمیت پورے برِّصغیر میں دعوت و جہاد سے وابستہ ہر ہر داعی و مجاہد اہلِ عزیمت کے راستے پر گامزن ہے اور اس کا اس دعوت پر ڈٹنا اور جمنا زمانے کی نزاکت کے لحاظ سے نہایت قابلِ قدر ہے۔ لہٰذا، آخر میں راقم دعوت و جہاد سے وابستہ تمام محبین سے گزارش کرتا ہے کہ وہ چند درج ذیل تحریرات و کتب کا ضرور مطالعہ کریں، تا کہ دعوت و جہاد کا ہر تیر شریعت کے مطابق اپنے ہدف پر لگے، طاغوتی نظام کی ظلمتوں والی خزاں رخصت ہو اور لا الٰہ الا اللہ کی بہار کی صبح پر نور، جلد طلوع ہو:

- خونِ مسلم کی عظمت از شیخ عطیۃ اللہ اللیبی
- دعوتِ خلافت اور منہجِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم از مولانا عاصم عمر
- دعوت کا اُسلوب اور منہجِ جہاد کی حفاظت و فروغ (بالخصوص انٹرنیٹ اور بالعموم سب داعیانِ جہاد کو مخاطب تحریر) از استاد اسامہ محمود
- ہمارے کرنے کے کام (بغدادی کا قتل اور فتنۂ داعش کے تناظر میں) از استاد اسامہ محمود

جن مجاہدین سے یہ فعل سرزد ہوا اللہ پاک ان کی اس فعل پر مغفرت فرمائیں اور ہم بعد میں آنے والوں کے بھی گناہ بخش دیں اور ہماری رشد و ہدایت کے راستے کی طرف رہنمائی فرمائیں، آمین!

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ. رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ.

وآخر دعوانا أن الحمد لله ربّ العالمين وصلى الله وسلم على النبي الكريم.

☆☆☆☆☆

جس نے سورج کو مشرق سے نکالا اور مغرب میں غروب کیا، جو دنیا کو سورج کے گرد، چاند کو دنیا کے گرد اور نظامِ شمسی کو ہماری کہکشاں میں اور کہکشاں کو کائنات میں، ہر ہر شے کو اس کے اپنے اپنے مدار و محور میں گھمارہا ہے، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ جس نے بہار سے گرمی پیدا کی اور گرمی سے خزاں اور خزاں سے سردی اور سردی سے پھر بہار کو لایا، ہم اسی کے بندے ہیں۔ جس نے عظیم ترین فضل واحسان یہ فرمایا کہ بھٹکتے بھٹکتے لوگوں کو صراطِ مستقیم کا پتہ اپنے محبوبؐ کے ذریعے بخشا اور پھر اپنے حبیب کی محبت کو عام فرمادیا، ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔

اور لاکھوں درود و سلام ہوں، ہمارے دلوں کی دھڑکن، آنکھوں کا نور و ٹھنڈک، ہمارے شافع و حبیب پر، اس ذاتِ اطہر پر کہ جن کے نام کے بارے میں کسی اللہ والے نے کہا کہ 'نامِ محمد زبان و دل سے ادا کرنے پر لب بھی مل جاتے ہیں اور ربّ بھی مل جاتا ہے'، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

اللهم أصلح لنا ديننا الذي هو عصمة أمرنا وأصلح لنا دنيانا التي فيها معاشنا وأصلح لنا آخرتنا التي فيها معادنا واجعل الحياة زيادةً لنا في كل خير واجعل الموت راحة لنا من كل شر، آمين!

الحمد لله لِرَبّ الكعبة المشرفة

ہم اپنے رب کے بندے ہیں تو حرم سے بہت دور، لیکن دل ہم گنہگاروں کا وہیں اٹکا رہتا ہے۔ یقیناً کورونا کی وبا خطرناک بھی تھی اور شرعاً بھی اس کے سبب احتیاط لازم تھی، لیکن کورونا کی آڑ میں دشمنانِ حرم نے کعبۃ اللہ اور مسجد الحرام کو بند کر رکھا تھا جب کہ سینما گھر کھول دیے گئے تھے۔ سبھی اہلِ ایمان کے دل حرم کے صحن کی ویرانی دیکھ کر سخت دکھی تھے اور آنکھیں بہتی تھیں۔

اللہ کا فضلِ محض اور احسانِ عظیم ہے کہ اس نے اپنی رحمت و کرم سے اور عاطفت و مہربانی سے اپنے کعبے کے دروازے پھر اپنے نبی کی امت پر کھول دیے ہیں، صلى الله وسلم على حبيبنا وقرة أعيننا محمد۔ کروڑوں اہلِ ایمان کی آنکھیں کعبے کے گرد صفیں باندھے اہلِ ایمان کو دیکھ کر جذبۂ شکر سے بھیگ گئی ہیں۔

یا اللہ تو نے حرم کو جہاں عابدوں سے آباد کیا ہے وہیں اس کی حفاظت کے لیے مچلتے مجاہدوں کو بھی اس کی پہریداری پر مامور کر دے تا کہ تیرے حرم سے چند کلومیٹر دور جو امریکی صلیبی اس کو گھیرے ہوئے ہیں، یہ مجاہد ان کو بھگا سکیں۔ آمین یاربّ العالمین!

لقد جئناکم بالذبح!

عنوان سخت ہے، لیکن جس بارے میں ہے وہاں اس سے زیادہ سخت ظلم و عدوان کیا گیا ہے۔ عنوان بھی دراصل حدیثِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اخذ کردہ ہے۔ جب کفارِ قریش کا کفر و فساد حد سے گزرا تو حضور علیہ الصلاۃ والتسلیم نے ایک دن کفارِ قریش سے فرمایا "لقد جئتكم بالذبح"، 'بلا شبہ میں تمہیں ذبح کرنے کے لیے آیا ہوں'۔

محمد بن سلمان آلِ سعود نہیں مثلِ یہود بلکہ شاید بدتر از یہود نے پچھلے دو ماہ میں درج ذیل بڑے جرائم کا سعودی عرب میں ارتکاب کیا:

- مشرکانہ عیسائی تہوار 'ہیلووین (Halloween)' پورے سعودی عرب میں منایا گیا اور بے چارے عقل کے مارے مسلمانوں نے منہ پر شیطانی ماسک چڑھا کر اور عیسائیت کے حضرتِ عیسیٰ ابنِ مریم علیہ السلام سے منسوب جھوٹے قول کہ 'اس روز اپنی شکل شیطان جیسی بناؤ تا کہ شیطان جب تمہیں بہکانے آئے تو وہ یہ دیکھ کر کہ تم خود بھی شیطان ہو تمہیں چھوڑ دے (اور نہ بہکائے)' پر عمل کرتے ہوئے ہیلووین سرکاری آشیر باد کے ساتھ مناتے رہے (نعوذ باللہ من ذلک)۔
- ۴ دسمبر ۲۰۲۱ء کو بدترین دشمنِ اسلام، رذیل ترین گستاخِ رسول اور جدید صلیبی جنگ کا ایک صلیبی سرغنہ فرانسیسی صدر میکرون سعودی عرب پہنچا اور محمد بن سلمان نے اس کا پرتپاک استقبال کیا اور شب و روز اس کے ساتھ بیتائے۔
- حرمِ مکہ کے دروازے شہر جدہ میں 'Red Sea International Film Festival 2021' کا انعقاد کیا گیا جو ۶ دسمبر سے ۱۵ دسمبر ۲۰۲۱ء تک جاری رہا۔ اس فلم فیسٹیول میں دنیا جہان کی بدکاراؤں (اداکاراؤں) اور فاحشاؤں کو دعوت دی گئی اور سعودی قوم کے قومی نشان رشعار سرخ رومال کو اوڑھے بعض (نام نہاد کلمہ گو) بدمعاش ان فاحشاؤں سے گلے ملتے دکھائی دیے۔

- ۶ دسمبر ۲۰۲۱ء کو سعودی عرب میں تبلیغی جماعت پر پابندی لگادی گئی، سعودی عرب کے وزیر مذہبی امور عبد اللطیف آلِ شیخ نے بیان جاری کیا اور کہا کہ:
”تمام مسجدوں کے خطیب ۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۳ھ کے جمعے میں لوگوں کو تبلیغی جماعت کے خطرے کے بارے میں آگاہ کریں اور خطبۂ جمعہ میں درج ذیل نقاط کو اٹھایا جائے:

1. اس جماعت کی گمراہی اور (دین سے) انحراف کی تفصیل بیان کی جائے، اور یہ بیان کیا جائے کہ یہ جماعت کس طرح دہشت گردی کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے، چاہے یہ (تبلیغی حضرات) بظاہر اس کے خلاف ہی دعویٰ کرتے ہیں۔
2. ان کی واضح ترین خطاؤں کے بارے میں بیان کیا جائے۔
3. معاشرے کو ان کے خطرے کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔
4. اس بات کا اعلان کیا جائے کہ اس گروہ (تبلیغی جماعت) کے ساتھ جڑنے پر مملکتِ سعودی عرب میں پابندی ہے“۔

- جس دن تبلیغی جماعت پر سعودی عرب میں پابندی لگائی گئی، اسی دن مکہ معظمہ کے دروازے یعنی شہر جدّہ میں امریکہ میں رہائش پذیر کینیڈین عیسائی گلوکار جسٹن بیبر کا ایک ’عظیم الشان‘ کانسرٹ منعقد کیا گیا جس میں ستّر (۷۰) ہزار افراد نے شرکت کی۔
- جس جمعے کے دن پورے سعودی عرب میں تبلیغی جماعت کے خلاف خطبے دیے گئے اس جمعے کی شب کو ریاض میں بالی ووڈ کے اداکار سلمان خان کے ساتھ ایک ہندو فاحشہ شلپا شیٹی نے اپنے ’فن‘ کا ’مظاہرہ‘ ولی عہد محمد بن سلمان کی ’دعوت‘ پر کیا۔ نہایت بیچ، گھٹیا اور ننگے بولوں پر ننگا ناچ جزیرۃ العرب کے مرکز میں ہوا۔

جس ہندو دیوتا رام کے نام پر ایودھیا میں ہماری مسجدِ بابری کو اسی دسمبر کے مہینے کی ۶ تاریخ کو گرا کر بعد اُرام مندر تعمیر کیا گیا اسی رام کا نام لے کر ایک گانے میں فحش رقص کیا گیا۔ اور افسوس کا عالم یہ تھا کہ ’ہائے رام......‘ کا گھٹیا بول بولتے ہوئے کتنے ہی سعودی عرب کے کلمہ گو باشندوں نے سلمان خان کی آواز میں اپنی آواز ملائی اور کتنوں نے سلمان خان کی تقلید میں ’ہائے رام......‘ بکتے ہوئے ہندو مذہب میں نمسکار کے انداز میں ہاتھ جوڑے اور سر کو جھکایا، انّا للہ وانّا الیہ راجعون![1]

اس ناچ گانے میں اسّی (۸۰) ہزار لڑکے لڑکیوں نے شرکت کی، جن کا کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اور اس ’قربت‘ میں چونکہ مقصد فحاشی کا فروغ و اظہار اور اللہ کے حکم سے بغاوت و انکار تھا اس لیے safe distancing کی ضرورت نہ تھی، کورونا، اس کی ڈیلٹا قسم اور اومیکرون کا کوئی خدشہ نہ تھا، قاتلھم اللہ!

- ظلم فوق ظلم، ظلمات فوق ظلمات، جس وقت تحریرِ ہٰذا شائع ہونے کو جا رہی ہے تو ریاض میں چار دن تک موسیقی و فحش ناچ کے فیسٹیول کا انعقاد کیا گیا جس میں ساری دنیا کے مشہور ترین DJs نے میزبانی کی۔ اور اس چند سال سے برپا طوفان میں پہلی بار اہلِ اسلام کے مرکز جزیرۃ العرب کی باحجاب عورتوں کو بے حجاب نہیں چند چیتھڑوں میں لپیٹ کر، برہنہ کر کے مجمع میں جمع کیا گیا اور مردوں کے ساتھ مغربی دھنوں پر نچوایا گیا۔ اہلِ کفر کے ایک میڈیا ادارے کی خاتون صحافی نے جب اس خبر کو پیش کیا تو یہ کافر خاتون بھی حیران و ششدر تھی اور اس نے کہا:

“and let me say this upfront, you should brace yourself for what’s coming next from this story. The defacto leader of the Islamic world, the guardian of the two holiest sites in Islam, Saudi Arabia did the unexpected this weekend. It threw a giant rave party…”

’اور میں آپ کو پہلے ہی خبر دار کر دوں کہ اس کہانی کی اگلی خبر سننے کے لیے تیار ہو جایئے......! زمینی حقائق کے اعتبار سے دنیائے اسلام کے بادشاہ، اسلام کی دو مقدس ترین جگہوں کے محافظ سعودی عرب نے اس ویک اینڈ (ہفتے کے اختتام پر) کچھ انتہائی غیر متوقع کر دکھایا! اس نے ناچ گانے اور شراب و موسیقی سے بھرپور ایک عظیم الشان پارٹی کا اہتمام کیا......“

اے ایمان والو! اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کا دم بھرنے والو! کعبۃ اللہ کی حرمت پامال ہو رہی ہے۔ علمائے اسلام نے تو فرمایا کہ سورۃ الحجرات کی آیت ’يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ‘ کا آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی رحلت کے بعد بھی ویسا ہی اطلاق ہے، آج روضۂ رسولؐ کے پڑوس میں آوازیں اہلِ ایمان کی نہیں مشرکین کی بلند ہو رہی ہیں اور مشرکین کی فقط آوازیں نہیں ہیں گھٹیا گانوں کے بول ہیں۔ جامِ کوثر کے پیاسو! صاحبِ کوثرؐ کو تکلیف پہنچ رہی ہے! یہ کیا ہو رہا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے روضۂ اقدس میں تکلیف سے ہیں، ان کے پڑوس میں یہ فحاشی و ناچ گانا ہو رہا ہے اور لوگوں کو اصلاحِ نفس کی دعوت دینے والوں پر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ اب شبِ جمعہ کو اصلاحِ احوال و اعمال کا ذکر نہیں، دعوت و تبلیغ کی ایمان افروز کارگزاریاں نہیں، جھوٹے رام، رام مندر والے رام، بابری مسجد کے دشمن رام کے نام والے گانوں سے شبِ جمعہ برباد کی جا رہی ہے۔

[1] اپنی حیا کے سبب ہم قاصر ہیں کہ گانے کا وہ گھٹیا بول یہاں تحریر کریں!

حرمین شریفین کی حرمت پامال ہو رہی، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبۃ اللہ میں بتوں کو گرایا تھا، لات و منات کو تباہ کیا تھا آج وہاں رام و سومنات کے پجاری وہاں کے بادشاہ کی دعوت پر پہنچ گئے۔

مسلمانو! اگر دل میں کچھ باقی ہے تو سنو اللہ کا قرآن پوچھ رہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان پوچھ رہا ہے، اللہ کا کعبہ پکار رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضے سے آواز آ رہی ہے، منْ انصاری الی اللہ؟!

مسلمانو! جواب دو! کہو: نحن انصار اللہ! کہو نحن انصار رسول اللہ!

مسلمانو! جن گستاخوں، کافروں اور کافروں کے ٹوڈیوں، غلاموں، دم چھلوں اور کاسہ لیسوں نے وطنِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ کفر و ظلم کا ہنگامہ مچایا ہے، ان کو بتا دو کہ تم اگر اس کفر و فساد سے باز نہ آئے تو عاشقانِ مصطفیٰ کا اعلان سن لو: ''لقد جئناکم بالذبح''، 'بلاشبہ ہم تمہیں ذبح کرنے کے لیے آ رہے ہیں'۔ اور اس اعلان کو اپنے اعلانوں کی طرح نہ لینا، ہم یہ اعلان کلاشن کوفوں کے قبضوں کو اپنے ہاتھوں میں کس کر کر رہے ہیں!

کشمیر سے دہلی تک، یہ ملک ہمارا ہے!

ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ ۲۰۲۱ء میں، پاکستان نے انڈیا کے مقابلے میں کرکٹ میچ جیتا۔ کرکٹ میچوں میں ہار جیت کا تعلق حقیقی زندگی جیتے حقیقی لوگوں سے کم کم ہی ہوتا ہے، خصوصاً آج کی 'کیپٹل اسٹ' دنیا میں۔ کرکٹ میں فتح یا شکست سے عسکری تو دور کی بات، سیاسی بلکہ سفارتی میدانوں میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن بہر حال کرکٹ آج کی دنیا کا بڑا موضوع ہے اور اس موضوع کے ذیل میں بہت کچھ سمجھا جا سکتا ہے۔ ہندوستان پاکستان کا کرکٹ میچ بھی بہت سے اسباق لیے ہوئے ہے۔

اودے پور، راجستھان کے ایک پرائیویٹ سکول کی مسلمان خاتون ٹیچر نے اپنے پرائیویٹ واٹس ایپ نمبر پر 'ہم جیت گئے' کا 'پرائیویٹ' سٹیٹس لگایا تو انہیں نوکری سے نکال دیا گیا اور انڈین پینل کوڈ کی ایک شق کے مطابق 'انتشار پھیلانے' کا پرچہ کاٹ دیا گیا۔ بعد میں یہ بے چاری خاتون ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے نظر آئی۔

آگرہ، یوپی کے انجنیئرنگ و ٹیکنالوجی کالج کے سات نوجوانوں کو کرکٹ میں پاکستانی حمایت (support) کے جرم میں دھر لیا گیا، جن میں تین کشمیری ہیں اور ان تینوں کو کالج سے نکال (expel کر) دیا گیا ہے۔

سری نگر، کشمیر میں ایک میڈیکل کالج کی طالبات نے پاکستان کے حق میں والہانہ نعرے لگائے، ڈاؤن ٹاؤن اور اولڈ ٹاؤن سری نگر میں کچھ نوجوانوں نے پاکستان کے میچ جیتنے کی خوشی میں ایک ریلی نکالی، ان میں سے اکثر حوالات میں بند ہیں اور ان کے خلاف کہیں انتشار پھیلانے اور کہیں غداری اور بغاوت کے پرچے کاٹے گئے ہیں۔

درج بالا جرائم اور ان پر درج کیے گئے مقدمات کا نتیجہ تاحیات عمر قید بھی ہو سکتا ہے۔

حد تو یہ ہے کہ ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے مسلمان کھلاڑی محمد شامی کو اس ہار کا سبب بھی بتایا گیا اور انتہائی گھٹیا قسم کی گالم گلوچ کا سامنا بھی کرنا پڑا اور وہ بھی صرف اس لیے کہ وہ ایک مسلمان ہے۔

کشمیر و ہندوستان میں ہونے والے یہ واقعات چار قسم کے لوگوں کے تین رویوں اور ایک مشکل کی نشاندہی کرتے ہیں اور آخر میں ایک مشہور حقیقت بھی دیکھتے ہیں:

1. کشمیری و ہندوستانی مسلمان:

جناب سیّد علی شاہ گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے 'پاکستانی' ہونے کو جس نسبت سے بیان کیا کہ 'اسلام کی نسبت سے ہم پاکستانی ہیں پاکستان ہمارا ہے'، یہ نسبت پاکستان سے دنیا کے ہر مسلمان کو ہے۔ اقبالؒ نے ایسی ہی نسبت اپنے درجنوں اشعار میں بیان کی ہے اور یہی نسبت اگر حاصل ہو رہے تو نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر ایک ہی امت ہے، ایک ہی قوم ہے اور سارا ہی اسلامی جغرافیہ پاکستان۔

چوہتّر برس قبل جس لا الٰہ الا اللہ سے نسبت جوڑی گئی تھی اسی نسبت کا جدید زمانے میں ایک اظہار پاکستان کے کرکٹ میچ جیتنے کی صورت میں اہلِ ہند و کشمیر کے یہاں نظر آیا۔

ہندوستان و کشمیر کے باشندے آج بھی اسی لا الٰہ الا اللہ کے بندھن میں جڑے ہوئے ہیں اور اس پاکستان (بمعنیٰ ریاست و حکومت نہیں) سے اپنی محبت کا اظہار کر رہے ہیں جس کے اداروں نے ان کو غداری کے سوا کبھی کچھ نہیں دیا۔ بلکہ ان اداروں نے تو اپنا ہی جسم دو لخت کیا اور مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کو ہندوؤں اور ہندو نواز عوامی لیگ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، باقیوں کا تو قصہ ہی کیا؟

گھس بیٹھیے سے دفعہ 370 کے خاتمے اور این آر سی جیسے ہتھکنڈوں کے بعد بھی کشمیر و ہند میں بلند ہوتے 'پاکستان زندہ باد' کے نعرے ان کے جذبۂ ایمانی کی دلیل ہیں۔

2. حکومت و ریاستِ ہند:

دوسرا گروہ حکومت و ریاست ہند کا ہے، وہاں کے اداروں کا۔ ان کا چہرہ کسی نقاب میں چھپا ہوا نہیں ہے۔ وہ اینٹی مسلم ہیں اور پاکستان کو جو نسبت (عوام اور نام کی حد تک) اسلام سے ہے اسی کے سبب وہ اینٹی پاکستان بھی ہیں، ورنہ بنگلہ دیش میں بھی تقریباً سولہ کروڑ لوگ مسلمان ہیں لیکن وہاں کا ریاستی مذہب و بیانیہ چونکہ

روزِ اول سے وطنیت و سیکولرازم ہے تو یہی بنگلہ دیش (دھونس کے ذریعے) ہندُتوائی بھارتی ریاست کا درجہ اختیار کیے ہوئے ہے۔

3. تیسرا گروہ پاکستان کی حکومت اور اداروں کا ہے، جن کی کشمیریوں سے خیانت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اور جن کا اندر باہر منافق ہے۔ مسئلۂ کشمیر اور کشمیر کے مسلمانوں کی عزت اور جان و مال کی ان کے یہاں قدر کا اسی بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کشمیر کی قائمہ کمیٹی کا سربراہ لاابالی پن اور دروغ گوئی میں شہیر شہریار آفریدی ہے، وزیرِ امورِ کشمیر 'شہد خوار' علی امین گنڈا پور۔

4. چوتھی مشکل کشمیر و ہند کے مسلمانوں کی ہے کہ ان کی زبان سے حمایتِ اسلام یا حمایتِ پاکستان بنسبتِ اسلام کوئی لفظ نکلتا نہیں کہ ہندُتوا دہشت گرد یوگی ادتیا ناتھ سے سدھارتھ ناتھ سنگھ اور امت شا تک سبھی پہلے سے کمین لگائے بیٹھے ہوتے ہیں اور مسلمانانِ ہند و کشمیر کو اپنی جان و عزت اور مال و روزگار کی حفاظت کے لیے طرح طرح کے جتن نہایت ذلت کے ساتھ کرنا پڑتے ہیں۔

5. مشہور حقیقت یہ ہے کہ برطانوی انگلش پریمئر لیگ کی آرسنل، مانچسٹر یونائیٹڈ، چیلسی، لِورپُول...... ہسپانوی لالیگا کی بارسالونا، ریئل میڈریڈ، ویلنشیا، سیولیا (جو کبھی اشبیلیہ ہوتا تھا)...... اور ہندوستان کی انڈین پریمئر لیگ کی چینئی، ممبئی، دہلی، پنجاب و کلکتے کی ٹیموں کو، پاکستان سپر لیگ کی ٹیموں بلکہ اب تو کشمیر پریمئر لیگ تک کی ٹیموں کو بھی ساری دنیا کے لوگ (internationally) سپورٹ کرتے ہیں[1] اور ان کے فین کلبز کا حصہ ہوتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ کھیل کو کھیل کے طور پر لیا جائے، لیکن یہی کھیل جب ہندوستان پہنچتا ہے تو واجپائی سے مودی تک کی وحشت کا شکار ہو جاتا ہے؟!

سیالکوٹ میں سری لنکن شہری کا قتل

اس واقعے کے دو پہلو ہیں:

1. قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سری لنکن شہری کو گستاخی کے جرم کے سبب قتل نہیں کیا گیا بلکہ اس کے قتل کا سبب کوئی ذاتی رنجش تھی اور اس ذاتی انتقام کے لیے اس کو قتل کیا گیا اور پھر جلایا گیا اور اس سب کو جواز بخشنے کے لیے بعض ظالموں نے اہانتِ انبیا علیہم السلام سے جوڑ دیا۔ ناحق قتل جہاں بھی اور جس صورت میں بھی اور جس طرح بھی ہو وہ قابلِ مذمت ہے۔ اس واقعے کی مذمت تمام اہلِ دین کے تمام مکاتبِ فکر نے کی۔

2. دوسرا پہلو ان لادینوں کا ہے جنھوں نے اس واقعے کو فوراً اٹھایا اور فوراً قانونِ توہینِ رسالت کے خلاف بات کرنے لگے اور صحافی سلیم صافی نے اس سیکولر فکر اور قانونِ توہینِ رسالت کو ختم کرنے کے سیکولر و لادین مطالبے کو 'دین' کا تڑکا لگانے کی کوشش کی اور یہ ساتھ میں کہا کہ جو توہینِ رسالت کا جھوٹا الزام لگائے تو اس پر 'قذف' کا اطلاق ہونا چاہیے، جس کا جواب حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (حفظہ اللہ) نے شریعت کی روشنی میں دیا۔

کہا جاتا ہے کہ قانونِ توہینِ رسالت کو غلط استعمال کیا جاتا ہے لہٰذا اس کو ختم کیا جائے (یا جیسے سلیم صافی نے شریعت و فہمِ غامدی کی روشنی میں تڑکا لگانے کی کوشش کی)۔ اس کا جائزہ ذرا 'سیکولر' بنیادوں پر ہی لیتے ہیں۔ یہ بتایا جائے کہ آج تک کتنے توہینِ رسالت کے مرتکب لوگوں کو آئینِ پاکستان کے اس قانون کے تحت سزا دی گئی ہے؟ ہاں یہ مثال ضرور موجود ہے کہ گستاخِ رسول کے قاتل (ممتاز قادری) کو اس آئین کے تحت ضرور سزا دی گئی ہے۔ پاکستان کے آئین کے سیکڑوں قوانین کو چوکوں چوراہوں پر کھڑے پولیس والوں سے لے کر آرمی چیف و صدر و وزیرِ اعظم غلط استعمال کرتے ہیں، نیب کے تحت کتنوں کو 'ناحق' سزا دی جاتی ہے تو کیا کبھی ان قوانین کو ختم کرنے کی بات کی گئی ہے یا وہاں rule of law وغیرہ کے منجن بیچے جاتے ہیں؟ دراصل یہ سیکولر لوگ دین دشمن اور پیغمبرِ دین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دشمن ہیں اور ان کی تان اگر کہیں ٹوٹتی ہے تو اس نکتے پر کہ اسلامی شقیں ختم کر دی جائیں، حدود ختم کر دی جائیں اور یہ قوانین پہلے ہی یا تو لولے لنگڑے ہیں یا ان کا اطلاق ممکن ہی نہیں اور ممکن ہے تو کبھی ہوا ہی نہیں۔ کسی نے صحیح ہی پوچھا تھا کہ یہ سیکولر ہیں یا منافق؟

☆☆☆☆☆

قیامِ پاکستان کے مقصد سے انحراف

"کبھی بھی سنجیدگی کے ساتھ نہ یہاں قرآن و سنت کا نظام نافذ کرنے کی کوشش کی گئی، نہ عدل و انصاف کی حکمرانی قائم ہوئی، نہ اسلامی علوم کی سرپرستی کی گئی اور نہ اسلام کو بالادستی عطا کی گئی بلکہ اس عرصے میں غیر اسلامی نظامِ تعلیم اور فرنگی معاشرت و ثقافت کے ذریعے تین نسلیں وہ تیار کی گئیں ہیں جو اسلام کے متعلق یا تو شک و شبہ کا شکار ہیں یا پھر کھلم کھلا بغاوت پر آمادہ ہیں۔"

(حضرت شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان عَلَیْہِ الرَّحْمَۃ، بحوالہ: صدائے حق ص ۱۳۱)

[1] ان ٹیموں کے ذکر کا مطلب ہمارا ان کو سپورٹ کرنا قطعاً نہیں!

عمل کا پیکر عبد الاحد شہیدؒ

عمر فاروق خراسانی

مجاہد فی سبیل اللہ ایک عظیم کردار و عمل کا پیکر جو اپنی جان ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہے، جو اپنی ماں بہن کو چھوڑ کر امت کی ماؤں بہنوں کے دفاع کی فکر میں غلطاں رہتا ہے۔ مجاہد وہ جو گفتار و کردار کا غازی ہوتا ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کسی بھی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرتا، جو ہر وقت تیار و بیدار رہتا ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ جو اس امت کے کل پہ اپنا آج قربان کر دیتا ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ سہولت پسند اور آرام طلب نہیں بلکہ خاک و خون کے جہاں سے محبت کرنے والا ہوتا ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ وہ جو ظالموں کے لیے موت کا پیغامبر اور مظلوموں اور محقوروں سے سلوکِ مروت کرنے والا ہوتا ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ وہ جو دست باطل کے پھولوں پہ مرنے والا نہیں بلکہ جادۂ حق کے کانٹوں پہ چلنے والا ہوتا ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ جو دفاعِ دین کی خاطر اپنی جان و مال، جسم و جان سے بھی گزر جاتا ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ وہ جو موت سے پیار کرنے والا اور تیر و تفنگ سے کھیلنے والا ہوتا ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ جس کی تکبیر سے کفر کے ایوان لرز اٹھتے ہیں۔ مجاہد فی سبیل اللہ وہ جو موت کے میدانوں میں موت کے پیچھے کچھ اس طرح بڑھتا ہے کہ موت خود اس سے بھاگتی پھرتی ہے، جنگ کے میدان میں جب رن پڑتا ہے تو ثبات و عزیمت کی مثال ہوتا ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ وہ جس کی پیٹھ نرم بستروں سے دور رہتی ہے کیونکہ یہ اس زندگی کا سبب بنتے ہیں جو دین پہ کٹ مرنے نہیں دیتی۔ مجاہد فی سبیل اللہ اس بات کی فکر نہیں کرتا کہ وہ مقتل میں کس کروٹ گرایا جاتا ہے، اس کی لاش کانٹوں پہ گھسیٹی جاتی ہے یا مثلہ بنادی جاتی ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ نہ تو کفر کا خوف رکھنے والا ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے سامان و آلاتِ حرب سے ڈرنے والا، کیونکہ وہ جانتا ہے مٹی کے کھلونے ہیں سارے یہ کفر کے لشکر کچھ بھی نہیں۔ مجاہد فی سبیل اللہ اس علم پہ لعنت بھجتا ہے جو اسے عمل سے دور رکھے۔ مجاہد فی سبیل اللہ ہر وقت تلوار ہاتھوں میں تھامے کفر کی سر کوبی کے لیے تیار رہتا ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ غیرت و حمیت کا پیکر ہوتا ہے، جو اپنے دین و ملت کا دفاع کرنا جانتا ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ وہ جو ادخلو فی السلمه کافة پہ عمل کرتا ہے۔

ایسے ہی ایک مجاہد فی سبیل اللہ ہمارے پیارے بھائی عبد الاحد رحمہ اللہ بھی تھے جو عظمت دین کے لیے اپنی جان قربان کر گئے۔ (نحسبه کذالک واللہ حسیبه)

عبد الاحد شہید کا تعلق صوبہ سرحد کے ضلع دیر کے ایک علمی و جہادی گھرانے سے تھا۔ وہ مولانا سعید اللہ شہید رحمہ اللہ کے بھانجے تھے۔ جہادی چنگاری ان کے انگ انگ میں رچی بسی تھی۔ وہ چھوٹی سی عمر میں سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ وسیدنا معوذ رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پہ چلتے ہوئے جہاد کے میدانوں میں کود پڑنے کو مچلتے رہتے۔ انہیں امت مسلمہ کی حالت زار چین سے نہ بیٹھنے دیتی۔ ان کی پاکیزہ روح کشمیر و فلسطین عراق و شام یمن و صومال میں مسلم امہ کے بہتے لہو کو دیکھ بے قرار ہو جاتی۔ وہ اپنے مسلم بہن بھائیوں کے دکھ درد کو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان 'مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں' کی طرح محسوس کرتے کہ گویا اپنی جان پہ ظلم سہہ رہے ہوں۔ یہی احساسات یہی جذبے انہیں چین سے بیٹھنے نہ دیتے۔ آپ وادیٔ کشمیر جنت نظیر میں پامال ہوتی عزتیں، ماؤں کے بہتے آنسوں، بہنوں کی چھنتی ردائیں، بھوک سے بلکتے بچوں، جیلوں میں تڑپتی لاشوں کا غم لیے ۲۰۰۵ء میں پہلی مرتبہ جہادِ کشمیر کے معسکرات جا پہنچے۔ آپ اس وقت آٹھویں جماعت کے طالبعلم تھے اور آپ کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ اس ننھی سی عمر میں آپ نے کشمیر کے معسکرات میں صبر واستقامت سے پہلے دورہ سعادت مکمل کیا، پھر دورہ عزیمت مکمل کیا۔ آپ کا ارادہ تو مڑ کر پیچھے جانے کا نہ تھا کہ آپ تو بتوں کے شہر میں اللہ کے علم کو اونچا کرنے کا عزم لیکر گھر سے نکلے تھے۔

آپ کی خواہش تو یہ تھی کہ آپ دورہ عزیمت کے بعد دورہ شہادت (لانچنگ) کے لیے بھی جائیں۔ مگر حق کی پیاسی روح کو وہاں اطمنان وسکونِ قلب حاصل نہ ہو سکا۔ وہاں کے واقعات و حالات دیکھ کر آپ نے واپس آنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ آپ وہاں یہ جان چکے تھے جہادِ کشمیر اب طاغوتی اداروں کے مفادات کی جنگ بن گئی ہے۔ پاکستانی خفیہ ادارے مجاہدین اور جہادِ کشمیر کو یرغمال بنا چکے ہیں۔ جب انہیں بھارت کی طرف سے خطرہ نظر آتا ہے تو یہ پھر انہی مجاہدین کو آگے کرتے ہیں، یہ جب چاہتے ہیں معسکرات و لانچنگ (وادی میں داخل ہونے والی تشکیلات) شروع کر دیتے ہیں۔جب بھارت سے تعلقات میں بہتری آنے لگتی ہے تو یہ مجاہدین کے ساتھ غداری کر کے خود انڈین آرمی کو ان کی ریکی دے کر شہید کرواتے ہیں [1]۔ جہادِ کشمیر کا یہ حال دیکھ کر تقریباً ٦ ماہ بعد آپ نے واپسی کی راہ لینے میں ہی عافیت جانی۔

پاکستان واپس آکر آپ نے اپنے تعلیمی سلسلے کو دوبارہ شروع کیا مگر حقیقتاً میکالے کے مکتب میں آپ کا دل نہ لگا، وہ روح جو جذبۂ جہاد و شہادت سے سرشار ہو جس کے انگ انگ میں جہاد رچا بسا ہو، بھلا اسے اس فانی دنیا میں کیسے قرار آسکتا ہے؟ اسے تو بس قتال کے میدانوں کی خاک سے ہی لذت میسر آتی ہے، پھر یہ بے چین روح کیسے محاذوں سے یہ دوری برداشت کر سکتی ہے؟

[1] اس بات کا انکشاف خود ایک جہادِ کشمیر سے وابستہ مگر آئی-ایس-آئی کے باغی اور شریعت مطہرہ کی اتباع کرنے والے گروہ کے مجاہد عباس بھائی نے بھی اپنے ایک آڈیو بیان میں بھی کیا۔

فرضیتِ جہاد کو جان لینے کے بعد آپ کی فطرتِ سلیمہ نے یہ گوارانہ کیا کہ وہ پیچھے بیٹھے رہنے والوں میں شامل ہو۔ جہادِ پاکستان کی گونج ہر طرف سنائی دینے لگی، بس آپ بھی منزل کی جستجو میں آگے بڑھتے رہے اور ارض خراسان میں موجود امام مہدی کے حواریوں کے لشکر (القاعدہ) سے جاملے۔ ۲۰۰۷ء میں آپ پہلی مرتبہ جہادِ پاکستان میں شامل ہوئے، اس وقت آپ کے چہرے پر ڈارھی بھی نہ آئی تھی، ہاں ہلکے ہلکے آثار نظر آرہے تھے۔ آپ کچھ عرصہ اپنے ماموں مولانا سعید اللہ شہی رحمۃ اللہ علیہ د کے پاس رہے، پھر امرائے جہاد کے امر پر آپ کو واپس بھیج دیا گیا۔ جو دل جہاد کے میدانوں کی خاک سے آشنا ہو جائے پھر بھلا اسے اس پر فتن معاشرے میں کیسے قرار آسکتا ہے جہاں ہر طرف ظلم و زیادتی کا بازار گرم ہو، جہاں فحاشی اور عریانی کا چلن عام ہو، جہاں نیکی کرنا مشکل اور برائی کرنا آسان بنادیا گیا ہو، جہاں شریعت کی جگہ کفریہ نظام نے لے لی ہو۔ ۲۰۰۸ء میں آپ نے ایک بار پھر ارضِ خراسان کی راہ لی، اس مرتبہ آپ کے پر نور چہرے پہ نورانی تاریں (ہلکی ہلکی داڑھی) بھی نمایاں تھیں۔ اس مرتبہ آپ کو ابتدائی عسکری تربیت کے لیے انگور اڈہ بھیجا گیا۔ انگوراداہ کے میں خط اوّل پہ موجود معسکر میں ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی جہاں ایک ماہ قبل ہی ہماری تدریب ختم ہوئی تھی۔

صاف رنگت، بھوری چمکدار آنکھیں، درمیانے قد کے حامل عبد الاحد بھائی انتہائی بے تکلف اور ہنس مکھ طبعیت کے مالک تھے۔ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہتے، دل لگی اور خوش اخلاقی ان کا خاصہ تھی۔ میٹھی میٹھی شرارتیں کرنا، ساتھیوں سے زور آزمائی کرنا ان کا مشغلہ تھا۔

جنوبی وزیرستان کے گھنے جنگلات میں مجاہدین کا ایک مرکز تھا، اس مرکز سے کچھ قریب ہی ایک جگہ تھی جسے مجاہدین درّہ کے نام سے جانتے تھے، اس علاقے میں دوسری مخلوقات بھی باکثرت موجود تھیں یعنی جنات وغیرہ۔ کچھ دن پہلے ہی نئے ساتھ اس مرکز میں پہنچے تھے۔ عبد الاحد بھائی نے امیر مرکز کو مشورہ دیا کہ آپ اس بھائی کو فلاں طرف کسی کام سے بھیجیں میں وہیں ہوں، امیر صاحب نے اس ساتھی کو کام کے لیے روانہ کیا تو عبد الاحد بھائی اپنے ایک ساتھی کے ساتھ چادر اوڑھے پہلے سے وہاں چھپ کے بیٹھے ہوئے تھے۔ جیسے ہی یہ ساتھی وہاں پہنچا تو دونوں نے سامنے آکر اسے ڈرانہ شروع کر دیا وہ ساتھی ڈر گئے اور اونچی آواز سے لا حول ولا قوة، لاحول ولا قوة پڑھتے ہوئے واپس مرکز کی طرف دوڑ پڑے۔ جب وہ ساتھی مرکز پہنچے تو گھبرائے ہوئے امیر صاحب امیر صاحب کی آوازیں لگانا شروع کر دیں۔ عبد الاحد بھائی ان سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے، فوراًبولے کیا ہوا؟ ساتھی کہنے لگے امیر صاحب میں نے وہاں دو خوفناک چیزیں دیکھی ہیں۔

ایک دن راقم عصر کے بعد روٹی بنانے میں مصروف تھا کہ ارد گرد ڈاکٹر معاذ، ڈاکٹر خالد، صائم بھائی (فک اللہ اسرہ) کھڑے تھے۔ میں نے ڈاکٹر معاذ سے کہا بھائی ذرا یہ چھوٹی لکڑی اٹھا کر مجھے دیجیئے گا، جو انہوں نے مجھے بڑھادی۔ اس پر میں نے انہیں دعا دی کہ اللہ آپ کو لمبے بالوں والی اور خوبصورت آنکھوں والی حوریں عطاء فرمائیں تو سب نے کہا آمین۔ عبد الاحد بھائی فوراً بولے ڈاکٹر صیب (پشتون لہجے میں صاحب) اللہ آپ کو سفید بالوں والی اور موٹے چشمے والی بیوی عطاء فرمائے۔ سب ساتھی زور سے ہنسنے لگے۔

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! ”طاقتور مومن زیادہ بہتر اور اللہ کو زیادہ محبوب ہے کمزور مومن سے۔ اور ہر ایک (قوی اور ضعیف) میں بھلائی ہے۔“(صحیح مسلم)

عبد الاحد بھائی عمر میں چھوٹے مگر پختہ ارادوں اور بلند عزائم کے مالک تھے، قربانی وایثار، ہمت و بہادری اور شجاعت ان کے اندر رچی بسی تھی۔ جنگوں میں جاتے ہوئے بھاری بھر کم سامان کبھی مائن، کبھی میزائل، کبھی مارٹر کے گولے، کبھی R.R.82 کے گولے کندھوں پہ لاد کر مجاہدین کو گھنٹوں کا سفر پیدل کرنا پڑتا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں اسی طرح کے ایک سفر میں عبد الاحد کے ساتھ شریک رہنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب عبد الاحد بھائی کی تدریب (عسکری تربیت) اپنے آخری مراحل میں تھی مجاہدین کے مختلف مجموعہ جات نے ایک مشترکہ کاروائی ترتیب دی جس میں راقم، تنویر الاسلام بھائی (عبد السلام شہید) اور عبد الاحد شہید شریک تھے۔ اس سفر میں عبد الاحد بھائی مائن گروپ میں شامل تھے، میں نے دیکھا عبد الاحد نے مرکز سے تقریباًدس کلو وزنی مائن اٹھائی اور پورے راستے تقریباً تین سے چار گھنٹے اکیلے ہی لے کر چلتے رہے، ساتھیوں کے مانگنے پہ بھی کسی کو نہ دی۔

ایک مرتبہ ۲۰۰۹ء میں مجاہدین نے وانا میں موجود پاکستانی فوج کے مرکزی کیمپ پہ بی ایم کاروائی کی ترتیب بنائی۔ اس کاروائی میں عبد الاحد بھی شریک تھے۔ مجاہدین نے طے شدہ پروگرام کے مطابق صبح سات بجے میزائل فائر کیے، جو اللہ کی تائید و نصرت سے سیدھے کیمپ کے اندر جالگے۔ اس کاروائی میں منافقین پاکستان کا اچھا خاصہ جانی نقصان ہوا۔ مجاہدین دشمن کی جوابی کاروائی سے بھی دشمن کے نقصان کا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ جب دشمن کا بالکل نقصان نہ ہو تو وہ جوابی تین، چار مارٹر فائر کر کے خاموش ہو جاتا ہے، اگر اس کو ہلکا نقصان ہو یعنی ایک دو فوجی مردار ہو جائیں یا زخمی ہو جائیں، پھر دشمن ایک دو گھنٹے تک بمباری کرتا رہتا ہے، مگر اس دن دشمن کو ایسی چوٹ لگی کہ صبح سے لیکر سہہ پہر چار بجے تک دشمن پاگلوں کی طرح مارٹر فائر کرتا رہا۔ الحمد اللہ مجاہدین بخیر و عافیت اپنے مرکز پہنچ کر ان مارٹر کی آوازوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

۲۰۱۰ء کا ایک واقعہ بھی عبد الاحد بھائی کی شجاعت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ تنظیم القاعدہ کے مجاہدین نے جنوبی وزیرستان کے علاقے اسپین رغزی کی طرف کفر کے ہر اول دستے کا کردار ادا کرنے والی فوج کے خلاف ایک کاروائی ترتیب دی۔ اس کاروائی میں مجاہدین نے دشمن پہ بی ایم اور ہشاد دو سے فائر کرنے کے ساتھ ساتھ راکٹ بھی داغنے تھے۔ مجاہدین نے جنگ کا آغاز بی ایم فائر

کرنے سے کیا۔ بی ایم فائر ہوتے ہی مجاہدین نے دشمن پہ ہشتاد دو اور راکٹ کے فائر شروع کر دیے، مگر جلد ہی دشمن کو مجاہدین کی سمت کا اندازہ ہو گیا۔ دشمن نے مجاہدین پہ اندھا دھن جوابی حملہ شروع کر دیا، جس میں مارٹر کی گولہ باری کے علاوہ دوشکہ (اینٹی ایئر کرافٹ ہیوی مشین گن) کا خوب استعمال کیا۔ جواب اتنا شدید تھا کہ مجاہدین نے کاروائی کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا، مگر مسئلہ یہ درپیش تھا کہ ہشتاد دو وہاں سے اٹھا کر لانا تھا۔ فائز بھائی نے ساتھیوں سے کہا آپ لوگ گاڑی کی طرف جائیں میں ہشتاد دو اٹھا کر لاتا ہوں، تو عبد الاحد کھڑے ہوئے، کہنے لگے امیر صاحب میں لیکر آؤں گا۔ امیر صاحب نے منع کیا کہ آپ چھوٹے ہیں آپ مت جائیں، مگر عبد الاحد شہید کہنے لگے امیر صاحب جس گولی پہ میرا نام لکھا ہے وہ مجھے ہی ملے گی اور گولیوں کی بارش میں چریکی چال (کمانڈو چال) چلتے ہوئے ہشتاد دو اٹھایا اور اس میں ایک گولہ ڈال کر دشمن پہ فائر کیا اور خود ہشتاد دو لیکر پیچھے گاڑی تک آ گئے۔ یہ واقعہ مجھے خود کماندان فائز بھائی (قاری شاہد شہید ﷫) نے سنایا جو اس کارروائی کے امیر تھے۔ عبد الاحد بھائی نے امریکا کی اتحادی پاکستانی فوج پہ کئی ایک مائن کاروائیاں بھی کی جن میں بیسیوں عدو اللہ واصل جہنم اور زخمی ہوئے۔

عبد الاحد بھائی ۲۰۱۰ء میں ارض خراسان ہی میں رشتہ ازدواج میں جڑ گئے تھے۔ اگرچہ شادی کے بعد گھریلو مصروفیات کے ساتھ دیگر جہادی کاموں میں سستی آ جاتی ہے، مگر عبد الاحد نے امرائے جہاد کی طرف سے دی جانے والی ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے نبھایا۔ حتیٰ کہ امراء نے انہیں یہ ذمہ داری دی کہ وہ خراسان سے ساتھیوں کو پاکستان پہنچائیں اور پاکستان سے ساتھیوں اور مجاہدین فیملیوں کو لیکر آئیں۔ یہ کام اپنی نوعیت کی وجہ سے سخت اور مشکل کام تھا کیونکہ اُن دنوں حالات کافی سخت تھے۔ پاکستان میں جہادی عملیات اپنے عروج پہ ہونے کی وجہ سے دشمن بھی چوکنا تھا اور ہر آئے دن ساتھیوں کی گرفتاری کی وجہ سے راستے کشف (ایکسپوز) ہو جاتے تھے۔ نئے راستے تلاش کرنا، راستوں میں انصار بنانا اور ان راستوں سے ساتھیوں کو ارضِ جہاد و رباط پہنچانا کوئی سہل کام نہ تھا۔ مگر ہمارے بھائی عبد الاحد نے اللہ کی تائید و نصرت سے یہ مسئولیت بخوبی انجام دی۔

اک مجاہد کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ وہ رتبۂ شہادت پا کر کامیاب و کامران ہو جائے۔ اسی جام کو ہونٹوں سے لگانے کے لیے دن رات جنگ کے میدانوں کی خاک چھانتا ہے۔ اس کی ساری بھاگ دوڑ کا مقصد دو میں سے ایک کامیابی پانا ہوتا ہے کہ معرکہ خیر و شر میں اللہ کا کلمہ غالب آ جائے اور زمین سے فتنہ نابود ہو جائے یا وہ اپنے جسم پہ زخموں کے نقش و نگار سجا کر بارگاہِ حق میں جا پہنچے جس کے پاس ہر ایک نے حاضر ہونا ہے۔ عبد الاحد بھائی اپنی قیمتی زندگی کے ماہ و سال اللہ عزوجل کی عبادت میں صرف کرتے ہوئے موت کو لبیک کہتے رہے۔

عبد الاحد بھائی سال ۲۰۱۵ء میں اپنے دیگر تین ساتھیوں کے ساتھ ایک جہادی تشکیل پہ روانہ تھے کئی دن کا سفر طے کرنے کے بعد جب آپ قندھار پہنچے تو رات آپ ایک جگہ آرام کے لیے رکے۔ رات کی تاریکی میں بزدل امریکیوں نے چھاپہ مارا اور آپ لوگوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ نے کچھ اور ہی آپ کے مقدر کر رکھا تھا۔ رات گئے طیاروں کی آواز سن کر آپ سب بیدار ہو گئے اور فوراً سب نے اسلحہ پہنا اور چاروں ساتھی مختلف سمتوں میں پھیل گئے۔ عبد الاحد بھائی بھی فوراً ایک درخت پہ چڑھ گئے اور اپنی چادر سے اپنے آپ کو باندھ کر دشمن کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ ہی لمحے بعد جنگ شروع ہوئی امریکی آگے بڑھتے بڑھتے جب ان کے اسلحے کی زد میں آ گئے تو آپ نے اپنی کلاشن کا برسٹ کھول دیا، جس سے کئی ایک امریکی و افغانی کمانڈوز مین پہ ڈھیر ہو گئے، باقی اس اچانک آفت سے بوکھلا کر دائیں بائیں بھاگتے ہوئے اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے۔ عبد الاحد بھائی نے چن چن کر کئی ایک امریکیوں کو واصل جہنم کیا مگر جلد ہی آپ کی جگہ کشف ہو گئی تو بزدل بھیڑیئے نے فضا میں دندناتے طیاروں کو سگنل دیے تو فضا دھماکوں سے گونجنے لگی اور عبد الاحد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور خیبر پختون خواہ کا یہ روشن ستارہ قندھار کی خاک اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے سو گیا۔

اے اللہ تو عبد الاحد سمیت سب شہداء کی شہادتوں کو قبول فرما۔ ان کے درجات بلند فرما۔ ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطاء فرما۔ آمین یارب العالمین۔

'نوائے غزوۂ ہند' کے سوشل میڈیا اکاؤنٹس

تمام معزز قارئین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ 'نوائے غزوۂ ہند' کے 'سوشل میڈیا اکاؤنٹس' توزیعی مقاصد (propagation) کے لیے ہیں۔ ان اکاؤنٹس کو 'نوائے غزوۂ ہند' کی مجلس ادارت یا مدیر سے رابطے کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

'نوائے غزوۂ ہند' سے رابطے کے لیے مجلّے کے تازہ ترین شمارے میں درج مجلس ادارت یا مدیر کے 'ای میل ایڈریس' کو استعمال کیا جائے۔

شکریہ، جزاکم اللہ خیراً کثیراً
(مجلس ادارت 'نوائے غزوۂ ہند')

سحر ہونے کو ہے

بنتِ طبیب

صحن میں ایک ڈبل کیبن مزدا کھڑی تھی۔ عبادہ سامان گاڑی کی پیچھے والی باڈی پر لوڈ کرنے لگا اور نور خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ ایک صندوق کو گاڑی پر چڑھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ نور اس کی دھینگا مشتی دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دی۔

"میڈم! اگر آپ میرا تماشہ دیکھنے سے فارغ ہو گئی ہیں تو میری ذرا سی مدد کریں!" عبادہ نے ہلکا سا چہرہ موڑا اور جتنا صندوق اندر گیا تھا وہ بھی باہر آ گیا۔

"میں؟" نور نے مصنوعی اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔

"تو اور کیا؟۔۔۔ اور کس لیے باہر آئی تھی؟" عبادہ صندوق کو چھوڑ کر واپس مڑا اور قریب پڑے بستر اندر رکھنے لگا۔

"میں تو تماشہ دیکھنے آئی تھی!۔۔۔ کبھی شفٹنگ ہوتے نہیں دیکھی میں نے!" وہ شرارت سے مسکرا دی تو عبادہ صرف ایک ناراض سی نگاہ ہی اس پر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔

نور دھیرے سے آگے بڑھی اور صندوق کا جائزہ لینے لگی۔ عبادہ اب کچن کا سامان لوڈ کر رہا تھا۔

"اس میں کیا ہے؟" نور نے صندوق کا ڈھکن اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ بند تھا۔

"کتابیں ہیں!" عبادہ نے نور کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا گویا کہہ رہا ہو اس وقت ایسے بونگے سوال کی کیا تک۔

"تو پھر کتابیں نکال لیتے ہیں۔۔۔ آپ صندوق خالی کر کے چڑھا لیں! پھر کتابیں رکھ لیں گے!" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

عبادہ کا کام کرتا ہاتھ یک دم رک گیا اور وہ نور کو دیکھنے لگا۔

"احمق!"

"کون؟" نور نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اور کون! اتنی دیر سے کوشش کر رہا ہوں، خیال ہی نہ آیا!"

وہ یہ کہہ کر گاڑی سے نیچے اترا اور صندوق کا تالا کھول کر کتابیں باہر نکالنے لگا۔

"یہ چھوڑیں! آپ باقی چیزیں لوڈ کریں، میں اتنی دیر میں یہ خالی کرتی ہوں۔"

ایک منٹ کے اندر اندر صندوق خالی ہو گیا اور عبادہ نے صندوق اوپر چڑھا دیا۔ نور ایک ایک کر کے اس کو کتابیں پکڑانے لگی۔

"نور! تم جویریہ کی باتوں کا برا نہ منایا کرو۔۔۔ وہ ایسے ہی بولتی رہتی ہے!" کتابیں صندوق میں ڈالتے ہوئے وہ سرسری سے انداز میں بولا۔

"عبادہ! مجھے تو اس کی کوئی بات بری نہیں لگی!۔۔۔ وہ بیچاری اتنی مشکل زندگی گزار رہی ہے۔ اگر چھوٹی موٹی بات پر روٹھ جاتی ہے تو ہمیں برداشت سے کام لینا چاہیے!" وہ بھی اسی طرح بولی۔ عبادہ نے سر ہلا دیا اور کچھ سوچنے لگا۔

"نور!۔۔۔ کیا تمہیں پتہ ہے۔۔۔ ہمارا جو یہ راستہ ہے۔۔۔ کانٹوں سے پُر ہے، اس راہ میں گہری کھائیاں بھی ہیں اور پُر خطر پیچ کھاتے موڑ بھی!۔۔۔ مگر کامیاب ڈرائیور وہ ہے جو ان سب رکاوٹوں کو عبور کر تا اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے!" وہ دھیرے سے بولا تو نور نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ عبادہ کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔

"ہماری اس دعوت کی اس وقت پوری کی پوری دنیا دشمن ہے!۔۔۔ حتیٰ کہ سیدھے سادھے مسلمان بھی جو حقیقت میں جہاد اور مجاہدین سے بے حد محبت کرتے ہیں، میڈیا کی چرب زبانی کی وجہ سے ہمیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں!۔۔۔ جھوٹ بول بول کر مجاہدین کو محسنانِ امت کے رتبے سے گرا کر ہمیں وحشی درندہ ہی بنا دیا ہے۔۔۔ حالانکہ اگر حق وہ ہوتا جو میڈیا پیش کرتا ہے تو پھر اس کو جھوٹ کا سہارا لینے کی ضرورت ہی نہ پڑتی!۔۔۔ ان کو معلوم ہے کہ اگر عوام کو صحیح بات معلوم ہو گئی تو وہ مجاہدین سے محبت کرنے لگے گی" عبادہ نے چہرہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ نور اسی کو دیکھ رہی تھی۔

"ہم تو انہی کی عزتیں محفوظ کرنے نکلے تھے۔۔۔ ہم تو انہی کی جان، مال، دین و ایمان کی حفاظت کے لیے نکلے تھے۔۔۔ مگر میڈیا۔۔۔" وہ ایک منٹ کو سانس لینے کو رکا، "میڈیا تو مکمل طور پر کفار کے ہاتھ میں ہے اور بدقسمتی یہ کہ مسلمان اس پر اس طرح ایمان لاتے ہیں گویا وہ کوئی وحی الٰہیہ ہو!۔۔۔"

وہ اب گاڑی پر رسی باندھنے لگا تھا۔

"یہاں سے رسی کو پکڑو!"

نور نے آگے بڑھ کر رسی کا سرا پکڑ لیا۔ عبادہ رسی کو بل دینے لگا۔

"اپنے اور پرائے سب ہمارے دشمن بن چکے ہیں۔۔۔ ہماری ہر اچھی چیز ہر اچھی کارروائی کو چھپایا جاتا ہے اور جو بھی ناسمجھی کی وجہ سے کوئی غلط حرکت ہو جاتی ہے اس کو ایسے اچھالا جاتا ہے جیسے جہاد صرف قاتل، ڈاکو اور کفار کے ایجنٹ کر رہے ہیں۔ جیسے خلافت کا نعرہ تو ظلم و ستم برپا کرنے کا نعرہ ہو۔۔۔ ہمارا کوئی بیان ٹی وی پر نہیں چلایا جاتا۔ حتیٰ کہ جس چیز کی ہم مذمت بھی کر دیں اس کو عوام کے سامنے پیش نہیں کیا جاتا!۔۔۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں۔۔۔ تم بھی تو ہمیں ایسا ہی سمجھتی تھی ناں۔۔۔ وحشی درندہ؟"

وہ اتنا اچانک نور کی جانب مڑا کہ وہ گڑبڑا ہی گئی۔

"جی!۔۔۔ دہشت گرد!" وہ ہلکا سا بولی۔

"کفر نے نام بھی کتنا خوبصورت رکھا ہے جو کہ عین قرآن کے مطابق ہے!" عبادہ مسکرایا اور گاڑی سے نیچے کود گیا۔ "اللہ تعالیٰ بھی تو ہمیں یہی کہتے ہیں!"

"کیا مطلب؟"

"کسی اور دن ان شاء اللہ!۔۔۔ تم ماما سے کہو کہ آجائیں!" وہ کہتا ہوا گاڑی کا فرنٹ دروازہ کھول کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نور کچھ دیر حیرت سے اس کو دیکھتی رہی پھر گھر کے اندر چلی گئی۔

☆☆☆☆☆

رات کی تاریکی میں گاڑی خطرناک سپیڈ سے آگے بڑھ رہی تھی۔ عبادہ اور ابو بکر فرنٹ سیٹ پر ہاتھوں میں کلاشن کوفیں تھامے بالکل الرٹ بیٹھے تھے۔

پیچھے کی سیٹ پر نور، جویریہ اور امینہ خالہ بیٹھی تھیں۔ خوف کے باوجود امینہ خالہ اونگھ رہی تھیں۔ ذرا زور کا جھٹکا پڑنے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھتیں مگر پھر دوبارہ نیند میں چلی جاتیں۔ نور کا خوف کے مارے خون خشک ہو رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کو ذرا بھی نیند نہ آ رہی تھی۔ روڈ کافی خراب اور ٹوٹی پھوٹی سی تھی۔ ہلکے ہلکے جھٹکوں کے سبب کبھی اس کا سر کھڑکی سے ٹکراتا تو کبھی امینہ خالہ سے۔

اچانک عبادہ نے گاڑی روک دی اور لائیٹیں بھی بند کر دیں۔ وہ سب جھٹکے کی شدت سے ہڑبڑا گئے۔

"ابو بکر! اتر کر دیکھو آگے فوج تو نہیں۔۔۔ ٹارچ آن نہ کرنا!"

ابو بکر کلاشن کوف ہاتھ میں تھامے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ دروازہ کھلنے کے سبب ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ نور کو جھرجھری سی آگئی۔

ابو بکر لائٹ بند کر کے کہیں اندھیرے میں گم ہو گیا۔ نور کی نظریں اندھیرے کے باوجود آخر تک اس کا تعقب کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔

کافی دیر گزر گئی مگر ابو بکر واپس نہ آیا۔ عبادہ بھی بے چین ہونے لگا۔

"ابو بکر ابھی تک نہیں آیا۔۔۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

آخر کافی دیر انتظار کے بعد اندھیرے میں ایک سایہ گاڑی کی طرف بڑھتا ہوا نظر آیا۔ عبادہ کی گرفت بے اختیار اپنی کلاشن پر مزید مضبوط ہو گئی۔ سائے نے دروازے کے قریب آکر گاڑی کا دروازہ کھولا۔

"السلام علیکم!" وہ ابو بکر ہی تھا۔

"وعلیکم السلام!"

"فوج تو ہے۔۔۔ اگر تم بائیں والے راستے کی طرف سے لو تو فوج ہمیں دیکھ نہیں سکے گی البتہ۔۔۔ دو منٹ کا راستہ ہو گا جس میں تمہیں بہت تیزی سے گزرنا پڑے گا۔۔۔ فوج کا کیمپ نظر آئے گا!"

"اچھا ٹھیک ہے!" عبادہ دھیرے سے بولا اور گاڑی لائٹ آن کیے بغیر احتیاط سے چلانے لگا۔

سب کے لب تیز تیز ہلنے لگے!

نور بے ساختہ آگے ہو کر بیٹھ گئی۔ اچانک فوج کا کیمپ نظر آیا اور عبادہ نے سپیڈ بڑھا دی۔ وہ سب بری طرح ہچکولے کھانے لگے۔ نور کا دل بری طرح دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ وہ رات کی تاریکی میں خوفزدہ نظروں سے باہر دیکھنے لگی۔

پانچ منٹ کی خطرناک ڈرائیونگ کے بعد عبادہ نے گاڑی آہستہ کر لی مگر لائیٹیں ابھی بھی نہ جلائیں تھیں۔

"اب ان شاء اللہ آگے خطرہ نہیں ہے!" وہ دھیرے سے بولا۔

"ان شاء اللہ!" ان سب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

☆☆☆☆☆

نیا گھر پہلے سے بہتر تھا۔ اس میں درمیانے سائز کے چار کمرے تھے۔ اوپر کی منزل پر تین کمرے تھے جن میں سے ایک تو ابو بکر اور دوسرا نور اور عبادہ کے لیے مختص تھا۔ تیسرا کمرہ خالی پڑا تھا۔ نیچے کچن اور بیٹھک کے علاوہ صرف ایک کمرہ تھا۔ کچن قریب ہونے کی وجہ سے امینہ خالہ نے اپنے اور جویریہ کے لیے نیچے والا کمرہ مناسب سمجھا۔

گھر پہنچتے ہی امینہ خالہ اور نور نے گھر سیٹ کرنا شروع کر دیا۔ عبادہ اور ابو بکر سامان گاڑی سے اتارنے لگے۔ امینہ خالہ نے یا شاید عبادہ نے گھر بہت سادہ سا رکھوایا تھا۔ گھر میں بس گنتی کا ہی سامان تھا۔ قیامت والے دن دنیا میں جتنا کم سامان ہو گا اتنا ہی آسان حساب ہو گا۔ بس چند بستر، اپنی اپنی ضرورت کی چند چیزیں اور کچن کے کچھ برتن وغیرہ تھے۔ فرج فریزر تو ایسے ہی بے کار پڑے تھے کیونکہ لائٹ تو عرصے سے نہ تھی۔ جو علاقے کیمپوں کے قریب ہوتے وہاں تو بجلی پھر بھی آ جاتی۔ لوگ کنڈے ڈال کر بجلی چوری کر لیتے تھے۔ مگر عبادہ کی قسمت میں شاید کسی قسم کی آسائش نہ لکھی تھی۔ اور اب نور کی قسمت بھی یہی تھی! جس پر اب وہ بہت مطمئن تھی۔

اس نے اپنے کمرے میں بس دو گدے بچھا کر اس پر چادر بچھا دی۔ ایک سائڈ پر عبادہ اپنے لیپ ٹاپ کے لیے میز اور کرسی سیٹ کر رہا تھا۔ سفری بیگوں سے سارا سامان خالی کیا اور الماری میں سیٹ کر دیا۔ امینہ خالہ تو شاید کچن میں کچھ پکا رہی تھیں۔ پورے گھر میں ہی بھینی بھینی سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

''ماما کیا بنا رہی ہیں؟'' عبادہ نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''شاید پلاؤ بنا رہی ہیں۔۔۔ خالہ کا پلاؤ بڑے مزے کا ہوتا ہے ناں!'' وہ کمرہ سیٹ کرنے کے بعد پیچھے ہو کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ ''اوہ میں جاتی ہوں خالہ کی مدد کرنے!''

اس کو اچانک خیال آیا اور کمرے سے نکل گئی۔ عبادہ اپنا اسلحہ سنبھالنے لگا۔

☆☆☆☆☆

تاریکی! اندھیرا! خوف! بے بسی! نیند! اس کے علاوہ اس کو کچھ محسوس نہ ہو رہا تھا۔ درد سے جسم کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ گھٹنوں پر پڑتی مسلسل ضرب کے باعث وہ کھڑا بھی نہ ہو پا رہا تھا مگر پھر بھی پچھلے دس گھنٹوں سے کھڑا رہنے پر مجبور تھا۔ نیند اس کی آنکھوں کو بوجھل کیے ہوئے تھی مگر سونے کی بھی اجازت نہ تھی۔ وہ پچھلے تین دن سے ایک منٹ کے لیے بھی نہ سویا تھا۔ نیند سے آنکھیں بند ہونے لگتیں تو ایک تیز چابک اس کا مزاج پوچھنے کو تیار کھڑا ہوتا۔

''یا اللہ!'' مصعب کے منہ سے بے ساختہ ایک سسکی نکلی۔

''تم یوں ہی اپنی زندگی تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو!۔۔۔ جبکہ تمہارا ساتھی عقلمند ثابت ہوا ہے۔ اس نے ہمیں بتا دیا ہے کہ ابراہیم کہاں ہوتا ہے!''

ایک افسر جو کافی دیر سے اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہا تھا، بولا تو مصعب بے ساختہ مسکرا دیا۔

''اگر بتا دیا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''صرف کنفرم کرنا چاہ رہا ہوں کہ آیا اس نے جھوٹ بولا ہے یا سچ!''

''مگر میں کہہ تو رہا ہوں ہمیں کیسے پتہ ہو سکتا ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔۔۔'' مصعب بے بسی سے پہلو بدل کر بولا۔ ''ہم تو نئے کارکن تھے۔۔۔ ہمیں کیا پتہ؟''

''دیکھو بکواس مت کرو! بالکل سچ اگلو!۔۔۔'' وہ افسر سانپ کی طرح پھنکارا۔ ''مجھے پتہ ہے کہ وہ تمہارا کزن ہے، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہیں نہ پتہ ہو؟''

مصعب کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ افسر سے بھی اس کی حالت چھپی نہ رہ سکی۔

''مگر پچھلے دو تین سال سے ان کی ہم سے ناراضگی چل رہی تھی۔۔۔'' وہ دھیرے سے بولا۔

''بکواس مت کرو!۔۔۔ تم لوگ اس کے ساتھ ساتھ ہوتے تھے! بتاؤ کہاں رہتا ہے وہ!''

ایک اور چابک اس کے ٹخنوں پر پڑا، وہ بلبلا اٹھا۔

''اس کے گھر کا تو کسی کو بھی نہیں پتہ ہوتا۔۔۔ وہ تو ویسے ہی گھر بدلتا رہتا ہے!'' وہ درد سے دہرا ہوتے ہوئے بولا۔

''اس کا مرکز کہاں ہے؟''

''تمہیں بتا تو چکا ہوں!''

''ذلیل! وہ تو خالی پڑا ہے!۔۔۔ تمہیں پتہ تھا کہ وہ وہاں سے شفٹ کر چکا ہے اس لیے ہمیں وہ جگہ بتائی تھی۔۔۔'' افسر غصے سے باؤلا ہو رہا تھا۔

''مجھے کیا پتہ؟ میری گرفتاری سے پہلے تو وہ وہیں ہوتا تھا!'' مصعب جانتا تھا کہ اس کی گرفتاری کے ساتھ ہی عبادہ وہاں سے شفٹ ہو گیا ہو گا مگر وہ ظاہر نہیں کر سکتا تھا۔

افسر نے آگے بڑھ کر قریب پڑا ایک پلگ اٹھایا اور اس کے کان پر لگا دیا۔ پھر دوسرا پلگ اٹھا کر اس کی انگلی پر لگا دیا۔ مصعب کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ وہ اس پلگ کو بخوبی پہچانتا تھا۔

''اس سے پہلے کہ تمہیں میں کرنٹ لگاؤں۔۔۔ تمہیں آخری موقع دوں گا!''

مصعب خاموش رہا۔ اور اسی لمحے اس کو اپنی زندگی کی بدترین اذیت سہنی پڑی۔ جھٹکے کی شدت سے اس کا جسم بری طرح پھڑکنے لگا۔ وہ اتنا نڈھال تھا کہ چاہنے کے باوجود چیخ بھی نہ سکا۔ آخر تکلیف کی شدت سے وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ کسی دوسرے کمرے میں کرسی سے لپٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اس کو وہی افسر نظر آیا۔

''اللہ کے بندے۔۔۔ تم بھی پاکستانی ہو!۔۔۔ میں بھی پاکستانی ہوں!۔۔۔ تم بھی مسلمان ہو۔۔۔ میں بھی مسلمان ہوں!۔۔۔ تم اپنے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں سے کیوں دغا کر رہے ہو؟'' مصعب نحیف سی آواز میں بولا۔

”بکواس ہے یہ سب کچھ! تم لوگوں نے ہمارے وطن کو خطرے میں ڈالا ہوا ہے!۔۔۔ آئے بڑے پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کرنے والے!۔۔۔ امریکہ تو ہماری مدد کو آیا ہے!“ وہ منہ بنا کر بولا۔ ”یہ ڈھکوسلے کسی اور پر آزمانا!۔۔۔ ہم وطن! ہم مذہب!۔۔۔ فوج کا کوئی مذہب نہیں ہوتا!“

وہ تمسخر سے بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”اس کی آنکھیں بند نہ ہونے دینا!۔۔۔ اور اس کو الٹا لٹکا دو! میں دو منٹ میں آتا ہوں۔۔۔ جنرل کو رپورٹ دینی ہے!“ وہ دھیرے سے اپنے ساتھی سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆

سانس لینے کی کوشش میں اس نے ہاتھ پاؤں مارنا چاہے مگر وہ رسیوں میں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ سانس نہ لے سکنے کی وجہ سے اس کے جسم نے اپنے ریفلیکس کے تحت سانس اندر کھینچا تو سارا پانی اس کی ناک اور حلق میں چلا گیا جو پہلے سے بھی زیادہ اذیت ناک تھا۔ تکلیف سے اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ ۱۰ سیکنڈ۔۔۔ ۲۰ سیکنڈ۔۔۔ ۳۰ سیکنڈ اور پھر اس کا منہ پانی سے نکال لیا گیا۔ اس دوران نجانے کتنی بار پانی اس کی ناک اور حلق میں جا چکا تھا۔ وہ نڈھال سا ہو کر کرسی پر ڈھلک گیا۔

”اب بولو!۔۔۔ ورنہ ابھی دوبارہ ڈبکی دیتا ہوں!“

مصعب نڈھال سا اس افسر کو دیکھے گیا۔

”دوبارہ ڈبکی دو۔“ وہ اپنے ماتحتوں کو کہہ کر سائڈ پر ہٹ گیا۔ اس کو کندھے سے پکڑ کر پھر پانی میں ڈبو دیا گیا۔ مصعب کے اندر مزاحمت کی بھی ہمت نہ رہی۔

”یا اللہ! اس دفعہ میں مر ہی جاؤں تو اچھا ہے!“

☆☆☆☆☆

مصعب اپنی کوٹھری میں نڈھال سا پڑا تھا۔ اس کے جسم کا انگ انگ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ بھوک لگ لگ کر اب ختم ہو چکی تھی۔ زندگی کی تمام تر حسیات ختم ہو چکی تھیں۔ اچانک اس کی کوٹھری کی درز سے علی اپنے بے جان جسم کے ساتھ گھسٹتا ہوا نظر آیا۔ اب شاید اس کی تفتیش کی باری تھی۔

ان دونوں کو یہ عذاب سہتے آٹھ ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران علی اس کو یوں ہی دو ایک بار بمشکل ہی کوٹھری کے چھوٹے سے سوراخ سے تفتیش کے لیے لے جاتے ہوئے نظر آیا تھا۔

اچانک اس کی کوٹھری کا دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر آوارد ہوا۔

نووارد کو دیکھ کر وہ دھک سے رہ گیا اور اچانک اس کی تمام حسیات نجانے کہاں سے بیدار ہو گئیں اور وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔

”ارمغان تم؟“

ارمغان بھی شاید اس کو دیکھ کر شاک میں چلا گیا تھا۔

”مصعب! تم؟“

پھر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا اور انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

”مصعب! دیکھو میں تمہارا ہمدرد ہوں!۔۔۔ مجھے جنرل کالن پار کرنے بھیجا ہے جو اس وقت امریکہ کے چیف آف آپریشنز ہیں۔۔۔ تمہیں اس سے اندازہ ہو گا کہ تمہارے کیس کی کتنی اہمیت ہے!۔۔۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ قیدی نمبر ۲۲۲ تم ہو!۔۔۔“ وہ بالکل بدلا ہوا ارمغان لگ رہا تھا۔ اپنے پیشے سے مخلص ارمغان۔ ”دیکھو اگر تم ان لوگوں کے ساتھ کاپریٹ (تعاون) نہیں کرو گے تو یوں ہی سڑ سڑ کر مر جاؤ گے!“

وہ اپنے آپ کو اس کا ہمدرد کہہ رہا تھا مگر اس کی گفتگو سے کہیں سے بھی یہ ظاہر نہ ہو رہا تھا کہ وہ اس سے ہمدردی رکھتا ہے۔ مصعب بے یقینی سے اسے دیکھے گیا۔ نجانے کیوں اس کو دیکھ کر ایک منٹ کو سمجھا تھا کہ وہ اس کو چھڑوانے آیا تھا۔

”ارمغان!“ اتنے عرصے بعد اس کے اندر کا جذباتی انسان جاگا تھا۔ ”نور کہاں ہے؟ ابو بکر ٹھیک ہے؟“

ارمغان کچھ دیر خاموش رہا۔ آخر کچھ دیر کے بعد بولا۔

”میں اس وقت کسی قسم کی ذاتی گفتگو نہیں کرنے آیا!۔۔۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے!“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا، پھر کچھ سوچنے لگا۔ ”ابو بکر مر چکا ہے۔۔۔ اور نور نجانے کہاں غائب ہے۔۔۔ موحد انکل وغیرہ کو بھی نہیں پتہ!“

وہ اس انداز میں بولا گویا یہ بتا کر مصعب پر احسانِ عظیم کیا ہو۔

”دفع ہو جاؤ ارمغان! مجھے کم از کم تم سے یہ امید نہ تھی!“ اس نے پوری قوت سے چلانا چاہا تھا مگر نقاہت کے باعث اس کے منہ سے صرف نفرت میں ڈوبی کمزور سی لرزتی ہوئی آواز نکل سکی۔

”سوچ لو! میں کل پھر آؤں گا!۔۔۔ اگر تم کاپریٹ کرتے ہو تو ہم تمہاری سزا میں تخفیف کر سکتے ہیں۔۔۔ اور تمہاری معلومات پر ڈپینڈ کرتا ہے۔۔۔ شاید یوں تمہیں رہائی بھی مل جائے!“ وہ یہ

کہہ کر کچھ دیر مصعب کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر جواب نہ پا کر واپس مڑ گیا اور کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

مصعب بے بسی سے پھر لیٹ گیا۔

☆☆☆☆☆

حیرت انگیز طور پر جب سے ارمغان اس سے مل کر گیا تھا، اس کے ساتھ رویہ میں یکسر تبدیلی آگئی۔ اس کے ساتھ نرمی برتی جانے لگی۔ کھانے میں بھی اچھی اچھی چیزیں ملنے لگیں۔ بستر بھی دے دیا گیا اور مصلیٰ اور قرآن بھی مل گیا۔ وضو کے لیے پانی بھی دیا جانے لگا اور روزانہ نہانے کی اجازت مل گئی حالانکہ اس سے پچھلے چھ ماہ میں صرف تین دفعہ نہانے کی اجازت دی گئی تھی۔

ارمغان اپنے وعدے کے مطابق اگلے دن تو نہ آیا۔ البتہ دو ہفتے تک اس کے ساتھ عنایتیں کی جاتی رہیں۔ دو ہفتے بعد ارمغان پھر آگیا۔

''ارمغان!۔۔۔ بند کرو اپنی پیچ حرکتیں!۔۔۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو ان آسانیوں کے بدلے میں تم پر اعتماد کرنے لگوں گا!۔۔۔ میں تمہاری طرح پیسوں کے عوض بکنے والا نہیں!'' ارمغان کی توقع کے برخلاف اس کے اندر قدم رکھتے ہی مصعب پھٹ پڑا۔ ''میں تم لوگوں کی ایک ایک چال کو جانتا ہوں!''

''احسان فراموش! تمہیں نرمی راس نہیں آئی!''

ارمغان نے اپنے حواس قابو میں رکھنے کی مکمل کوشش کی مگر اس کے لہجے کی لرزش سے مصعب جان گیا تھا کہ اس کے یوں پھٹنے سے وہ متاثر ہوا تھا۔

''میں نے بہت کوشش کر کے تمہارے لیے نرمی کروائی تھی۔۔۔ مگر تم بھی ناں!۔۔۔ بہت ڈھیٹ ہو!'' وہ منہ بنا کر بولا۔ مصعب نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

ارمغان پیر پٹختا باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆

دن یوں ہی اذیت میں گزرنے لگے۔ اس دن کے بعد سے پھر اس پر سختی شروع ہوگئی۔ کھانے میں وہی باسی اکڑی ہوئی روٹی اور ساتھ میں پیاز ٹماٹر کی یخنی جس میں نمک تک نہ ہوتا اور نجانے کیا گند مند تیر رہا ہوتا۔ نہانے دھونے کی سہولت بھی چھین لی گئی۔ وضو کا پانی اور مصلیٰ بھی واپس لے لیا گیا البتہ قرآن اس کے پاس ہی رہ گیا۔

جنرل کالن پارکر نے چیف آف آپریشنز کے عہدے پر آتے ہی بذاتِ خود اس جیل پر نظر کرم ڈالنی شروع کر دی۔ شاید یہ جیل ان کے لیے کافی اہمیت رکھتی تھی۔ جنرل پارکر کے عہدہ سنبھالتے ہی قیدیوں پر نئی آفت ٹوٹ پڑی اور نئے سرے سے مظالم اور اذیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تفتیش کا شعبہ بھی اس نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اور جیل کے حالات اور نئے قیدیوں کی آمد سے یہ پتہ چلتا تھا کہ گرفتاریوں اور چھاپوں کا سلسلہ بھی اس کی تقرری کے ساتھ ہی بڑھ گیا تھا۔

سب اذیتیں، تکالیف جھیلنا ان کے لیے پھر بھی ممکن تھا مگر جیل کی فضاؤں میں گونجتی نسوانی چیخوں نے ان کی راتوں کی نیندیں تک اڑا دی تھیں۔ جب جیل میں نسوانی چیخیں سنائی دی جاتیں تو سب قیدی اپنی اپنی تکلیفیں بھلا کر کوٹھری کے دروازے زور زور سے بجانے لگتے اور چیختے چلاتے کہ ہم پر جتنا ظلم کرنا ہے کر لو! مگر ہماری بہنوں کو کچھ نہ کہو! اور اسی کی خاطر انہوں نے کئی بار بھوک ہڑتال بھی کی۔

پچھلے پندرہ دن سے مصعب کے برابر والی کوٹھری میں بھی ایک خاتون اپنی دو سالہ اور تین سالہ بیٹیوں کے ساتھ قید تھیں، جو غالباً خود کسی مجاہد کی بیوی تھیں۔ ماں کو تفتیش کے لیے لے جایا جاتا اور بارہ بارہ گھنٹے اس کی دونوں بچیاں رو رو کر ہلکان ہو جاتیں۔ جیل کے عملے میں سے کوئی آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہ دیکھتا۔ وہ رو رو کر نڈھال ہو جاتیں تو ان کی ماں کو ان کے پاس لا کر پٹخ دیا جاتا۔

جتنی دیر وہ دونوں بچیاں روتی رہتیں، تمام قیدی بے چینی سے جیل کے چوکیداروں کو پکارتے رہتے مگر کوئی دادرسی نہ ہوتی۔ مصعب تو ان کی ہر سسکی کے ساتھ خود بھی سسک جاتا۔ اس کا دل کٹا جاتا تھا اور وہ ان کے ساتھ ساتھ آنسو بہاتا رہتا۔

ان کی بے بسی پر! ان کی ماں کی بے بسی پر! اپنی بے بسی پر!

☆☆☆☆☆

وہ اس دیوار کی لکیریں گن گن کر تھک چکا تھا۔ وہ چھت پر اکھڑے ہوئے پلستر کے بل بھی بارہا گن چکا تھا۔ کمرہ نیم تاریک تھا۔ اس کی قید تنہائی ابھی تک ختم نہیں کی گئی تھی۔ البتہ اس کے ساتھ والی کوٹھری سے وہ ماں بیٹیاں جا چکی تھیں۔

کوٹھری کے دروازے میں ایک چھوٹا سا درز نما سوراخ تھا۔ جس سے کھانا اندر پھینکا جاتا تھا۔ وہ اسی کے ذریعے اپنے قیدی ساتھیوں سے بات چیت کر لیتا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ باہر کی راہداری میں ایک پیلا سا بلب جل رہا تھا۔ جس کی ہلکی ہلکی روشنی اس کی کوٹھری میں بھی آ رہی تھی۔ جیل میں ہُو کا عالم تھا۔ عید کے دن تھے اس لیے پہرے میں بھی کافی سستی نظر آ رہی تھی۔ رات کے خوفناک سناٹے میں کبھی کبھی کوئی خوبصورت سی تلاوت کی آواز آ جاتی۔ شاید کوئی ساتھی نالۂ نیم شب میں مصروف تھا۔

اچانک کمرے میں بالکل تاریکی چھاگئی۔ مصعب نے حیرت سے روشنی کے واحد ذریعہ دروازے کے سوراخ کی طرف دیکھا۔ وہاں کسی انسان کا سایہ نظر آرہا تھا۔ کوئی اس کے پاس آرہا تھا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اس وقت کون آرہا تھا۔ تفتیش کا سلسلہ تو اب کچھ عرصے سے بند ہو گیا تھا۔ اب اس وقت کون آیا تھا؟

کوٹھری کا دروازہ کھلا اور وہ سایہ اندر داخل ہوا۔ کمرے میں پھر ہلکی سی روشنی آگئی۔

''مصعب! جلدی سے میری بات سنو!'' آنے والا دھیمی سی آواز میں بولا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی مصعب کا چہرہ سخت ہو گیا۔

''کیا ہے ارمغان؟'' وہ سرد لہجے میں بولا۔

''مصعب! مصعب! میری بات سنو! پلیز میری بات کا یقین کرو!'' وہ نجانے کیوں اچانک مچل گیا۔ ''تم میرا یقین نہیں کرو گے مگر۔۔۔ ان لوگوں کو نور کی عبادہ سے شادی کا پتہ چل گیا ہے!۔۔۔ اور اب وہ نور کو گرفتار کر کے ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ عبادہ کو بھی پھنسانا ہے اور تم سے اور علی سے بھی نمٹنا ہے!''

مصعب کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ اچھل کر ارمغان پر جھپٹا اور اس کو گریبان سے پکڑ لیا۔

''تمہیں کیسے پتہ ہے؟ نور کہاں ہے؟''

ارمغان نے اس کو اپنے سے پیچھے کیا اور اس کے مزید قریب ہو گیا۔

''دیکھو مصعب! میں تمہیں یہاں سے بھگانا چاہتا ہوں۔۔۔ آج میں اکیلا ہی ڈیوٹی پر ہوں۔۔۔ باقی افسر تو نشے میں دھت پڑے ہیں۔۔۔ میں پہلے ہی یہاں کے حالات کی وجہ سے بہت ڈسٹرب ہوں!'' وہ سرگوشی کے عالم میں بولا۔ ''مصعب! میرا یقین کرو، یہ لوگ عبادہ اور نور کو پکڑنے کی اَن تھک کوششیں کر رہے ہیں!۔۔۔ تم مجھے کسی بھی مجاہد کا پتہ بتاؤ۔۔۔ میں ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں!''

اس کی بات سن کر مصعب کو خون کھول گیا۔ یکایک اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے۔

''خبیث انسان!۔۔۔ یہ بھی تمہاری چال تھی!۔۔۔ مجھے جذباتی کر کے اپنا فائدہ نکلوانا چاہتے ہو!''

''نہیں مصعب نہیں!۔۔۔ اگر ایسی بات ہوتی تو میں دن میں تمہارے پاس آتا۔۔۔ یوں آدھی رات میں چوری چھپے نہ آتا۔۔۔ میرا یقین کرو۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔۔۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں!۔۔۔''

''ارمغان بکواس بند کرو! اور دفع ہو جاؤ!'' مصعب غصے سے بولا۔ ''میں تمہاری بات کا کیسے یقین کر لوں؟۔۔۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟''

''مصعب تمہیں مجھ پر تب یقین آئے گا جب نور کو تمہارے سامنے لایا جائے گا!'' وہ بے چارگی سے بولا۔ ''تم میرا یقین کرو پلیز!۔۔۔ اور یہاں سے بھاگ جاؤ!۔۔۔ میرا ضمیر مجھے پہلے ہی بہت کچوکے لگاتا رہتا ہے!''

''دفع ہو جاؤ ارمغان پلیز یہاں سے! میرا دماغ پھٹ رہا ہے! میری جان چھوڑ دو!''

ارمغان کچھ دیر بے بسی سے مصعب کو دیکھے گیا پھر جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور کوٹھری سے باہر نکل گیا اور دروازہ بند کرنا بھول گیا۔

☆☆☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ ہر طرف ہلکا ہلکا اندھیرا چھا گیا تھا۔ چاند کی چودھویں تاریخ تھی اس لیے پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ نیچے کی منزل کے لاؤنج میں شمسی (سولر پینل) سے چارج ہوئی بیٹری کی مدد سے ایک ننھا سا بلب روشن تھا۔ عبادہ دیوار سے ٹیک لگائے لیپ ٹاپ پر کچھ کر رہا تھا۔ نور اور جویریہ کسی کتاب پر جھکی ہوئی تھیں۔ نور اس کو کچھ پڑھ کر سنا رہی تھی۔ امینہ خالہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔ جبکہ ابو بکر اپنے کمرے میں ہی تھا۔

''عبادہ!'' کتاب مکمل ہوتے ہی نور کو اچانک یاد آگیا۔ ''آپ نے اس دن بات مکمل ہی نہیں کی دہشت گردی والی!''

''کیا کہہ رہا تھا؟'' عبادہ نے لیپ ٹاپ پر سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کہہ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ بھی آپ کو دہشت گرد کہتے ہیں!''

''اوہ ہاں!۔۔۔'' عبادہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''دیکھو دہشت گرد کو عربی میں 'ارھابی' اور انگریزی میں 'ٹیررسٹ' کہتے ہیں۔۔۔ بنیادی طور پر دہشت گردی کی اصطلاح بھی مغرب ہی نے متعارف کروائی ہے اور پھر خود ہی اسے موم کا ایسا پتلا بنا دیا ہے کہ جدھر کو چاہیں، اس کو موڑ دیں۔۔۔ اسلام میں نہ صرف یہ کہ ظلم و ستم کے خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہے بلکہ مسلمانوں کو اس بات کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ نظام یعنی شریعت کو نافذ کرنے کے لیے حالات کی مناسبت سے جہاد و قتال بھی اختیار کریں۔۔۔ سینکڑوں آیات میں اس طرح کے احکام کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔۔۔ اسی طرح کی آیات کو لے کر اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ 'جی دیکھیے! اسلام تو دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے!'۔۔۔ معاذ اللہ!'' عبادہ سانس لینے کے لیے رکا۔ نور اور جویریہ خاموشی سے اس کی گفتگو سن رہی تھیں۔ ''اور مسلم دنیا کے حکمرانوں سے مسلسل یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ایسی آیات جن سے دہشت گردی پھیلنے کا خطرہ

ہے، کو اپنے درسی نظام سے نکال دیا جائے اور جن مدارس اور یونیورسٹیوں میں یہ پڑھائی جاتی ہیں، ان پر پابندی لگا دیں۔۔۔ حتیٰ کہ کچھ عرب ممالک میں تو تراویح میں بھی جہادی آیات پڑھنے پر پابندی ہے کیونکہ عوام عربی سمجھتی ہے۔۔۔ حکمرانوں نے سب کچھ کیا۔۔۔ سب مان لیا مگر معاملہ آخری مطالبے پر آکر رک گیا کیونکہ قرآن مجید میں سے ایسی آیات نکالنے کی جرأت کون بدبخت کرے۔۔۔ گویا معاملہ جوں کا توں اسی درجے پر آگیا کہ اسلام میں غلبہ اور حکومت کے لیے جہاد و قتال کا حکم بدستور موجود ہے۔۔۔ دراصل مغرب کو خطرہ ہے کہ اگر مسلمان نوجوانوں میں جہاد کا جذبہ جاگ گیا تو ان کی خیر نہیں اور ان کی بے تاج بادشاہی کو خطرہ ہو جائے گا۔"

"مگر اسلام تو امن و سلامتی کا مذہب ہے؟" نور اچھنبے سے بولی تو عبادہ مسکرا دیا۔

"یہ بھی میڈیا اور بے دین مفکروں کی ہی کارستانی ہے جن کو خود تو دین کا الف بے بھی نہیں پتہ اور۔۔۔ پوری عوام کو اس کے ذریعے گمراہ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ۔۔۔ اسلام تو امن و سلامتی کا دین ہے اور اس میں جنگ و جدال کی کوئی گنجائش ہی نہیں! اسلام کا مطلب ہی سلامتی ہے۔۔۔ تو سب سے پہلی بات اسلام کا لغوی معنی جان لو، اسلام کا معنی ہے 'اپنے آپ کو کسی کے سامنے تسلیم کرنا' یعنی سرینڈر کرنا۔۔ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی۔۔۔ اس کا مصدر اَسلَم ہے یعنی فرمانبرداری۔۔۔ اور رہی دوسری بات کہ اسلام سلامتی کا دین ہے۔۔۔ بے شک اسلام سلامتی کا دین ہے مگر۔۔۔ صرف اس کے لیے جو اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے یا معاہدہ کر کے رہے یا ذمی بنا رہے۔۔۔ ایسے شخص کے لیے ہرگز امن نہیں جو اس کے خلاف ہر وقت محاذ کھڑا رکھے یا جس سے اسلام کی سالمیت کو خطرہ ہو۔۔۔ ہرگز نہیں، ایسے شخص کے لیے اسلام سخت ہے!۔۔۔" عبادہ جوش سے بولا۔

"اچھا!۔۔۔ یہ پوائنٹ۔۔۔ نہیں! یہ نقطہ اچھا ہے!" نور نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

"نور! تم اس کو آسان لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ۔۔۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ دنیا کے ہر ملک کے پاس ایک فوج ہوتی ہے جو اس ملک کی حفاظت پر مامور ہوتی ہے اور ہر ملک کی مضبوطی اور کمزوری کا انحصار اس کی فوج کی طاقت یا کمزوری پر ہوتا ہے۔۔۔ اگر اس وقت دنیا میں کوئی ملک فوج نہ رکھے تو کیا ہو گا؟" اس نے نور کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ظاہر ہے اس کے دشمن اس کو کچا چبا جائیں گے۔۔۔" وہ مسکرائی۔ "اور میرے خیال میں تو سب سے پہلے اس کی عوام ہی اس کو زیر ہونے پر مجبور کر دے گی!"

"یہی میں بھی کہنا چاہ رہا ہوں۔۔۔ تم مجاہدین اور جہاد کو اسلام کا حفاظتی دستہ سمجھ لو جو کہ اسلام اور مسلمانوں کی جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت پر مامور ہے۔۔۔ جہاں کہیں اسلامی نظام یا امت مسلمہ کو کوئی خطرہ ہوا۔۔۔ یہ دستہ اس کی مدد کو پہنچ جاتا ہے۔۔۔ مجاہدین اللہ تعالیٰ کے سپاہی ہیں، اسلام کے سپاہی ہیں، رسول اللہ ﷺ کے سپاہی ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے خود اس عہدے پر فائز کیا ہے۔۔۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ عام فوجیوں کے برعکس اس فوج میں ہر طرح کا مسلمان شامل ہو سکتا ہے جو بھی اس عظیم مقصد کے حصول کی کوشش میں اپنا ہاتھ بٹانا چاہے بٹا سکتا ہے۔۔۔"

"مگر اعتراض تو یہ کیا جاتا ہے کہ ہر مسلم ملک کے پاس فوجیں موجود ہیں تو پھر مجاہدین کو کس نے کہا ہے کہ وہ یہ ٹھیکا لے لیں کہ جہاں بھی مسلمانوں پر ظلم ہو گا، یہ ان کو بچائیں گے۔۔۔" نور نے عرصے پہلے جو اعتراضات سنے تھے، وہ ان کے جوابات چاہتی تھی۔ "یہ میرا اپنا اعتراض نہیں بلکہ سنی سنائی بات بتا رہی ہوں!"

"سب سے پہلی بات تو یہ کہ ملکوں اور بارڈروں کی اس تقسیم کو ہم نہیں مانتے۔۔۔ یہ تو پچھلی صدی میں دنیا کو کیک کی طرح کاٹا گیا اور انڈیپینڈینٹ سٹیٹس (Independent States) کا تصور پیدا ہوا۔۔۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں کو ایک امت قرار دیا ہے۔۔۔ اس لیے ایک مسلمان جو دنیا کے جس مرضی کونے میں رہتا ہو، پر اگر ظلم ہوتا ہے تو ہر مسلمان اس بات کا ذمہ دار ہے کہ وہ اس کی مدد کرے۔۔۔ ایک امت ہونے کی وجہ سے۔۔۔ اور رہی بات مسلم ملکوں کی فوجوں کی؟۔۔۔ تو یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ فوجیں اسلام کی فوجیں نہیں بلکہ اپنے اپنے ملکوں کی فوجیں ہیں۔۔۔ پوری دنیا میں کوئی ایسی فوج بتا دو جو صحیح معنوں میں اسلام کی حفاظت کرتی ہو۔۔۔ بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے اسلام کا مطالبہ کیا ہے، انہیں افواج نے ان کو کچلا ہے۔۔۔ یہ افواج تو دراصل کفار کی تربیت یافتہ اور کلازوٹ جیسے کافر کے نظریات کے مطابق تشکیل ہوئی ہیں۔۔۔ پھر ہم ان سے اسلام کے نفاذ اور مسلم امت کی مدد کی کیسے امید رکھ سکتے ہیں؟"

عبادہ خاموش ہوا تو نور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی بات نور کے دل کو لگی تھی۔

"بھیا! تھوڑا آہستہ بولو۔ ماما سو رہی ہیں!" جویریہ آہستہ آواز میں بولی۔

"دیکھو امریکی جارحیت ابھی رکتی نظر نہیں آتی۔۔۔ امریکہ اس دنیا کا بے تاج بادشاہ بنا ہوا ہے۔ پوری دنیا کے فیصلے اس کے ہاتھ میں ہیں۔۔۔ اسلام کو ہر جگہ دبایا جا رہا ہے۔۔۔ ہر جگہ اس کے تشخص کو بگاڑا جا رہا ہے۔۔۔ حتیٰ کہ مسلم امت میں جہاں کہیں بھی ظلم و ستم ٹوٹا ہے، امریکہ اور یو این او نے اس کی خاموش حمایت کی ہے۔۔۔ اسرائیل ہو یا فرانس۔۔۔ برما ہو یا مشرقی تیمور۔۔۔ شام ہو یا بوسنیا۔۔۔ کشمیر ہو یا چیچنیا۔۔۔ یو این او کی انسانی تنظیم کیا سو رہی ہے؟۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ بلکہ خاموشی سے مسلمانوں کے استحصال کا تماشہ دیکھ رہی ہے۔۔۔ مغرب اسلام کا غلبہ نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ اس کے مفکرین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس وقت پوری دنیا میں اگر کسی کے پاس ان کی تہذیب سے ٹکر لینے کی صلاحیت ہے تو وہ اسلام

ہے!‘‘عبادہ اپنی آواز آہستہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر جوش کی وجہ سے اس کی آواز پورے لاؤنج میں گونج رہی تھی۔

’’آخر کب تک ایسا ہوتا رہے گا؟ سوا ارب مسلمان کب تک حسرت بھری نگاہوں سے ایسے خوفناک مناظر دیکھتے رہیں گے۔۔۔ کب تک بے غیرتی سے اپنے مسلمان بھائیوں، بہنوں اور بچوں کو کفار کے ہاتھوں اذیتیں سہتے دیکھتے رہیں گے؟۔۔۔ ساٹھ کے قریب مسلم ممالک اپنی آزادانہ خود مختار حیثیت، گولہ بارود، بھاری بھرکم افواج اور آلاتِ حرب کے باوجود آخر کب تک خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہیں گے؟ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ عالم اسلام اپنی سیاست ومعیشت، سائنس وٹیکنالوجی، حقوق کے تحفظ اور اپنے دفاع کے لیے غیروں پر انحصار کرنا چھوڑ دے اور اپنا ایک اسلامی عالمی نظام تشکیل دے۔۔۔ یعنی تمام عالم اسلام خلافت کے ایک جھنڈے تلے پھر سے متحد ہو اور کفر کی سازشوں کا منہ توڑ جواب دے، اور اس کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے۔۔۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ جہاد ہے!‘‘

’’مگر کیوں۔۔۔ میرا مطلب ہے کیا جہاد کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں خلافت کے قیام کے لیے؟۔۔۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کب جہاد کے ذریعے اسلام آیا تھا؟‘‘

’’اسلام مسلح جدوجہد کے ذریعہ ہی دنیا میں اپنا مقام بنا سکتا ہے۔۔۔ ایک حدیث میں ہے کہ ’حکمرانوں سے بغاوت مت کرو جب تک ان میں واضح کفر نہ دیکھو جس کا ثبوت تمہارے پاس اللہ کے دین سے صریح ہو‘۔۔۔ سب علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اگر حکمران شریعت کے علاوہ کسی اور طریقہ پر حکومت کرے تو اس کے خلاف جہاد کیا جائے گا یہاں تک کہ یا تو وہ توبہ کر کے واپس شرعی نظام کی طرف آجائے یا اس کو معزول کر دیا جائے۔۔۔ اس وقت بلا مبالغہ پوری دنیا میں کوئی ایک بھی ملک ایسا نہیں جس نے اپنے ملک میں شریعت نافذ کی ہوئی ہو۔۔۔ کچھ ممالک عوام کو خوش کرنے کے لیے بعض جزوی چیزوں میں اسلامی اصول اپنا لیتے ہیں جن سے سادہ لوح عوام بے چاری خوش ہو جاتی ہے۔۔۔ اس وقت تمام کے تمام ممالک یو این او کے زیر نگرانی اس عالمی نظام کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔۔۔ جسے مغرب نے اپنے مفادات کے لیے وضع کیا ہے اور اس کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہے ہیں۔۔۔ لیکن مغرب مسلمانوں کی اتنی فرمانبرداری سے راضی نہیں۔۔۔ بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ مسلمان اپنے اس قیمتی اثاثے ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔۔۔ مغربی اقتصادی ادارے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک وغیرہ بری طرح مسلمانوں کا معاشی استحصال کر رہے ہیں۔۔۔ لیکن اس کے باوجود چور مچائے شور کے مصداق امریکہ مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دے کر ان کو پوری دنیا کی نظروں میں مجرم بنا دے۔۔۔ امریکہ خود تو بزورِ طاقت ہر جگہ اپنا نظام، جمہوریت اور سیکولرازم قائم کرے۔ اس کے لیے خون بھی بہائے، ایٹم بم بھی گرائے۔۔۔ معاشی پابندیاں بھی لگائے!۔۔۔ اس کے لیے سب جائز ہے اور اگر مسلمان اس کی جارحیت کا جواب دیں یا اپنے ہی ملک میں شرعی نظام خلافت قائم کرنا چاہیں تو اسے برداشت نہیں!۔۔۔ آخر یہ اتنا دوُرخا پن کیوں ہے؟۔۔۔ اب بس آخری بات۔۔۔ اس مخفی کوڈ کی اصطلاح کی اصلیت کیا ہے؟۔۔۔ یہ دہشت کس چیز کی؟۔۔۔ دہشت زدہ کون ہو رہا ہے۔۔۔ دنیا کس چیز سے خوفزدہ ہے؟۔۔۔ ارھابیون، دلوں میں خوف بٹھانے والے۔۔۔ یہ کون ہیں؟ اس اصطلاح کو قرآن میں دیکھو۔۔۔ سورۃ الانفال میں اللہ حکم دیتا ہے: تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ‘‘

عبادہ کی اس بات پر نور اچھل کر بیٹھ گئی۔

’’ارھابی کا مطلب دہشت گرد! یعنی ترھبون کا مطلب ان کو دہشت زدہ کرو!۔۔۔ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ کفار کو دہشت زدہ رکھو! واؤ!‘‘ نور خوشی سے بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگی۔ ’’عبادہ! یو آر دی بیسٹ!‘‘

اب وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کو بچوں کی طرح خوش ہوتا دیکھ کر عبادہ بھی بے ساختہ ہنس دیا۔

’’اب یہ اللہ کے دشمن ہم سے خوفزدہ ہونے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں تو کچھ عجب نہیں! مسلمان تو شیر کی طرح ہیں۔۔۔ شیر اگر سدھا بھی لیا جائے، سرکس میں مداری ڈنڈا لیے اس پر سوار ہو۔۔۔ پھر بھی اس کے سٹیج پر آتے ہی مائیں سہم کر اپنے بچوں کو سمیٹ لیتی ہیں!‘‘ عبادہ مسکرا کر بولا تو نور کھلکھلا کر ہنس دی۔ جویریہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

’’توبہ توبہ! تمہاری تقریر ختم ہونے کا گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں۔۔۔ اچھا سامع ملا تو پوری جہاد کی کتاب ہی پڑھا دی!۔۔۔ آجاؤں؟ پردہ ہے؟‘‘ سیڑھیوں پر کھڑا ابو بکر شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ نور جویریہ کو سہارا دے کر کمرے میں لے گئی۔ ابو بکر نیچے لاؤنج میں آ گیا۔

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

آپ کے سوالات

’نوائے غزوۂ ہند‘ سے سوالات پوچھیے۔ اس سلسلے میں قارئین ’نوائے غزوۂ ہند‘ سے سوالات پوچھ سکیں گے جن کے جوابات، ماہانہ شمارے میں شائع کیے جائیں گے۔

اپنے سوالات درجِ ذیل برقی پتے (email) پر ہمیں بھیجیے:

aapkaysawalat@nghmag.com

سُلطانئ جمہور

علی بن منصور

مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی، جب بھی آتی ہے بہت سی اکٹھی نازل ہو جاتی ہیں۔ اور ہمارے گھر میں تو شاید غول در غول آتی ہیں...... وہ گہری سوچ میں گم اباّجی کے بستر کے پاس کرسی بچھائے بیٹھے تھے۔ ان کی نظر کھڑکی کے شیشے کے اس پار گھر کی بیرونی دیوار پر چڑھی گلدار بیلوں پر تھی، جن پر کوئی پھول تو کیا، کلی بھی ڈھونڈے سے نہ ملتی تھی۔ لاہور میں بہار اپنے جوبن پر تھی مگر ان کے گھر سے تو کیا سبزے کی تازگی اور کیا پھولوں کے دھنک رنگ، سب ہی اڑ گئے تھے...... ان کی جگہ ایک سرمئی سی اجاڑ ویرانی نے لے لی تھی۔ ایک دبیز کہرہ ساپوری زندگی پر جما ہوا محسوس ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنی عینک کے شیشے قمیص کے دامن سے رگڑ کر صاف کیے، اور دوبارہ ناک پر جمالی، گویا اس کہرے کے اس پار دیکھنے کی اپنی سی کوشش تھی، مگر اب راہ میں کھڑکی کا شیشہ حائل ہو گیا۔ نجانے کتنے ہاتھوں کے لمس اس شیشے پر اپنی یادگار چھوڑ گئے تھے، باہر چھایا کہرہ شاید مزید گہرا ہو گیا تھا۔ شیشہ باہر سے آتی سرمئی روشنی میں میلا اور داغدار نظر آ رہا تھا، اور اس شیشے میں دِکھتا ان کے اپنے چہرے کا عکس بھی۔

مگر آخر کہاں تھی غلطی؟! کیا کوتاہی کی انہوں نے......؟ کہاں کمی رہ گئی ان کی جہد و سعی میں، ان کے خلوص میں، ان کے عزم و ارادے میں...... آخر وہ کون سا مقام تھا...... وہ کون سا قدم تھا...... جہاں وہ سیدھا چلتے چلتے اس راستے سے اتر گئے جو منزل تک جاتا تھا۔ یہ...... یہ ان کی منزل تو نہ تھی۔...... یہ تو انہوں نے کبھی نہ چاہا تھا...... کبھی سوچا تک نہ تھا، مسائل سے اٹا، مشکلات میں گھرا، اخلاقی، معاشی و معاشرتی تنزل کی طرف قدم بہ قدم گامزن، ایک تباہ حال گھرانہ......!

''...... کرپشن ہو گی، لوٹ مار، لالچ حرص سب ہو گا،...... بڑے چھوٹے کی تمیز اٹھ جائے گی...... بدتمیزی، بدزبانی، بے ادبی...... ایسا اخلاقی انحطاط ہو گا کہ آپ حیران رہ جائیں گے......''، فوراً ہی جیسے ان کی سوچ کے جواب میں یہ یاد بنا اجازت و بے دھڑک...... در آئی تھی۔ اور پچھلے کچھ عرصے سے جس قدر انہوں نے پروفیسر حسن عبداللہ کے یہ الفاظ یاد کیے تھے، شاید ہی کبھی کسی کی باتیں اس طرح یاد رکھی تھیں۔ کتنا یقین تھا ان کے لہجے میں...... جیسے وہ اپنی آنکھوں سے یہ سب ہوتا دیکھ رہے ہوں۔

''ایک ایسی مساوات ہو گی جو مخلوق کے فطری تنوع سے یکسر اندھی ہو گی...... جس کی نظر میں شیر، ہاتھی، بکری، چڑیا اور مچھلی سب برابر ہوں گے...... جس میں بے عقل خوش رہیں گے لیکن عقل والے پناہ مانگیں گے...... مگر پسیں گے سب......''

''...... آزادی ہو گی...... ایسی مادر پدر آزادی کہ جس کا آپ نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو گا...... عورتوں کی شرم و حیا...... بچوں کی فرمانبرداری...... اچھی اقدار...... سب ختم ہو جائیں گی...... ناچ گانا، فحاشی، اور حرام کام ہوں گے...... شروع میں چھپ چھپا کر اور بعد میں کھلے بندوں...... بغیر کسی خوف اور جھجک کے......''، پروفیسر صاحب اپنی انگلیوں پر شمار کر کر کے انہیں بتا رہے تھے۔

''اسے محض تنبیہ نہ سمجھیں...... بلکہ یہ میری پیشین گوئی ہے...... یہ سب ہو گا...... جانتا ہوں کہ آپ کو میری بات پر یقین نہیں آ رہا، مگر لکھ رکھیے کہ یہ سب ہو گا...... کیونکہ جمہوریت ایک پورا پیکج ہے...... اور اس میں یہ سب شامل ہے...... جتنا زیادہ عرصہ آپ اسے آزمائیں گے، اتنا ہی زیادہ یہ بگاڑ پیدا کرے گی...... اتنے ہی اس کے جوہر کھلتے جائیں گے...... اور بہت جلد یہ نتائج آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے......!''

وہ اپنے گھریلو حالات سے پریشان حال، جمعہ کی نماز کے بعد جامعہ پنجاب کی جامع مسجد کے ایک کونے میں بیٹھے تھے...... جب پروفیسر مفتی حسن عبداللہ صاحب ان کے پاس آ بیٹھے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد ہی پروفیسر صاحب نے نہایت سنجیدگی سے ان سے کہا۔

''ہاشمی صاحب!...... مجھے ڈر ہے کہ اگر آپ اپنے گھرانے کے لیے خوشیاں اور کامیابیاں جمہوریت میں ہی تلاش کرتے رہے، تو آپ بہت جلد بہت مشکل میں پڑ جائیں گے......''۔

اس وقت تو انہیں یہ باتیں سن کر یقین تو کیا آنا تھا...... الٹا غصہ آنے لگا۔ تنگ نظر مولوی...... ڈبہ بند دماغ...... ہر چیز کا منفی پہلو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ جب پہلے سے ہی ذہن میں یہ بٹھا رکھا ہو کہ ہم ناکام ہوں گے، نامراد ہوں گے...... تو ظاہر ہے پھر یہی نتیجہ نکلے گا...... اگر کچھ کرنے کا جگرا ہوتا تو خالی خولی باتیں کرنے...... نتائج سے ڈرانے کے بجائے عملی میدان میں کچھ کر کے دکھاتے......! کتنا یقین تھا انہیں...... کہ ان کا گھر میں جمہوریت نافذ کرنے کا منصوبہ بہت اچھے نتائج لائے گا...... اور کیوں نہ ہوتا یقین...... جمہوریت...... خالی جمہوریت...... یا مغربی طرز کی جمہوریت پر تو کبھی بھی ان کا اعتقاد نہ رہا تھا...... انہوں نے تو ہمیشہ اسلامی جمہوریت کے نفاذ کی بات کی تھی۔

اسلامی جمہوریت...... کیا تھی اسلامی جمہوریت؟...... وہ مثالی نظام کہ جس میں اسلام کے سنہری، پائیدار اور ابدی اصول، آج کی جدید تہذیب سے مل کر ایک ایسا نظام تشکیل دیتے جو اکیسویں صدی کی دنیا اور اس میں بسنے والے انسان کے تمام دینی، معاشی و معاشرتی تقاضے پورے کرتا، جو آج کے انسان کے مسائل و طبائع سے مکمل واقفیت رکھتا اور ہر لحاظ سے حیاتِ انسانی سے مطابقت رکھتا۔ یعنی روح اسلام ہی کی ہوتی...... طرزِ حکومت جدید ہوتا...... آج کی دنیا کے مطابق...... آج کے انسان سے compatible...... ان دو کے ملاپ سے وہ مثالی نظام وجود میں آتا جو مسلمانوں کو ایک بار پھر اوجِ ثریا پر فائز کر دیتا...... مگر......!!

مگر...... حسرت ان غنچوں پر......! ایک گہرا سانس لیتے ہوئے انہوں نے اپنا سر پیچھے کی جانب ڈھیلا چھوڑ دیا، اب ان کی نظریں چھت کے بیچوں بیچ لٹکتے پنکھے پر جمی ہوئی تھیں۔

''آخر ان کم عقل بچوں کو ووٹ کا حق کیوں حاصل ہے......؟ اس طرح تو یہ الیکشن ایک تماشہ ہی بنے رہیں گے......؟''، صولت بیگم کے مدتوں پرانے سوال کی بازگشت ان کے ذہن میں گونجی۔

''تو آپ کی نظر میں کس کو ووٹ کا حق ہونا چاہیے؟''، انہوں نے سوال کا جواب ایک دوسرے سوال سے دیا۔

''سچ پوچھیں تو میرے خیال میں ابا جی، آپ، عثمان اور جاوید کو ووٹ کا حق ہونا چاہیے......''، صولت بیگم صاف گوئی سے بولیں، ''......لیکن اس پر اگر سب راضی نہ ہوں تو پھر زیادہ سے زیادہ اس فہرست میں مجھے، فائزہ اور بینش کو شامل کر لیں......یعنی گھر کے بڑے اور باشعور افراد......''۔

''اور عمیر......اس کو بھی ووٹ کا حق نہ دیں؟''

''پہلے وہ اپنے آپ کو اس کا اہل تو ثابت کرے......''، صولت بیگم کی بڑبڑاہٹ خوش قسمتی سے اتنی ہلکی تھی کہ وہ آسانی سے نہ سننے کا تاثر دے کر نظر انداز کر سکتے تھے۔

''لیکن پھر بیگم صاحبہ......یہ جمہوریت تو نہ ہوئی ناں......یہ تو ایک مخصوص گروہ کی حکمرانی ہی ہو گی......بالخصوص جبکہ گھر میں دیگر عاقل و بالغ افراد بھی موجود ہیں......نہیں!......ضرورت اس چیز کی ہے کہ جو بچے ناسمجھ ہیں، انہیں سمجھایا جائے......ان تک علم و آگہی پہنچائی جائے......انہیں حق کی دعوت دی جائے اور اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا جائے...... پھر ہی ہم حقیقی اسلامی جمہوریت کی بہار اپنے گھر میں دیکھیں گے اور اس کے ثمرات سے مستفید ہو پائیں گے''، وہ سب کے اعتراضات اور خدشات کو یونہی عزم و یقین سے، امید اور ولولے سے ردّ کرتے، سب کی ہمت بڑھاتے تھے۔

مگر ہوا کیا......؟! کتنی کوشش انہوں نے کر دیکھی......بچوں کے ساتھ بیٹھنے کی......افہام و تفہیم کی خاطر کتنی نشستیں رکھیں......عثمان اور جاوید نے بھی بیویوں اور بچوں کے ساتھ اپنی جان لڑا دی......انہیں اسلامی جمہوریت سمجھانے کی......انہیں اچھا اور قابل حکمران چننے کی تحریض دلانے کی......مگر پھر بھی ہر الیکشن کے موقع پر نجانے کیا ہوتا......کیسے سب کے دماغ الٹ جاتے کہ بالکل ہی توقع کے برخلاف نتیجہ سامنے آتا......

اور الیکشن بھی چھوڑو......اس کے علاوہ جو کچھ گھر میں چل رہا تھا......وہ کس کھاتے میں آتا تھا؟ وہ کس کی غلطی تھی؟......نبیلہ کی خود سری......اس کی اور دیگر لڑکیوں کا تمامتر دینی تربیت بھلا کر گھرانے کی ہر اچھی روایت پس پشت ڈال کر بڑوں کی مخالفت کرنا......بچوں کی بد تمیزی اور نافرمانی......جو سارا سارا دن اپنے گھر اور سکول سے متعلقہ فرائض بھلائے ٹی وی اور انٹرنیٹ سے جڑ کر بیٹھے رہتے......گھر میں بڑھتا اور چھاتا ہوا مغربی رنگ......حتیٰ کہ ان کے گھر کے تو ملازم بھی اس قدر مزاج دار تھے کہ مالکوں کو بات کرنے سے پہلے سو بار سوچنا پڑتا......اور ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ مسائل حل ہونے کے بجائے بڑھتے جا رہے تھے......ان کے ذہن میں بینسن کی وہ ڈبیا گھوم گئی، جو چند دن پہلے نسرین کو زین کی الماری کی صفائی کے دوران ملی تھی۔ پروفیسر حسن صاحب نے جو پیشین گوئیاں کی تھیں......غیر شعوری طور پہ ان کا ذہن اس وقت یہ اندازہ لگانے میں مصروف تھا کہ ان میں سے کتنی پوری ہو گئیں اور کتنی ابھی باقی تھیں......

وہ انہی فکروں میں غلطاں تھے جب موبائل کی بجتی بیل نے انہیں متوجہ کیا۔ ابا جی ذرا ہی دور اپنے بیڈ پر سو رہے تھے......موبائل کی آواز پر انہوں نے اپنی نیند بھری آنکھیں ذرا سی کھول کر ان کی جانب دیکھا......مگر پھر دواؤں کے زیر اثر، دوبارہ سو گئے۔ ابو بکر صاحب نے جلدی سے کال ریسیو کی، دوسری جانب جاوید صاحب تھے۔

''بھائی جان منی مارکیٹ والی برانچ میں کوئی نہیں ہے کیا؟''، انہوں نے سلام کے فوراً بعد عجلت میں پوچھا۔

''کیوں نہیں......عمیر ہو گا ناں!!......اسی کو چھوڑ کر آیا تھا میں وہاں......''

''وہ نہیں ہے وہاں......اوپر سے فون بھی اس نے بند کر رکھا ہے، اور زوار کا نمبر بھی بند مل رہا ہے......میں ادھر جوہر ٹاؤن والی دکان میں ہوں اور اُدھر منی مارکیٹ میں گاہک بیٹھے انتظار کر رہے ہیں اور انہیں اٹینڈ کرنے کے لیے کوئی موجود نہیں......گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہے عمیر......!''، جاوید صاحب غصے سے بولے۔

''میں چلا جاتا ہوں پھر......تم فکر نہ کرو......'' انہوں نے فوراً اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں بھائی جان آپ آج سارا دن بھی وہیں گزار کر آئے ہیں، مگر میں اگر ابھی یہاں دکان فرحان کے حوالے کر کے منی مارکیٹ جاؤں تو بھی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکتا......اس وقت تو رش بھی اتنا زیادہ ہوتا ہے نہر پر......''، جاوید صاحب افسوس اور فکر مندی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بولے، ''ولید کی اتنی یاد کبھی نہیں آئی جتنی آج کل آتی ہے نہ اتنی ضرورت ہی کبھی محسوس ہوئی......''، وہ کہنا نہ چاہتے تھے مگر پھر بھی کہہ گئے۔

''ہاں......! صحیح کہتے ہو......!''، ابو بکر صاحب نے ایک گہرا سانس لے کر فون بند کیا، جیب میں رکھا اور میز سے اپنا بٹوہ اور گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے باہر کی جانب بڑھ گئے۔

☆☆☆☆☆

نسرین کا خلع کے لیے دائر کیا گیا مقدمہ نہایت اہم رخ اختیار کر گیا تھا۔ ارشد جس نے اب تک اس مقدمے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی اور اس کی جگہ اس کے والدین مقدمے کی

پیروی کر رہے تھے۔ مگر اب جو مسئلہ درپیش تھا اس پر ارشد بھی سنجیدگی سے معاملے پر سوچ بچار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ بطورِ خاص اپنے کاموں سے رخصت لے کر پاکستان آیا تھا، اور اگلے ہی دن نسرین سے ملاقات کے لیے سیدھا ہاشمی ہاؤس پہنچ گیا۔ گیٹ پر چوکیدار نے اس کا تعارف حاصل کر کے پہلے انٹر کام پر نبیلہ کو اطلاع کی تھی، اور نبیلہ نے وہیں سے سختی سے "جو بھی بات ہو گی کورٹ میں ہو گی......" کے پیغام کے ساتھ اسے واپس بھیج دینے کی ہدایت جاری کر دی۔

اس کے بعد بھی ارشد دو تین دفعہ نسرین سے ملاقات کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ چونکہ نسرین اس کی کال اٹینڈ نہیں کرتی تھی لہٰذا وہ ابو بکر صاحب اور صولت بیگم کے ذریعے بھی نسرین تک پہنچنے کی کوشش کر چکا تھا، مگر ہر طرف سے اسے ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نبیلہ یہ تمام خبریں نسرین کے وکیل بشیر صاحب سے آج کی ملاقات کے شروع میں ہی ان کے گوش گزار کر چکی تھی اور اب بہت دیر سے ان کے ساتھ بیٹھی ان پچھلی تین عدالتی پیشیوں کی مفصّل روداد سن رہی تھی جن میں وہ بوجوہ شرکت نہیں کر پائی تھی۔ بشیر صاحب بھی رپورٹیں بنانے کے شوقین محسوس ہوتے ہیں، ان کی انتہائی دقیق اور مفصّل رپورٹوں پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ کارروائی کی عمومی روداد سے لے کر جج کے کمنٹس اور عدالت میں موجود دیگر افراد کے تاثرات تک، کچھ بھی انہوں نے نہیں چھوڑا تھا۔ رپورٹیں اس کے سامنے رکھ کر وہ اب اسے مقدمہ کے اوّل روز سے آج تک کی ساری کارگزاری مع اپنے تبصروں اور تجزیوں کے سنا رہے تھے، اور وہ غائب دماغی سے مگر تحمل سے سن رہی تھی، کیونکہ اب تک کی ملاقاتوں کے بعد اتنا تو وہ جان چکی تھی کہ یہ بشیر صاحب کی عادت تھی کہ وہ ہر ملاقات میں بات ہمیشہ الف ہی سے شروع کرتے جہاں سے معاملے کا آغاز ہوا تھا، اور ہر نکتے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اب تک کی تمام صورت حال کا ایک خاکہ اس کے سامنے پیش کر دیتے۔

بظاہر وہ اپنے سامنے فائل کھولے اور ہاتھ میں قلم تھامے بشیر صاحب کی گفتگو سن رہی تھی، مگر اس کا ذہن کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ اور متعدد بار دماغ کو حاضر کرنے کی کوشش کے باجود ہر چند منٹ بعد وہ وہیں لوٹ جاتا۔ عثمان صاحب کے حادثے کے بعد اس نے نامعلوم افراد کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ پھر پہلے ریگولر پولیس کے کارندے اور بعد میں سی آئی ڈی کے تربیت یافتہ پروفیشنلز جائے وقوع کا باریک بینی سے جائزہ لے چکے تھے۔ فورینزک رپورٹ کے لیے بھی شواہد اکٹھے کر لیے گئے تھے اور آج ہی سی آئی ڈی کا ایک انسپکٹر اپنی حتمی رپورٹ لے کر اس کے پاس آیا تھا۔

یہاں تک کی کہانی تو واضح تھی کہ جمعرات کی شب تقریباً تین بجے ان کے گھر پر پڑنے والے ڈاکے میں ڈاکو نہ صرف تقریباً دس لاکھ روپے مالیت کا سامان لے گئے تھے بلکہ جاتے جاتے عثمان صاحب کی ٹانگ میں گولی مار کر انہیں زخمی بھی کر گئے تھے۔ گھر کا ملازم نذیر بھی ان ڈاکوؤں سے مڈ بھیڑ میں معمولی سا زخمی ہوا تھا۔ اس کے سر پر کوئی بھاری چیز ماری گئی تھی جس سے اس کا ماتھا پھٹ گیا تھا اور وہ وقتی طور پر بیہوش ہو گیا تھا۔ مگر چونکہ ڈاکو مکمل طور پہ دستانوں اور ماسک وغیرہ میں مستور تھے تو اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑ کر نہ گئے تھے اور نہ ہی عینی شاہدین کے لیے انہیں شناخت کرنا ممکن تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ محلّے کے چوکیدار اور اردگرد رہائش پذیر افراد میں سے کسی نے بھی اس رات کوئی غیر معمولی نقل و حرکت محسوس نہ کی تھی۔ افسوسناک امر یہ تھا کہ وہ جس سرویلنس سافٹ وئیر کے تحت گھر میں جگہ جگہ لگے سی سی ٹی وی کیمرے استعمال کرتے تھے، وہ عدم ادائیگی کی وجہ سے ہفتہ بھر سے بند تھا۔ ورنہ اگر گھر سے ہی کیمرے کی فوٹیج مل جاتی تو شاید مزید تحقیق و تفتیش کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ پھر بھی یہ غنیمت ہوا کہ پولیس سامنے والے پڑوسیوں کے گھر میں لگے کیمرے کی فوٹیج حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور رپورٹ کا یہی حصّہ تھا جس میں صبح سے نبیلہ کا دل و دماغ اٹکا ہوا تھا۔

رات ایک بجے کی ریکارڈ شدہ فوٹیج میں واضح طور پہ بیرونی گیٹ کے راستے ایک شخص کو گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھا جا سکتا تھا۔ ان کا گھر جس گلی میں واقع تھا وہ مغربی جانب سے بند تھی، اور پڑوسیوں کے کیمرے کا زاویہ ایسا تھا کہ وہ سڑک اور گلی میں داخلے کے راستے کو کوَر کرتا تھا۔ یوں ان کے گھر کا گیٹ کیمرے کے زاویۂ نظر میں شامل نہیں تھا، البتہ گیٹ کے باہر بنی ماربل کی سیڑھیوں اور ڈھلان (ریمپ) تک کیمرے کی نگاہ کی رسائی تھی۔ ویڈیو میں سادہ شلوار قمیص میں ملبوس ایک درمیانے قد کے شخص کو ان کے گیٹ تک جاتے دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ شخص معمول کے انداز میں ان تین سیڑھیوں پر چڑھتا نظر آتا تھا جو گیٹ تک لے جاتی تھیں۔ اس کے بعد وہ کیمرے کی حدِ نگاہ سے باہر نکل جاتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ دوبارہ کیمرے کے حلقۂ نظر میں نہیں آتا تو دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ وہ گیٹ یا دیوار پھلانگ کر گھر میں داخل ہو جاتا ہے یا دوسری یہ کہ اس شخص کے لیے دروازہ اندر سے کھولا جاتا ہے، اور چونکہ اس شخص کی حرکات و سکنات سے مکمل اطمینان کا اظہار ہوتا ہے اور وہ کسی عادی معمول کی طرح سیدھا ان کے گھر کے گیٹ کی جانب آتا ہے، لہٰذا تفتیش کاروں کے ذہن میں دوسری صورت ہی زیادہ قرینِ قیاس تھی۔ اسی طرح رات تین بجے کے لگ بھگ ان کے گھر سے کالی شرٹ اور پاجامے میں ملبوس ایک فرد کو نکلتے دیکھا جا سکتا تھا، جو قدرے تیزی سے ان کے گیٹ سے نکل کر سڑک پر دور جاتا نظر آتا ہے، لباس کے فرق کے علاوہ یہ شخص اپنے قد کاٹھ سے وہی شخص ظاہر ہوتا ہے جو چند گھنٹے قبل گھر میں داخل ہوتا نظر آیا تھا۔ مگر یہاں بھی یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں تھا کہ یہ شخص خالی ہاتھ تھا۔ اس رپورٹ کے ساتھ ہی ڈاکوؤں کی واردات والی پوری کہانی پر بہت بڑے بڑے سوالیہ نشان لگ گئے تھے۔

"......اس موقع پر نہایت سوچ سمجھ کر کوئی سنجیدہ جواب دینا ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ کیونکہ معمولی سی غلطی بھی نسرین بی بی کے حق میں ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث بن سکتی ہے"، بشیر

صاحب اپنی لمبی گفتگو ختم کرتے ہوئے اب اپنے سامنے پھیلے کاغذات سمیٹ رہے تھے۔ نبیلہ چونک کر اپنی سوچوں کے گرداب سے نکلی اور قدرے سٹپٹا کر بشیر صاحب کی جانب دیکھا۔ شکر تھا کہ وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھے، اسے اپنے حواس مجتمع کرنے کے لیے چند لمحے مل گئے۔ اس نے خواہ مخواہ سر پر بندھے سکارف کو دونوں ہاتھوں کی مدد سے ہلکا سا سیٹ کیا، اور ایک ٹانگ دوسری پر رکھتے ہوئے اپنی کرسی پر مزید آگے کو ہو کر بیٹھ گئی۔ پھر ہاتھ میں پکڑے قلم کو دانتوں میں دباتے ہوئے پر سوچ انداز میں بولی:

''اور آپ کی رائے میں وہ جواب کیا ہونا چاہیے؟''

''......اس بارے میں میری رائے کیا حیثیت رکھتی ہے؟ یہ تو نسرین بی بی اور آپ سب کے سوچنے کا معاملہ ہے''، بشیر صاحب نے ایک ابرو اچکاتے ہوئے قدرے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں نہیں...... آپ ہمارے وکیل ہیں، آپ کی رائے کیوں اہمیت نہیں رکھتی......؟''، وہ ذہن پر زور ڈال کر بشیر صاحب کے اختتامی جملے یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ابھی فی الحال کس سوال کا جواب درکار تھا، نہ اس کے کانوں نے سنا تھا، نہ دماغ ہی یہ بتانے پر قادر تھا۔

''...... کیونکہ یہ ایک سراسر ذاتی فیصلہ ہے کہ نسرین بی بی عبداللہ کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہیں یا ارشد کے حوالے کریں گی، میرا کام تو آپ لوگوں کے کیے ہوئے فیصلے پر خوش اسلوبی سے مخالف پارٹی سے عمل کروانا ہے، مگر فیصلہ کرنے کے لیے آپ کو ہی اپنا دماغ حاضر کرنا ہو گا''، بشیر صاحب خشک انداز میں بولے۔

غالباً انہیں بھی اس کی عدم توجہی کا احساس ہو گیا تھا۔ مگر اس کے سبب وہ ان کو اپنے اوپر حاوی ہونے دے...... ناممکن! کھسیاہٹ دور کرنے کو وہ تیزی سے بولی:

''...... آف کورس!...... یہ تو ہم خود ہی طے کریں گے...... میرا مطلب یہ تھا کہ آپ کی کیا رائے ہے، کیا اس ایشو کو ابھی فوراً ہی ایڈریس کرنا چاہیے یا ہمیں اپنی اس بات پر زور دینا چاہیے کہ ارشد اور اس کی فیملی نے اتنا عرصہ ہمارے ساتھ جو فراڈ کیا ہے اس کے لیے عدالت ہمارے ساتھ انصاف کرے......؟''

''...... دیکھیں بی بی! یہ بات پہلے ہو چکی ہے''، بشیر صاحب اب واضح ناراضگی سے بولے، ''...... ہم پہلے ہی اس نقطے کو بار بار ہائی لائٹ کر چکے ہیں، اب اس موقع پر دوبارہ یہ مظلوم کارڈ کھیلنا ہمارے حق میں مفید نہیں، عدالت بھی تنگ آ جائے گی کہ ہم ایک ہی بات دہرا دہرا کر اس کا وقت ضائع کرتے ہیں......''

مظلوم کارڈ والی بات سیدھی جا کر نبیلہ کے دل پہ لگی، اس کا چہرہ تمتما اٹھا، ''دیکھیے بشیر صاحب! آپ جانتے ہیں آپ کو ہم نے کس کام کے لیے رکھا ہے؟ آخر کسی کام کی اتنی بھاری بھر کم فیس لیتے ہیں ناں آپ...... کوئی فی سبیل اللہ تو یہ خدمت نہیں کر رہے آپ......''، وہ تند و تلخ لہجے میں ان سے مخاطب ہوئی، ''...... آپ کو ہم نے اس لیے رکھا ہے کہ آپ نوالہ بنا کر ہمارے منہ میں ڈال دیں۔ اور اگر چبانے کے لیے جبڑا بھی ہلا دیں تو اور بھی اچھا ہے...... ظاہر ہے وکیل آپ ہیں، میں نہیں...... اور ججوں کے مزاج کو بھی آپ ہی بہتر سمجھتے ہیں...... آپ کو چاہیے کہ آپ اپنی رائے اور ریکمنڈیشن (مشورہ) اس رپورٹ پر ساتھ ہی لکھ دیا کریں، پھر ہمارا آپس میں مشورے کے بعد کیا فیصلہ ہوتا ہے، اس سے میں آپ کو آگاہ کر دوں گی۔''

☆☆☆☆☆

بشیر صاحب کے چیمبر سے نکلنے کے بعد اس کا رخ ہسپتال کی جانب تھا۔ عثمان صاحب کو پرائیویٹ کمرے میں منتقل ہوئے دو ہفتے ہو چلے تھے، مگر ڈاکٹر تا حال انہیں ڈسچارج کرنے کے حوالے سے تذبذب کا شکار تھے۔ گولی گھٹنے کے قریب ران کے گوشت کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی اور گو کہ ہڈّی سالم تھی، مگر ٹانگ کو خون فراہم کرنے والی بنیادی رگ ہی صدمے سے متاثر ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے اب بھی رگ سے رِستا خون جلد کے نیچے اکٹھا ہو جاتا، بعض اوقات زیادہ خون رِس جانے سے عثمان صاحب کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک گر جاتا، چہرہ نچڑ جاتا اور جسم ٹھنڈا ہو جاتا، جس پر انہیں فوری طور پر ڈرپ لگانا پڑتی۔ ڈاکٹروں کی رائے یہی تھی کہ جب تک رگ اپنے فطری طریقۂ کار کے مطابق ٹھیک نہیں ہو جاتی، عثمان صاحب کو ہسپتال میں ہی رہنا چاہیے۔

مگر عثمان صاحب کی ہسپتال میں اتنی طویل اقامت کے سبب ہسپتال کے ہفتہ وار واجبات کی ادائیگی کرتے ہوئے جو نبیلہ کی حالت ہوتی تھی، اسے لگتا تھا کہ اسے بھی ایک ڈرپ لگوا کر ہی باہر قدم رکھنا چاہیے۔ اب بھی کیشیئر کو ساٹھ ہزار روپے کے چیک پر اپنی سربراہی مہر لگا کر دیتے ہوئے اس کے دل سے عثمان صاحب کی جلد از جلد گھر واپسی کی دعائیں نکل رہی تھیں۔ اس کا ارادہ تو تھا کہ وہ عثمان صاحب کے کمرے میں جا کر کھڑے کھڑے ایک نظر انہیں بھی دیکھ لیتی، مگر پھر تھکاوٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے نور کو (جو عثمان صاحب کے ساتھ ہسپتال میں ٹھہری ہوئی تھی) میسج کر کے لابی میں ہی بلا لیا اور گھر سے لائے ہوئے کھانے کے تھیلے اس کے حوالے کر کے واپس گاڑی میں آ بیٹھی۔

اپنے طور پر وقت کی بھرپور بچت کرتے ہوئے بھی گھر پہنچتے پہنچتے مغرب ہو رہی تھی۔ آج اس کی صبح نو بجے انسپکٹر رضوان کی آمد کے ساتھ ہوئی تھی۔ ان سے ملاقات کے بعد وہ بارہ بجے ناشتہ کیے بغیر گھر سے نکلی تھی اور بشیر صاحب سے ملاقات سے پہلے ان کے اسسٹنٹ نے اس کے سامنے جو جوس کا ایک گلاس رکھا تھا، سارا دن وہ اس ایک گلاس کے سہارے ہی چلتی رہی تھی۔ گھر پہنچ کر انہیں گیٹ پر بالکل انتظار نہ کرنا پڑا، باوردی چوکیدار نے ان کی گاڑی آتے دیکھ کر پہلے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر سیدھا اپنی جانب والے پورشن کے کچن میں پہنچی، رات کا کھانا ابھی تیاری کے مراحل میں تھا۔ مگر اس کے کہنے پر آپائی نے دوپہر کا بچا کھچا

ہی اس کے لیے گرم کر دیا، اور اس کے منع کرنے کے باوجود ساتھ دو انڈوں کا آملیٹ بھی بنا دیا۔

پیٹ میں لگی آگ ٹھنڈی ہوئی تو اسے اصولاً تو اسے نیند آنی چاہیے تھی۔ گرم گرم ماں کی گود جیسی نرم ملائم نیند، ایک طویل اور مشکل دن کے خاتمہ پر کس کو اچھی نہیں لگتی، اور وہ تو ہمیشہ سے ہی نیند کی بے حد شوقین رہی تھی، مگر اب مشکل یہ تھی کہ نیند آنا بھی چاہتی تو بھی ذہن جن مسائل اور پریشانیوں میں اٹکا ہوا تھا، وہ کسی صورت اس کی آنکھیں بند نہ ہونے دیتیں۔ سو کھانے سے فارغ ہوتے ہی وہ ٹشو سے منہ پونچھتے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے اس نے موبائل اٹھا کر میسج روانہ کر دیا۔

بالائی منزل پر لاؤنج میں اندھیرا تھا۔ آفس، نسرین اور زین کے کمرے، سبھی اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ رات کے کھانے سے پہلے کا یہ وقت عموماً سب کا نیچے ہی گزرتا تھا۔ ایک عمیر کا کمرہ تھا جو آباد نظر آرہا تھا۔ اس کے ادھ کھلے دروازے سے روشنی باہر لاؤنج میں آرہی تھی۔ نبیلہ ایک محتاط نظر چاروں طرف ڈالتے ہوئے عمیر کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

وہ کمرے میں داخل ہوئی تو سامنے ہی زوار ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا، اس کی طرف پشت کیے کسی سے موبائل پر محوِ گفتگو تھا۔ وہ ایک ہاتھ میں ہیئر برش پکڑے اپنے بالوں میں پھیر رہا تھا اور دوسرے ہاتھ کے ذریعے موبائل کان سے لگا رکھا تھا۔ ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ بہت خوشگوار موڈ میں ہے۔ مگر آئینے میں جھلکتے نبیلہ کے عکس پر نظر پڑتے ہی اس کی خوش گواریت پل بھر میں تحلیل ہو گئی۔ ماتھے پر شکنوں کا جال بچھ گیا اور اس نے چند تیز جملوں میں اپنی گفتگو سمیٹتے ہوئے، فون بند کر دیا۔

''......کیا مسئلہ ہے؟!......کیوں آئی ہو یہاں؟''، وہ اس کی طرف مڑ کر کھا جانے والے انداز بولا۔

''......تم سے ملنے نہیں آئی......چاچو سے کام تھا، اس لیے آئی ہوں......''، اس نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔

''......قسم سے نبیلہ! تمہارے اندر مینرز اور ایٹی کیٹس نام کو نہیں ہیں......کسی کے کمرے میں یوں آتے ہیں منہ اٹھا کے......؟؟؟''، وہ غصّے سے دانت پیستے ہوئے بد تمیزی سے بولا۔

''......تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں چاچو کو میسج کر کے......یعنی اطلاع دے کر یہاں آئی ہوں......''، اس کی بد تمیزی کو بمشکل ہضم کرتے ہوئے نبیلہ نے بھی تیز لہجے میں جواب دیا۔

''......اور چاچو نے کہا کہ آجاؤ......؟؟''، اب کے زوار نے حیرت سے بھنویں اچکاتے ہوئے سوال کیا۔

''......نہیں، انہوں نے ابھی تک میرے میسج کا جواب نہیں دیا......کہاں ہیں وہ؟؟ مجھے ان سے بہت ضروری کام ہے......''، نبیلہ نے اہم انداز میں کہا۔

''......ضروری کام کی بچی!......تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے کہ یہاں اس طرح مت آیا کرو......خود تو مرو گی ساتھ ہمیں بھی مرواؤ گی!! کیا تاثر دینا چاہتی ہو تم سب کو؟؟ کہ تمہاری حکومت کی ڈوریں اس کمرے سے ہلتی ہیں......! چاچو واش روم میں ہیں، اور وہ بھی تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہیں گے......ناؤ گیٹ لاسٹ!''۔ (اب دفع ہو جاؤ!)

نبیلہ چند لمحے تیز نظروں سے زوار کو گھورتی رہی۔ گو کہ وہ ہمیشہ سے ہی قدرے بد تمیز اور منہ پھٹ تھا اور بہنوں کا کم ہی لحاظ کرتا تھا، مگر ابھی نبیلہ بہن کی حیثیت سے نہیں بلکہ سربراہِ خانہ کی حیثیت سے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اور اس خاص حیثیت میں یہ پہلی دفعہ تھا کہ زوار نے اس سے اس لہجے اور انداز میں بات کی تھی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ عمیر سے بات کیے بغیر کہیں جانے والی نہیں تھی، لہٰذا زوار کے ساتھ گھوریوں کے تبادلے کا مقابلہ ترک کرتے ہوئے وہ آرام سے جا کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''......جب تک چاچو آتے ہیں میں یہیں بیٹھ کر انتظار کروں گی......''، وہ اطمینان سے بولی۔

''......بہت ہی ڈھیٹ مٹی سے بنی ہو تم......!''، زوار نے دانت کچکچائے، مگر اسے ٹس سے مس نہ ہوتا دیکھ کر مجبوراً پہلے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پھر بیت الخلاء کا دروازہ کھٹکھٹا کر عمیر کو جلدی کرنے کو کہا۔ پانچ منٹ بعد عمیر تولیے سے منہ پونچھتا باہر آیا۔ نبیلہ کو پورے کرّوفر سے بیڈ پر بیٹھے دیکھ کر اس کے چہرے پر ان تاثرات کا نشرِ مکرر دیکھا جا سکتا تھا جو چند منٹ پہلے زوار کے چہرے پر اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

''......میں آپ کو یہ رپورٹ دکھانے کے لیے آئی ہوں......''، اس سے پہلے کہ عمیر کچھ کہتا، نبیلہ نے ہاتھ میں پکڑی فائل کھول کر اس کے سامنے کر دی۔ ''......یہ آبزرویشنز غور سے پڑھیں......یہ سی آئی ڈی کی رپورٹ ہے......اور یہ دیکھیں کہ انہوں نے نتیجہ کیا نکالا ہے......''۔

''......ہٹاؤ اسے......''، عمیر نے ناگواری سے فائل اپنے چہرے کے سامنے سے ہٹائی۔ ''......مجھے کیوں دکھا رہی ہو یہ رپورٹ؟......اس کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟''۔

''......بہت گہرا تعلق ہے چاچو......آپ یہ بتائیں کہ بینک کا جو قرضہ ادا کرنے کے لیے آپ کے پاس پائی بھی نہیں تھی، اس کے لیے یکایک پانچ لاکھ روپے کہاں سے آئے آپ کے پاس......؟''

عمیر نے چونک کر گہری اور تیز نظروں سے اس کی جانب دیکھا، ''......تم آم کھانے سے مطلب رکھو......پیڑ گننے کی ضرورت نہیں......''،

”......کیوں ضرورت نہیں......؟ مجھے پارلیمنٹ میں سب کے سوالوں کے جواب دینا ہوتے ہیں!!......ابّو، جاوید چاچو، ابّا جی......وہ سب جب پولیس تفتیش کی رپورٹ مانگیں گے تو کیا یہ رپورٹ دکھاؤں گی میں انہیں......؟ یہ رپورٹ جو کہتی ہے کہ یہ ڈاکہ اصل ڈاکہ تھا ہی نہیں، بلکہ محض ایک ڈرامہ تھا......یہ رپورٹ جو کہتی ہے کہ گھر کے اپنے افراد اس واردات میں ملوّث ہیں......!!غضب خدا کا چاچو! دس لاکھ سے زیادہ مالیت کی چوری کا معاملہ نہ بھی ہوتا تو بھی عثمان چاچو پر گولی چلانا......یہ کوئی چھوٹا معاملہ ہے؟......کون جواب دے گا ان سوالوں کا......“، نبیلہ بمشکل اپنی آواز دھیمی رکھتے ہوئے اضطراری انداز میں بولی۔ صبح جب سے انسپکٹر رضوان سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، یہ سوال اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہے تھے۔ اگر اس وقت عمیر گھر میں ہوتا اور دوسری مصروفیات انتہائی اہمیت کی حامل نہ ہوتیں تو وہ عمیر سے بات کیے بغیر کبھی گھر سے باہر نہ جاتی۔

”......تو میں کیا کروں......؟؟“، عمیر نے جھنجھلاہٹ آمیز بیزاری سے کہا، ”......تمہارے سارے مسائل حل کرنے کا میں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا......؟ سربراہِ خانہ تم ہو، خود حل کرو اپنے مسائل!......“۔

عمیر کے منہ سے یہ ٹکا سا جواب سن کر چند لمحوں کے لیے نبیلہ دنگ رہ گئی۔ بے اختیار ہی اسے چند ہفتوں قبل کا عمیر کا ہمدردانہ انداز یاد آیا جب وہ اس کا پورے گھر میں سب سے بڑا خیر خواہ ہونے کا دعویٰ کر رہا تھا، اور اب یہ رویّہ......! عمیر کے پل پل بدلتے انداز و اطوار اس کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ اسے خود ہی اپنی حیرت پر حیرت ہونے لگی، یہ کوئی پہلی دفعہ تو نہ تھا کہ عمیر نے اس سے یوں طوطا چشمی برتی تھی۔

”......میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ پولیس کے یہ اندازے کہاں تک درست ہیں......؟“، نبیلہ نے حتی المقدور اپنا لہجہ ہموار رکھتے ہوئے سوال کیا۔

☆☆☆☆☆

”نہیں......نہیں......اور نہیں!!!!......یہ نہیں ہو سکتا......!!“، اویس گردن دائیں سے بائیں نفی میں ہلاتے ہوئے غصے سے بولا، ”میں اس گھرانے کے تمام لڑکوں کی جانب سے یہ بات کہہ رہا ہوں......یہ نہیں ہو سکتا اور بالکل نہیں ہو گا!!!!......۔ ہم یہ بِل قطعی نامنظور کرتے ہیں......۔ پہلے ہی سب کے جیب خرچ میں سے دس فیصد کٹوتی ہو رہی ہے جس کی وجہ سے ہم سب مشکلات کا شکار ہیں......اب اس کو بڑھا کر تیس فیصد تک کر دیں......!!!؟......ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے!! قطعی نامنظور!!“۔

”......یہ وقتی اقدام ہے اویس......اس پر اتنا بے صبرا ہونے کی ضرورت نہیں......ہمارا گھرانہ ایک بحران سے گزر رہا ہے......یہ وقت تھوڑا سا مشکل ضرور ہے، مگر یہ بھی گزر جائے گا اور دوبارا گھر کے حالات اچھے ہو جائیں گے......اچھے برے حالات سب پر آتے ہیں......“، نبیلہ کی مجبوری تھی، سب سے نرمی اور تحمل سے بات کرنا......سو گو کہ جی اس کا یہی چاہ رہا تھا کہ اویس کو ایک جھانپڑ رسید کرے مگر اب تک وہ اتنی تجربہ کار ہو چکی تھی کہ اس کے لہجے سے اس کے اصل جذبات کا قطعی اظہار نہ ہو رہا تھا۔

”......ارے بھیا!!! ہم کھائیں گے کہاں سے......؟؟؟! ہمارے اخراجات کا کیا ہو گا......؟ وہ کیسے پورے کریں گے......؟ ٹھیک ہیں یہ باتیں......آٹھ دس ہزار سال میں آجائے گی ہمارے گھر میں بھی خوشحالی......لیکن تب تک ہم زندہ بچیں گے تو پھر ہے ناں!!!“، اویس مبالغہ آمیز پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”......تم جیب خرچ میں سے کٹوتی کے بجائے اضافی اخراجات ختم کرنے کی طرف توجہ دو نبیلہ۔ میرے خیال میں اسی سے معاشی اعتبار سے جو مشکل تمہیں محسوس ہو رہی ہے، وہ حل ہو جائے گی“، ابو بکر صاحب نے سنجیدگی سے اسے مشورہ دیا۔

”اضافی اخراجات......؟ مثلاً کون سے؟“، نبیلہ نے اچھنبے سے پوچھا۔

”مثلاً یہ جو سکیورٹی گارڈز ہیں......میرے خیال میں ان کی کوئی ضرورت نہیں......“

”ارے نہیں بھائی جان!......ابھی تو گھر میں ڈاکہ پڑا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ سکیورٹی کی ضرورت نہیں!“، عمیر نے بات کاٹتے ہوئے زور و شور سے مخالفت کی، ”سکیورٹی نہ ہوئی اور دوبارہ کوئی چور ڈاکو آ گئے تو ہماری یہ پیٹی کوٹ حکومت[1] کیا کر لے گی......سب کا جان و مال داؤ پر لگانے سے بہتر ہے چند ہزار ماہانہ گھر کی سکیورٹی پر خرچ کر لیے جائیں......“۔

نبیلہ نے تیز نظروں سے عمیر کی طرف دیکھا۔ ایک سخت سا جواب فوراً ہی ہونٹوں پر مچلا مگر آخری لمحے میں اسے یاد آ گیا کہ یہ جواب اسے خود بھی مہنگا پڑ سکتا ہے، سو وہ یہ کڑوا گھونٹ بھی حلق سے اتار گئی۔

”......تو پھر گھر کے ملازمین میں ہی کمی لانی چاہیے۔ تم سب گاڑی چلانا جانتے ہو تو پھر گھر میں ڈرائیور کی کیا ضرورت ہے......؟“۔

”مگر ابو سلطان صرف ڈرائیوری تو نہیں کرتا......اوپر کے تمام کام کرتا ہے......پھر اس کا باپ پرویز مالی کے فرائض ادا کرتا ہے اور اس کی بیٹی لبنیٰ گھر کے کاموں میں مدد کراتی ہے......اور اب تو سب خواتین اتنی عادی بھی ہو گئی ہیں لبنیٰ کی......اس کے بغیر تو بہت مشکل ہو جائے

[1] پیٹی کوٹ حکومت: دوپٹے و ساڑھی کی حکومت / زنانہ حکومت

گی.....''، نبیلہ جانتی تھی لبنیٰ یا سلمیٰ کو ہٹانے کی بات ہی خواتین کی جانب سے کتنا سخت ردِّ عمل لے کر آتی.....ابھی تک تو گھر کی خواتین کرن اور اس کی بہنوں کو فارغ کرنے کا غم نہیں بھلا پائی تھیں۔

''ہاں.....اور پھر یہ پورا خاندان علیحدہ علیحدہ تنخواہ پاتا ہے.....گھر اور بجلی، پانی، گیس کی سہولت کے علاوہ.....''، ابو بکر صاحب نے جتایا۔

''جی مگر یہ سب کام بھی تو ضروری ہیں.....اگر یہ لوگ نہیں کریں گے تو کون کرے گا.....؟''۔

''میرے تو خیال میں.....مسئلہ وسائل یا پیسے کی کمی کا نہیں.....بلکہ ان کے درست انداز میں مینجمنٹ کا ہے!!''، عمیر کے بیان میں اگر الزام نہیں تھا، تو اس کی نظروں اور لہجے میں ضرور تھا۔

''کیا مطلب ہے اس بات کا؟؟! کیا میں پیسے کھاتی ہوں.....؟! کوئی غبن کر رہی ہوں، فراڈ کر رہی ہوں.....گھر پر خرچ کرنے کے بجائے اپنی جیب میں پیسے ڈال رہی ہوں.....؟!''، نبیلہ کا ضبط جواب دے گیا، وہ یکدم جیسے پھٹ پڑی تھی۔ عمیر کے چہرے پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ ابھری۔ نبیلہ جانتی تھی وہ اسے مشتعل کرنا چاہتا ہے مگر ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنا غصّہ ضبط نہ کر پائی، اویس نے بھی چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا.....جیسے اس نئی امکانی صورتحال پر غور کر رہا ہو.....عمیر اپنی کوشش میں پوری طرح کامیاب رہا تھا۔

''.....یہ تو میں نہیں جانتا لیکن مثل مشہور ہے.....چور کی داڑھی میں تنکا.....!''، عمیر ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''سارے حالات سب کے سامنے ہیں.....میرا ریکارڈ الحمدللہ آئینے کی طرح شفاف ہے، ہر چیز ڈاکومنٹڈ ہے.....آمدن اور خرچ کا تمام حساب.....کتنا آیا، کہاں گیا.....کب خرچ ہوا.....کیسے خرچ ہوا.....جزئیات کی تفصیل کے ساتھ ہر چیز میرے پاس ریکارڈ میں موجود ہے!''، نبیلہ نے تڑاخ سے جواب دیا۔ ''.....یہ میری غلطی نہیں ہے کہ اس گھر پر میرے دورِ سربراہی میں ڈاکہ ڈلا ہے.....نہ ہی یہ میری غلطی ہے کہ عثمان چاچو دو ہفتوں سے ہسپتال میں پڑے ہیں.....یہ سارے حقائق آپ سب کے سامنے ہیں۔ پھر بھی اگر کسی کو سمجھ نہیں آتا کہ معاشی اعتبار سے ہم کہاں نچڑ رہے ہیں تو ایسے عقل کے اندھے کو سمجھانا میرے بس کی بات نہیں.....!''، غصّے اور رنج سے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا تھا، وہ تیز لہجے میں عمیر کی جانب دیکھے بغیر بولی۔

''.....تمہارے بس کی بات تو یہ حکومت چلانا بھی نہیں.....جس دن سے تم نے یہ دفتر سنبھالا ہے، ہم سب کے سامنے ہی ہے کہ کیسے اس گھر کے معاملات گھسٹ گھسٹ کر چل رہے ہیں.....!''، عمیر نے جوابی فائر کیا۔

''.....عمیر!.....''، اجلاس کو زبانی کلامی فائرنگ کا اکھاڑا بنتے دیکھ کر ابو بکر صاحب نے تنبیہی لہجے میں کہا، مگر عمیر کب کسی کو خاطر میں لانے والا تھا۔

''.....امّی جان مرحومہ کہا کرتی تھیں کہ مرد کے ہاتھ میں برکت ہوتی ہے..... تمہیں دیکھ لیتیں تو یہ بھی کہنے پر مجبور ہو جاتیں کہ عورت کے ہاتھ میں سوراخ ہوتے ہیں.....!''۔

''.....میں.....آپ یہ.....یعنی.....حد ہو گئی!!.....''، نبیلہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ عمیر کوئی پہلی دفعہ اس سے اس انداز میں پیش آ رہا تھا۔ بلکہ عمیر کے ہاتھوں اس رویے کی وہ عادی تھی، لیکن سب کے سامنے نہیں.....بند دروازوں کے پیچھے، یوں پارلیمانی اجلاس میں سب کے بیچوں بیچ نہیں.....سب کے سامنے اس کی یہ مخالفت کیا معنی رکھتی تھی؟ وہی تو تھا اسے سپورٹ کرنے والا.....اس مقام تک لانے والا.....اور یہ مسائل بھی سارے اسی کے پیدا کردہ تھے.....کیا وہ جانتا نہیں تھا.....تو پھر اب یہ باتیں وہ کیوں کر رہا تھا؟ کیا یہ کوئی نئی ترکیب تھی؟ کوئی نئی پالیسی.....

''.....اس گھر کی تاریخ کی کمزور ترین سربراہ.....''، اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ کہہ رہا تھا، ''.....اب بھی ہمیں سوچ لینا چاہیے.....غور کر لینا چاہیے کہ خاتون پارٹی اس منصب کی اہل ہے یا نہیں.....اب تک کی ان کی ٹرم کا ریکارڈ دیکھتے ہوئے میرا تو سیدھا سادہ مشورہ یہ ہے کہ نبیلہ ہاشمی کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانا چاہیے تاکہ مشکل کے اس دور میں اس گھر کو کوئی ایسا قابل اور باصلاحیت سربراہ نصیب ہو جو کامیابی سے ان حالات کا سامنا کرتے ہوئے گھرانے کو اس بحران سے نکال سکے.....''۔

(جاری ہے، ان شاء اللہ)

☆☆☆☆☆

ہماری شقاوت و بد بختی

''ہماری شقاوت اور بد بختی کے لیے یہ کیا کم تھا کہ ہم مالک حقیقی سے غافل اور بے خبر ہو چکے ہیں، اور دنیا میں اپنی آمد کا صحیح مقصد بھول چکے ہیں، مگر ہائے افسوس! کہ اب تو خداوند کریم کی یاد سے غفلت گناہ نہیں بلکہ اس کا ذکر اور اس کا نام لینا گناہ، حد درجہ لغو، مہمل اور احمقانہ حرکت اور ایک ذلیل و حقیر فعل سمجھا جاتا ہے۔ (العیاذ باللہ)''

امام اہل سنت مولانا سرفراز خان صفدر (نوّر اللہ مرقدہٗ)

سوشل میڈیا کی دنیا سے......

یہاں درج فاضل لکھاریوں کے تمام افکار سے ادارہ 'نوائے غزوۂ ہند' کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

جمع و ترتیب: ہشام سالِم

بڑھک | محمد اکرم نے لکھا

ایک دفعہ کسی میراثی نے قبرستان میں باپ کو دفنانے سے پہلے بڑھک لگائی کہ اگر میرے باپ کے ذمہ کسی کا قرض ہے تو دفنانے سے پہلے سامنے آ جائے۔ یہ سن کر چالیس پچاس بندے سامنے آ گئے۔

میراثی بھی پورے دنوں کا تھا، جب یہ دیکھا تو کہنے لگا بس ابا اک دفعہ اٹھ کے گواہی دے دے تو میں قرض لوٹا دوں گا۔

یہی واقعہ کل سپریم کورٹ میں بھی پیش آیا، جب چیف جسٹس نے بڑھک لگائی اور وزیر اعظم سے پوچھا کہ APS سانحے کے شہدا کے والدین نے جن چھ لوگوں کے نام دیے تھے کیا ان پر FIR کٹ گئی؟

وزیر اعظم بھی پورے دنوں کے ہیں۔ فرمایا آپ ایک دفعہ حکم جاری کر دیں، آپ جو حکم دیں گے اس پر عمل ہو گا۔

یہ سننے کے بعد چیف جسٹس صاحب کی حالت بھی میراثی والی تھی۔

نوٹ: ان چھ بندوں میں سابقہ آرمی چیف جنرل راحیل شریف اور سابقہ ڈی جی آئی ایس آئی جنرل ظہیر الاسلام کا نام بھی شامل ہے......

سانحۂ سیالکوٹ | اوریا مقبول جان نے لکھا

جاوید غامدی نے سانحہ سیالکوٹ کی ایک اور وجہ دستور شکن بندوقوں کو قرار دیا ہے۔ انہی دستور شکن بندوقوں کے امام پرویز مشرف کے دور میں وہ ان کے منظور نظر اور خاص چہیتے رہے ہیں۔

"تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی"

سردیاں آ رہی ہیں | وسیم عباسی نے لکھا

سردیاں آ رہی ہیں۔

حکومت کی توجہ اس طرف جانے سے پہلے جوشاندے کے تین چار ڈبے لے کر رکھ لیں۔

نیا پاکستان، نئی ریاضی | کامران خان نے لکھا

ریاضی بھی اب وہی پرانی ریاضی نہیں رہی۔

پاکستان پر قرضہ 25 ہزار ارب روپے تھا، کپتان نے 35 ہزار واپس کر دیا اب قرضہ 45 ہزار ارب ہے۔

ڈالر ریٹ | کامران یوسف نے لکھا

'ڈالر ریٹ بڑھنے سے اوور سیز پاکستانیوں کو بہت فائدہ ہوا ہے'...... گورنر سٹیٹ بینک۔

باقی جن کی پاکستانی روپوں میں آمدن ہے وہ بس حسرت کریں حسد نہ کریں۔

جٹ قریشی | رضوان رضی نے لکھا

"میرا تعلق قریش کے قبیلے سے ہے": شاہ محمود قریشی

ابو جہل کیہڑا جٹاں دا منڈا سی؟؟

اگر آج اقبال ہوتے | جمیل بلوچ نے لکھا

آج اقبال ہوتے تو اپنی اسلامی فکر کی وجہ سے گمشدہ افراد کی فہرست میں ایک نمبر پر ہوتے۔

بلکہ عین ممکن ہے ان کا انکاونٹر ہو چکا ہوتا اور گھر والے خوف کے مارے لاش وصول کرنے کے لیے ہسپتال جانے سے بھی ہچکچا رہے ہوتے۔

المیہ | حیدر خان نے لکھا

"پشاور اسکول میں اگر آپ کے بچے شہید ہو گئے تو کیا ہوا، آپ مزید بچے پیدا کر لیں۔"، لیفٹیننٹ جنرل ہدایت الرحمن

المیہ یہ نہیں کہ یہ الفاظ فوج کے ایک کور کمانڈر کے ہیں المیہ یہ ہے کہ بیوقوف قوم آج بھی سمجھتی ہے کہ یہ واقعی قوم کا دفاع کرتے ہیں۔

شیر اور ٹائیگر | عابی مکھنوی نے لکھا

ہمارے شیر اور ٹائیگر دیکھ دیکھ کر کتے اکڑ اکڑ کے چلنے لگے ہیں!

مشکل اور آسان کام | نعمان ابنِ حسین نے لکھا

فرانسیسی سفیر نکالنا مشکل کام ہے، لیکن اس کا مطالبہ کرنے والوں پر گولی چلانا آسان کام ہے، ڈالروں کے لیے امریکی سہولت کار بننا آسان کام ہے۔

لوگوں کو روٹی، کپڑا، مکان دینا مشکل کام ہے لیکن IMF کو اربوں روپے دینا آسان کام ہے۔

اسلامی قوانین کا نفاذ مشکل کام ہے لیکن انگریز کے قوانین نافذ کرنا آسان کام ہے۔

بلوچستان کے لوگوں کو حقوق دینا مشکل کام ہے لیکن ان کو اغوا کرنا آسان کام ہے۔

ملک ہی اچھا نہیں ملا | شاہد عباسی نے لکھا

ممکن ہے کہ خان صاحب آنے والے وقت میں یہ بیان دے دیں:

''مجھے ڈیلیور کرنے کے لیے اچھا ملک نہیں ملا، اگر پاکستان انگلینڈ ہوتا تو یہاں تبدیلی کے سو فیصد چانسز تھے۔''

منڈی کی سیاست | محمد قاسم نے لکھا

قیمتیں عالمی منڈی کے مطابق

تنخواہیں سبزی منڈی کے مطابق

اور سہولیات مویشی منڈی کے مطابق

سیکولر اور تضاد | ابو بکر قدوسی نے لکھا

ایک ''سائنس'' میں بھگت سنگھ (ماورائے عدالت قاتل) شہید۔

دھرتی کا سپوت......ہیرو......

دوسرے ''سائنس'' میں ہم علم دین (ماورائے عدالت قاتل) کی مذمت کرتے ہیں کہ جی کسی کو ''قانون کو ہاتھ'' میں نہیں لینا چاہیے......

آئن سٹائن کے سترہویں قانون ثقل میرا مطلب ''شکل زن شوئی'' کے تناظر میں کیا یہ ننگا برہنہ تضاد نہیں؟

نوٹ: جن کی اردو کمزور ہے وہ ''سائنس'' کو ''سانس'' بھی پڑھ سکتے ہیں!

ملاوٹ | یونس خان نے لکھا

ایک ہوٹل تیتر کا گوشت پکانے کے لیے مشہور تھا۔ ایک صاحب وہاں کھانا کھانے گئے تو کھانے کے دوران اُنہیں شک گزرا کہ تیتر کے گوشت میں ملاوٹ کی گئی ہے۔ انہوں نے بیرے کو بلا کر پوچھا ''سچ سچ بتاؤ، اس میں ملاوٹ کی گئی ہے؟''

''سچی بات ہے جی، تیتر کا گوشت مہنگا اور نایاب ہی اتنا ہے کہ اس میں گائے کے گوشت کی ملاوٹ کرنا پڑتی ہے''، بیرے نے جواب دیا۔

''کتنی ملاوٹ کرتے ہو؟'' ان صاحب نے پوچھا۔

''جناب ففٹی ففٹی''، بیرا بولا۔

''کیا مطلب؟'' انہوں نے وضاحت چاہی۔

''جناب! ایک تیتر اور ایک گائے''، بیرا مؤدبانہ بولا۔

ہمارے ملک میں سیاسی نظام میں بھی اختیارات کے حوالے سے یہی تیتر اور گائے والا فارمولا نافذ ہے۔ گائے کا تو سب کو معلوم ہے، جبکہ گالیاں تیتر کو دی جاتی ہیں۔

سوچیے کیوں؟ | محمد طلال نے لکھا

بھگت سنگھ بائیس سالہ انگریز جونیئر کانسٹیبل کو مار کر برصغیر کا ہیرو بن بیٹھا دوسری جانب شیر علی آفریدی تھے جنھوں نے ہندوستان کے وائسرائے کو ٹھکانے لگایا لیکن گمنام رہے سوچیے کیوں......؟

انصاف نہیں منافقت | فیض اللہ خان نے لکھا

چیف جسٹس سمیت پورے بینچ نے جس قدر پھرتیاں نسلہ ٹاور اور نالوں پہ بنے غریبوں کے گھر گرانے پہ دکھائی اس کے پاؤ بھر تیزی عسکری میں اپنے ہی احکامات کے مطابق سینما پلازے اور شادی ہال گرانے پہ دکھاتے تو قوم کو لگتا بھی کہ آپ منافقت نہیں انصاف کرنے بیٹھے ہیں!

خان صاحب کے چہرے کا اتار چڑھاؤ سمجھیں | عاطف الیاس نے لکھا

ایک پتے کی بات بتا رہا ہوں، غور سے پڑھ لیں اور ازبر کر لیں بلکہ اپنے دوست احباب اور رشتے داروں سے بھی شئیر کریں:

خان صاحب جب بھی تقریر کرتے ہوئے عینک اتاریں اور سکندرِ اعظم کے سٹائل میں نما نما مسکرائیں، گالوں کے پچھے ہونٹوں کے ساتھ زاویہ قائمہ بنانے لگیں، چشم نازک ذرا اور نازک ہو جائے اور شہادت کی انگلی لندن کی طرف اٹھ جائے، تو جان لیں کہ جلد ہی کوئی قیامت ٹوٹنے

والی ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ جس چیز کا ذکر خیر کریں، سارے کام چھوڑ کے اسی وقت تھوڑی سی زیادہ مقدار میں خرید لیں، کچھ دن اچھے گزر جائیں گے۔ لیکن یہ قول ہر وقت یاد رکھیں کہ ”سکون صرف قبر ہی میں ہے“۔

خان کی شان میں گانے | ابو محمد مصعب نے لکھا

جس لیڈر کی شان میں عیسیٰ خیلوی جیسا روند و فن کار گانا گائے، اس کی حکومت میں قوم دھاڑیں مار مار کر نہ روئے تو اور کیا کرے۔

میچ | خالد عباسی نے لکھا

ورلڈ گیم میں امریکہ اور چائنہ کا میچ پاکستانی پچ پر جاری تھا۔ ایک سابق امریکی کھلاڑی اچانک چائنہ کی طرف سے بیٹنگ کرنے آگیا۔ اس نے لمبے لمبے سٹر یٹیجکل سٹروکس لگائے اور وی میں کچھ ٹیکٹیکل ڈرائیوز کھیلنا شروع کر دیں۔ جس سے امریکی برین ٹینک سے دھواں نکلنے لگا۔ مگر اس نے ہمت کر کے بارویں اور تیرھویں کھلاڑی کی مدد سے پانامہ سے ٹمپرڈ گیند "فاسٹ بولر" کے ہاتھ لگا دی۔ ساتھ ہی اپنے متعین کردہ "ایمپائر" کو بھی اشارہ دے دیا۔ جبکہ "میچ ریفری" تو ہوتا ہی وہ ہے جو پہلے ہی "آپ رانجھا ہوئی" کی منازل تک پہنچا ہوتا ہے۔ انٹرنیشنل کرپٹ کونسل (آئی سی سی) نے اس موقع پر نئی قانون سازی کے ذریعے کسی قسم کے دستوری رد عمل کا راستہ معدوم کر دیا۔ ٹمپرڈ گیند سے ہونے والی ریورس سوئنگ نے بلے باز کے پلیٹ لیٹس تک ہلا کر رکھ دیئے۔ جبکہ یوتھیا تماشائیوں کے جوش و جذبے اور شور و غل سے نہ کان پڑی آواز سنائی دیتی تھی اور نہ کچھ سمجھ آتا تھا۔ اسی دوران ایک باہر نکلتی "وائیڈ بال" کو جب بیٹسمین لیفٹ کر کے سکھ کا سانس لینے ہی لگا تھا کہ وہ "بابا رحمتے" کی اٹھی انگلی دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے فوراً ریویو لینے کا اشارہ کیا مگر صورتحال کی سنگینی کے باعث فوراً ہی چکرا کر گراؤنڈ ہی میں گر گیا۔ وہ ریٹائرڈ ہرٹ ہو کر قطر کی ایمبولینس کے ذریعے لندن چلا گیا۔ سنا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے اسے ہوش آچکا ہے اور وہ پھر چپکے سے امریکی ڈریسنگ روم میں جا بیٹھا ہے۔ اس لیئے توقع یہی ہے کہ وہ اگلی اننگز امریکی سائیڈ سے کھیلنے آئے گا اور بولر کے ساتھ ساتھ ایمپائر، ریفری اور انٹرنیشنل کرپٹ کونسل سب کو چھٹی کا دودھ یاد دلائے گا۔ اس دوران سٹیڈیم، گراؤنڈ اور پچ کے ساتھ ساتھ تماشائی بھی سخت خطرات کا شکار رہیں گے۔ (الٰہی خیر میرے آشیانے کی!)

شکریہ نیازی دوئم | اسرار احمد خان نے لکھا

انگریز بہادر والے سے اب ہم ہندو بہادر والے دور میں داخل ہو چکے ہیں۔

اب کلبھوشن ریمنڈ ڈیوس کے مقام پر پہنچ چکا ہے

#شکریہ نیازی دوئم

عسکریت رائے | زبیر منصوری نے لکھا

ڈاکٹر مدثر کی اہلیہ کی گود میں بلکتا ہوا بچہ جب بڑا ہو گا تو اسے بتایا جائے گا کہ جس دن سرینگر میں چار لوگوں کو فیک انکاؤنٹر میں مارا گیا عین اسی وقت "سفیر کشمیر" و تبدیلی کے دیوتا قومی اسمبلی میں "عسکریت رائے" سے کلبھوشن یادیو کو safe passage دینے پر جشن منا رہے تھے۔

آپ رہائشی ہیں شہری نہیں | وسیم احمد نے لکھا

آپ پاکستان کے رہائشی ہیں، شہری نہیں۔ اس بات کو جتنا جلد سمجھ لیں اتنا اچھا ہے۔ اگر آپ پاکستان کے شہری بننا چاہتے ہیں تو آئی ایس ایس بی یا سی ایس ایس کیجیے۔

نثار | ہاشم یزمانی نے لکھا

یہ بڑے بڑے ”نثار“ تقریباً ایک جیسے کردار کے مالک ہیں۔

سیاست دانوں میں چودھری نثار، صحافیوں میں حسن نثار اور ججز میں #ثاقب_نثار

مفت پٹرول حاصل کیجیے | سمو رضوی نے لکھا

جسے پٹرول نہیں مل رہا وہ تحریک انصاف کے فیس بک پیجیز سے حاصل کر لے، وہاں ہر جگہ پٹرول بآسانی دستیاب ہے، بلکہ کچھ پیجیز پہ تو بالکل مفت میں بھی مل رہا ہے۔

کاروبار بطور دفاعی حکمت عملی | مطیع اللہ جان نے لکھا

کاروبار بطور دفاعی حکمت عملی:

کمرشل پلازہ دشمن کے دو ٹینکوں پر گر کر ان کو تباہ کر سکتا ہے، پٹرول پمپ میں لگی آگ حملہ آور کی پیش قدمی ایک دن کے لیے روک سکتی ہے۔

شادی ہال سے دشمن کو زیادہ بچے پیدا کرنے میں مدد دے کر ان بچوں کو زیادہ سے زیادہ پڑھایا جا سکتا ہے!

مقابلہ | مہتاب عزیز خان نے لکھا

پاکستان بمقابلہ بھارت

جنگی طیاروں، ٹینکوں، توپوں، میزائیلوں اور ایٹمی ہتھیاروں، بدانتظامی، نااہلی، کرپشن وغیرہ میں مقابلہ برابر ہے۔

آئی ٹی، میڈیکل، اور دیگر علوم میں انڈیا ہم سے کوسوں آگے ہے۔

مارشل لا، ڈی ایچ اے اور ریٹائرڈ فوجیوں کی تعیناتیوں میں ہم یک طرفہ جیتے ہوئے ہیں۔

بھارت کا چیف آف ڈیفنس سٹاف جنرل بپن راوت ہیلی کاپٹر حادثہ میں ہلاک

بھارت کا اعلیٰ ترین فوجی عہدہ دار چیف آف ڈیفنس سٹاف جنرل بپن راوت ہیلی کاپٹر حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ اس حادثے میں دیگر فوجی افسران سمیت ۱۳ افراد ہلاک ہوئے۔ یہ حادثہ بھارت کی جنوبی ریاست تامل ناڈو میں پیش آیا جب بپن راوت اپنی بیوی اور دیگر فوجی افسران کے ساتھ روسی ساختہ Mi-17 Chopper ہیلی کاپٹر میں سوار ایک فوجی اکیڈمی میں خطاب کے لیے جا رہا تھا۔ حادثہ کی وجہ جاننے کے لیے تحقیقات کی جا رہی ہیں۔ ۶۳ سالہ بپن راوت نے اپنی زندگی کے تقریباً ۴۰ سال بھارتی فوج میں گزارے۔ یہ شخص دسمبر ۲۰۱۵ء سے دسمبر ۲۰۱۹ء تک بھارت کا آرمی چیف بھی رہا اور اس کے بعد سے اعلیٰ ترین فوجی عہدے چیف آف ڈیفنس سٹاف پر تعینات رہا۔ یہ عہدہ دسمبر ۲۰۱۹ء میں ہی مودی حکومت کی جانب سے قائم کیا گیا جس کا مقصد بری، بحری اور فضائی افواج کے درمیان بہتر ہم آہنگی قائم کرنا تھا۔

جنرل راوت مقبوضہ کشمیر میں بھی کئی سال تعینات رہا۔ یہ شخص اہلِ کشمیر پر ڈھائے جانے والے مظالم سمیت اپنی اسلام دشمنی کی وجہ سے ہندو انتہا پسندوں میں عزت کی نگاہ سے جانا جاتا تھا۔ ۲۰۱۷ء میں اس نے مقبوضہ کشمیر میں ایک بھارتی میجر کو ایوارڈ دیا جس نے ایک کشمیری مسلمان شہری کو جیپ سے باندھ کر کشمیر کے کئی دیہات میں پانچ گھنٹے تک انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کیا۔ راوت کا کہنا تھا کہ میجر کو ایوارڈ دینے سے کشمیر میں بھارتی فوج کے حوصلے بلند ہوں گے۔ اس کے اس عمل پر مسلم ممالک سمیت دنیا بھر میں احتجاج کیا گیا جس کے جواب میں جنرل راوت نے اس اقدام کا دفاع کیا اور کہا کہ یہ 'غلیظ جنگ' (Dirty War) میں ایک 'جدت' ہے۔

۲۰۲۰ء میں اس نے کشمیری بچوں کو ڈی ریڈیکلائزیشن کیمپوں (انتہا پسندی کی فکر سے نکالنے والے کیمپوں) میں ڈالنے کا مطالبہ کیا تا کہ مسلمان نسلوں کے دلوں سے دینِ اسلام کو کھرچ کھرچ کر ختم کیا جا سکے۔

بالآخر اس شخص کی رسی اللہ رب العزت نے کھینچ لی اور اس کا عبرت ناک انجام ہوا۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ﴾

"اور یہ ہر گز نہ سمجھنا کہ جو کچھ یہ ظالم کر رہے ہیں، اللہ اس سے غافل ہے۔ وہ تو ان لوگوں کو اس دن تک کے لیے مہلت دے رہا ہے جس میں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔"

[سورۃ ابراہیم: ۴۲]

اس اسلام دشمن جنرل کی موت پر ہم مسلمانانِ کشمیر و ہند سمیت تمام امت مسلمہ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان کو امید دلاتے ہیں کہ بے شک اللہ رب العزت اپنے دشمنوں کی رسی زیادہ دراز نہیں کرتا اور ان کے انجام سے اہلِ ایمان کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچاتا رہتا ہے۔

اسرائیلی فوج نے فلسطین میں مسجد شہید کر دی، ملبے میں دبنے سے قرآن پاک کے نسخے بھی شہید ہوئے

یہودی تہوار 'ہنوکا' کے موقع پر قابض اسرائیلی فوج نے فلسطین کے مقبوضہ مغربی کنارے کے شمالی شہر نابلس میں دوما کے مقام پر ایک مسجد پر حملہ کر کے اسے مکمل طور پر منہدم کر دیا جس کے نتیجے میں قرآن پاک کے نسخے اور دیگر دینی کتابیں ملبے تلے دب گئیں جنہیں مقامی شہریوں نے ملبے سے نکالا۔

میڈیا رپورٹوں کے مطابق نابلس میں یہودی آباد کاری کے امور پر نظر رکھنے والے فلسطینی تجزیہ نگار غسان دغلس نے بتایا کہ قابض اسرائیلی فوج کی بھاری نفری نے دوما میں دو سال سے قائم مسجد کا گھیراؤ کیا اور اس مسجد کو بھاری مشینری کی مدد سے شہید کر دیا گیا۔

انہوں نے بتایا کہ قابض فوج نے جنوبی دوما میں فلسطینیوں کی زرعی اراضی کے راستے اور پانی کی لائنوں کو بھی اکھاڑ پھینکا۔

عینی شاہدین نے بتایا کہ قابض فوج نے دوما میں متعدد فلسطینی خاندانوں کو ان کی املاک کو غیر قانونی قرار دینے کے نوٹس جاری کیے ہیں جن میں انہیں مسمار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

گزشتہ کئی دہائیوں سے یہودیوں کی جانب سے قبلۂ اول بیت المقدس کی مبارک سرزمین فلسطین پر قبضہ ہے، اور دن بدن اس غاصبانہ قبضہ میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ فلسطین میں اس دوران ہزاروں مسلمانوں کو شہید کیا گیا اور مسلمانوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر کے ان پر جبری قبضہ کیا جاتا رہا۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اسرائیل کی اس ساری بدمعاشی اور دہشت گردی کی پشت پناہی براہِ راست امریکہ کی جانب سے کی جاتی رہی اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے۔

افغانستان سے امریکہ کے انخلا کے بعد امریکہ شاید اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرے لیکن یہ بات واضح ہے کہ امریکہ کے خلاف امت مسلمہ کا جہادی معرکہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک امریکہ فلسطین میں اسرائیلی کی پشت پناہی جاری رکھے گا۔ امریکہ اس وقت تک محفوظ نہیں رہ سکتا جب تک یہ حرمین شریفین، جزیرۃ العرب سمیت دنیا بھر کی مسلم سرزمینوں سے اپنی فوجیں نہیں نکالتا اور جب تک یہ مسلم ممالک میں بلا واسطہ یا بالواسطہ مداخلت ختم نہیں کرتا۔

وسطی افریقائی جمہوریہ میں اقوام متحدہ 'امن مشن' کے دوران پاکستانی فوجی ہلاک

پاکستانی فوج کے نشریاتی ادارہ آئی ایس پی آر کے مطابق حوالدار محمد شفیق اقوام متحدہ کے 'امن مشن' میں شرکت کے لیے وسطی افریقائی جمہوریہ گیا تھا اور اس دوران کسی واقعہ میں 'شہید' ہوا، جسے مکمل فوجی اعزاز کے ساتھ آبائی علاقے میاں چنوں میں دفن کیا گیا۔ آئی ایس پی آر کے مطابق اب تک کم و بیش ایک سو باسٹھ (۱۶۲) پاکستانی فوجی عالمی مشن برائے 'امن و استحکام' میں اپنی جانیں گنوا چکے ہیں۔

واضح رہے کہ اقوام متحدہ کے 'امن مشن' کے قافلے زیادہ تر مسلمانوں کے شورش زدہ علاقوں میں بھیجے جاتے ہیں جہاں مجاہدین کچھ قوت حاصل کر چکے ہوں یا کم از کم وہاں کی حکومتوں کے کنٹرول سے باہر ہوں، اور ان کا مقصد ان علاقوں سے مجاہدین کا کنٹرول ختم کرنا یا مجاہدین کو کمزور کرنا ہوتا ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘؔ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾

"اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو یارومددگار نہ بناؤ، یہ خود ہی ایک دوسرے کے یارومددگار ہیں اور تم میں سے جو شخص ان کی دوستی کا دم بھرے گا تو پھر وہ انہی میں سے ہوگا۔ یقینا اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"[سورۃ المائدۃ:۵۱]

سعودی عرب: حجازِ مقدس کے شہر جدہ میں انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کا انعقاد

سعودی عرب کی مقدس سرزمین کے شہر جدہ میں انٹرنیشنل فلم فیسٹیول کا انعقاد کیا گیا ہے جس میں دنیا کے مختلف ممالک سے آنے والے اداکاروں نے فحاشی، عریانی اور بے حیائی کا مظاہرہ کیا۔ یہ سعودی عرب میں منعقد ہونے والا پہلا انٹرنیشنل فلم فیسٹیول ہے۔ واضح رہے کہ ۲۰۱۸ء میں سعودی عرب میں سینما گھروں پر سے پابندی ختم کر دی گئی تھی، اس پابندی کے خاتمہ کے چار سال بعد اس فلم فیسٹیول کا انعقاد کیا گیا ہے۔

اس فیسٹیول میں ۶۷ ممالک کی جانب سے ۳۰ سے زائد زبانوں میں ۱۳۸ چھوٹی بڑی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔

جدہ ہی میں گزشتہ دنوں فارمولا وَن ریسنگ ایونٹ کے اختتام کے بعد کانسرٹ کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں کینیڈین گلوکار جسٹن بیبر نے شرکا کو شیطانی غذا فراہم کی۔ سعودی عرب میں حالیہ تبدیلیاں ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کے وژن ۲۰۳۰ کے تحت سامنے آرہی ہے جس کا ہدف نبی کریم ﷺ کی سرزمین کو اسلامی خطوط سے ہٹا کر بے دینی اور کفر والحاد کی روش پر ڈالنا ہے۔

بھارت: شیعہ وقف بورڈ کے سابق چیئرمین وسیم رضوی نے ہندو مذہب اختیار کر لیا

بھارت کے شہر لکھنؤ کی متنازع شخصیت اور اُتر پردیش شیعہ وقف بورڈ کے سابق چیئرمین وسیم رضوی نے ہندو مذہب اختیار کر لیا ہے۔

وسیم رضوی کا نیا نام جتیندر نارائن سنگھ تیاگی رکھا گیا ہے۔ وسیم رضوی نے بھارت کے نشریاتی ادارے 'انڈیا ٹوڈے' سے بات کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے اسلام سے باہر کر دیا گیا تھا۔ میرے اوپر رکھی گئی انعام کی رقم میں ہر جمعہ کو اضافہ ہو جاتا ہے۔ آج میں نے ہندو مذہب اختیار کر لیا۔"

وسیم رضوی ایک عرصہ اسلام مخالف اقوال و افعال کی وجہ سے مسلمانانِ ہند میں نفرت اور بغض کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ اس بدبخت شخص نے ۱۲ مارچ کو بھارتی سپریم کورٹ میں ایک پٹیشن دائر کر کے قرآن مجید کی ۲۶ آیات کو حذف کرنے کی اپیل کی تھی۔ اس کا الزام تھا کہ یہ آیات مسلمانوں میں دہشت گردی کو بڑھاوا دیتی ہیں، اس کے مطابق یہ ۲۶ آیات اصل قرآن میں نہیں تھیں۔ انہیں بعد میں قرآن میں شامل کیا گیا۔

اس خبیث شخص نے رواں برس مئی میں یہ اعلان کر کے ایک نئے تنازع کو جنم دیا تھا کہ اس نے (العیاذ باللہ) ایک نیا قرآن تصنیف کیا ہے۔ اس نے بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی کے نام ایک خط میں اپیل کی تھی کہ اس نئے قرآن کو پورے ملک کے تمام مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں پڑھانے کے لیے شامل کیا جائے۔

اس شخص کے کفریہ اعمال اور شعائرِ اسلام کی بے حرمتی کی وجہ سے اس کے قتل پر مسلمانوں نے انعامات کا بھی اعلان کیا ہوا تھا۔ رپورٹوں کے مطابق مراد آباد کے ایک وکیل نے مبینہ طور پر اس کا سر قلم کرنے پر گیارہ لاکھ روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔

وسیم رضوی نے رواں برس نومبر میں ایک ویڈیو بیان جاری کر کے اعلان کیا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی میت کو غازی آباد، اتر پردیش کے پنڈت یتی نرسنگھانند سرسوَتی کے حوالہ کر دیا جائے۔ وہ اسے دفنانے کے بجائے نذرِ آتش کریں۔ یہ وہی پنڈت ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے میں مشہور ہے اور اپنی زندگی کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو دنیا سے ختم کرنا بتاتا ہے۔

(باقی صفحہ نمبر 43 پر)

گھر چھوڑ......!

دعویٰ ہے صحابہؓ سے محبت کا تو گھر چھوڑ
تو مثلِ عمرؓ شام جا یا نامِ عمر چھوڑ

زیدؓ ابن حارثہ کی طرح جاں سے گزر جا
یا تذکرۂ مُوتہ، حنین، اُحد و بدر چھوڑ

سُستی و بزدلی سے بچا اپنے آپ کو
ابن جموحؓ سا گھر سے نکل اگر مگر چھوڑ

حسانؓ سا شاعر بھی تو لڑنے کو گیا تھا
اب فکرِ زمیں، چاہتِ زن، کوششِ زر چھوڑ

ساری حیات نہ سہی کچھ وقت کے لیے
یہ شعر و ادب، جانِ جگر، لختِ جگر چھوڑ

خالق کی محبت میں بَصد شوق جُھلس جا
مخلوق کی تعریف کا سایائے شجر چھوڑ

وہؓ صاحبِ تلوار تھے تُو صاحبِ قلم
لڑنے کا ہنر سیکھ لے، لکھنے کا ہُنر چھوڑ

شانِ صحابہؓ لکھنا عبادت ہے مگر اب
جدّ و جہد کا وقت ہے لفظوں کی قدَر چھوڑ

ہلکے ہو یا بوجھل ہو چلو جانبِ میداں
ہُدہُد قرآں کی مان لے حیلہ و عُذر چھوڑ

اشعار: ہُدہُدؔ الہ آبادی
انتخاب: شاہ مطیع الرحمٰن صدیقی شہیدؒ (ثاقب گیلانی)

جامعہ مسجد سری نگر سے بابری مسجد تک...... جہاد حل ہے!

’’سوال یہ ہے کہ ڈر لگتا ہے کہ جہاد میں جانے سے جان چلی جائے گی، مال چلا جائے گا، نقصان ہو جائے گا۔ کشمیر اور ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ آج تک ہو رہا ہے کیا وہ کم ہے؟ آج تک سنہ سینتالیس (۱۹۴۷ء) سے اب تک جو گنوایا ہے، کیا وہ کچھ کم ہے؟ اس سے زیادہ اور کیا چلا جائے گا؟ حالانکہ جہاد تو دفاع و عزت و حفاظت کی ضمانت ہے۔ اللہ نے اس دور میں بھی آپ کو دکھا دیا۔ اس وقت جو کچھ کشمیر و ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے، جو جان و مال کا نقصان انہیں پہنچایا جا رہا ہے، اگر یہی جان و مال جہاد میں لگا دیا جاتا (تو کیا یہ نقصان ہوتا؟)...... آپ ذرا وہ اعداد و شمار اٹھا کر دیکھ لیجیے جو سنہ سینتالیس سے لے کر اب تک مسلمانوں کو جو جانی و مالی نقصان ہوا ہے اگر یہ جہاد میں لگ جاتا تو اتنا نقصان نہ ہوتا۔ مسلمانوں کا نقصان جہاد میں لگنے کے بعد بہت کم ہوتا ہے۔ اس کے بدلے میں جو نقصان کافروں کا ہوتا ہے تو اس کے بھی اعداد و شمار اٹھا کر دیکھ لیجیے، افغانستان میں دیکھیے اور ساری دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔

اللہ نے اس راستے کو عزت کی زندگی اور عزت کی موت کا راستہ بنایا ہے۔ اگر آپ کو کمزوری کا عذر ہے تو قرآن اٹھا کر دیکھیے کہ جہاد کمزوروں ہی کو طاقت ور بنانے کے لیے فرض کیا گیا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ بھارت بڑا طاقت ور ہے تو یاد رکھیے جہاد طاقت وروں کا غرور خاک میں ملانے کے لیے فرض کیا گیا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہے۔ اپنے کشمیری مسلمان بھائیوں کے لیے، آسام کے مسلمانوں کے لیے اور خود آپ کے اپنے لیے...... آپ کا کون سا خطّہ ہے جہاں آپ کی جان و مال خطرے میں نہیں ہے؟! جہاں آپ کے املاک نہیں لوٹے گئے۔

اللہ کا وعدہ ہے، میرے بھائیو! اللہ کا وعدہ ہے، إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ ...... اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے کمزور قدموں کو جما دے گا۔ تم نہتے ہو گے اللہ تمہیں بہادر بنا دے گا۔ تمہارے ہاتھ میں پتھر ہوں گے اللہ ان کو بم بنا دے گا۔ تمہارے ہاتھ میں چھوٹا اسلحہ ہو گا، اللہ تمہیں اس چھوٹے اسلحے کے ذریعے بڑے اسلحے والوں پر غالب کر دے گا۔ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ...... نہ جانے کتنی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں!‘‘

قائدِ جہادِ برِّ صغیر

مولانا عاصِم عمر سنبھلی